سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا
الذی بارکنا حولہ لنریہ من ایاتنا انہ ھو السمیع البصیر
تاریخ
بیت المقدس

تاریخ بیت المقدس

تاریخ بیت المقدس

ممتاز لیاقت

www.KitaboSunnat.com

نیاز احمد
سنگ میل پبلی کیشنز
چوک اردو بازار۔ لاہور
نے پنجاب آرٹ پریس لاہور سے چھپوا
کر شائع کی۔

بار دوم ۔ ۲ ۔ ۱۹۷۰ء ستمبر

قیمت ۱۶ روپے

آپ کی محنت قابلِ داد ہے کہ آپ نے بیت المقدس کے موضوع پر بہت سا مواد جمع کر دیا ہے۔

(مولانا سید) ابو الاعلیٰ مودودی

بیت المقدس کا سقوط صرف ایک تاریخی حادثہ ہی نہیں ہے بلکہ عہدِ حاضر کے مسلمانوں کی ایمانی غیرت کو بہت بڑا چیلنج ہے مسلمان رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ نئی نسل کو اس واقعہ کی اہمیت سے بھرپور طریقے سے آگاہ کریں تاکہ ان کے اندر اپنے اسلامی شہر کی واگزاری کے لیے وہی جذبہ جہاد اُبھر سکے جو صلیبی دور میں صلاح الدین ایوبی کی زیرِ قیادت مسلمانوں کے اندر پیدا ہوا تھا۔ بیت المقدس کی تاریخ پر اردو میں اب تک کوئی قابلِ ذکر کتاب موجود نہیں تھی ممتاز لیاقت صاحب نے اس موضوع پر یہ کتاب لکھ کر اس کمی کو کسی حد تک پورا کر دیا ہے۔

خلیل احمد الحامدی

۱۹۴۶ء میں فلسطین میں آبادی کی تقسیم کا نقشہ
(یہ نقشہ مسئلہ فلسطین پر اقوام متحدہ کے عبوری کمیشن
کی ذیلی کمیٹی نمبر ۲ کی ہدایات پر تیار کیا گیا تھا)
صفد
عکہ
طبریہ
خلیج طبریہ
حیفہ
ناصرہ
بیسان
جنین
طولکرم
نابلس
یافہ
رام اللہ
رملہ
یروشلم
بحیرۂ روم
بحیرۂ مردار
غزہ
حبرون
بیر شیبا
عرب
یہود
۱۰۰،۰۰۰
۵۰،۰۰۰
۱۰،۰۰۰
میل
کلومیٹر
٪۱۳
٪۸۷
٪۴
٪۹۶
٪۵۳
٪۱۶
٪۸۴
٪۳۳
٪۶۷
٪۱۰۰
٪۱۷
٪۸۳
٪۷۱
٪۲۹
٪۲۲
٪۳۸
٪۶۲
٪۲
٪۹۸
٪۱ سے کم
٪۹۹
٪۹۹ سے زیادہ
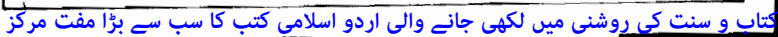
فلسطین میں زمین کی ملکیت سے متعلق
ضلع وار تقسیم کا نقشہ (۱۹۴۵ء)
(یہ نقشہ مسئلہ فلسطین پر اقوام متحدہ کے عبوری کمیشن
کی ذیلی کمیٹی نمبر ۲ کی ہدایات پر تیار کیا گیا تھا
یہودی
عرب
سرکاری اراضی
میل
کلومیٹر
صفد
عکہ
حیفہ
ناصرہ
طبریہ
بیسان
جنین
طولکرم
نابلس
یافا
رملہ
رام اللہ
یروشلم
غزہ
حبرون
بیر شیبا
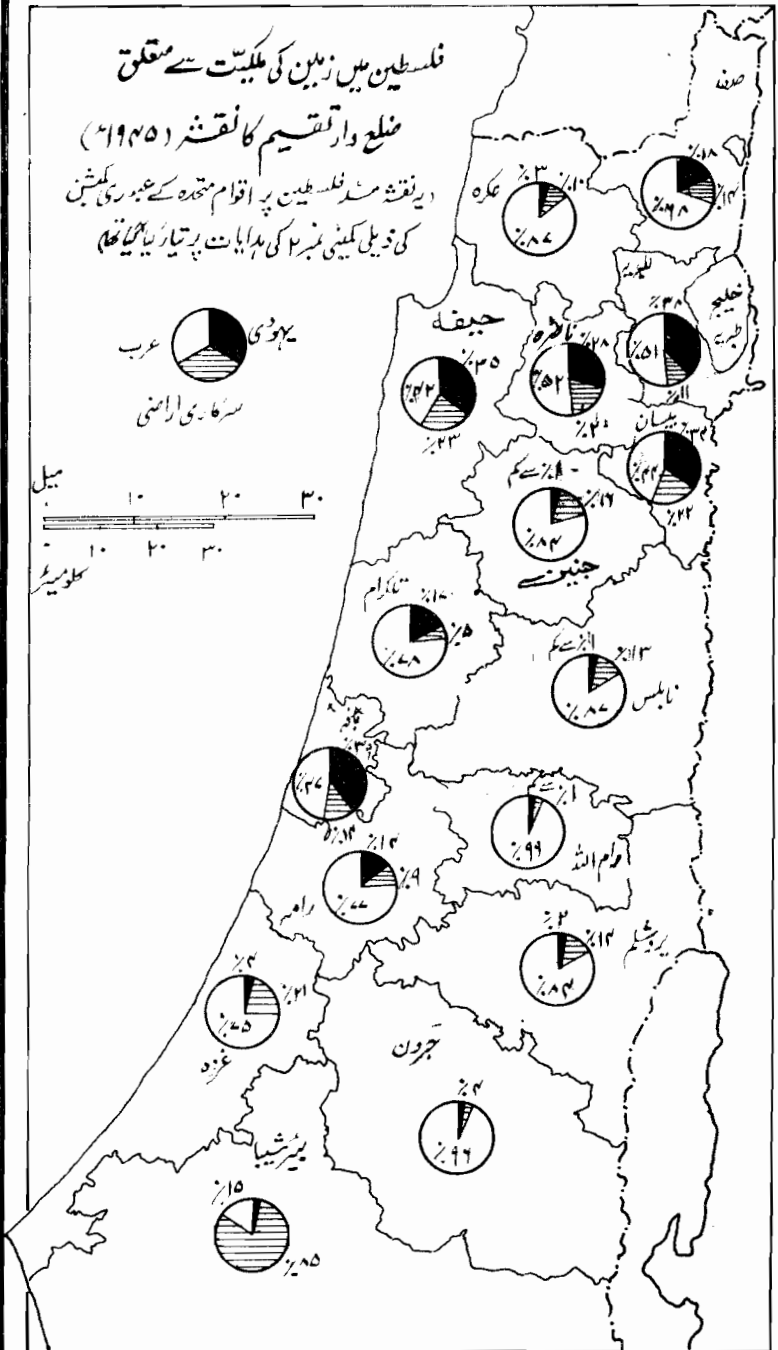
احاطہ حرم کی زیارتیں

۱۔ قبۃ الصخرہ ۔ ۲۔ قبۃ السلسلہ ۔ ۳۔ قبۃ المعراج ۔ ۴۔ قبۃ النبی ۔ ۵۔ قبۃ الارواح ۔ ۶۔ قبۃ الخضر (الیجاہ) ۷۔ قبۃ سلیمان

۸۔ کھلا منبر ۔ ۹۔ تخت سلیمان ۔ ۱۰۔ مہد عیسٰی ۔ ۱۱۔ اصطبل سلیمان ۔ ۱۲۔ مسجد الاقصیٰ ۔ ۱۳۔ باب النبی ۔ ۱۴۔ باب المغاربہ

۱۵۔ باب السلسلہ ۔ ۱۶۔ باب المطارہ ربارش ۔ ۱۷۔ باب القطانین ۔ ۱۸۔ باب الحدید ۱۹۔ باب المناظر ۔ ۲۰۔ باب الزوایا

۲۱۔ باب الغوانم ۔ ۲۲۔ باب السقر ۔ ۲۳۔ باب التوبہ ۔ ۲۴۔ باب الاسباط ۔ ۲۵۔ باب الذہب ۔ ۲۶۔ باب القدیم

۲۷۔ اکہرہ دروازہ ۔ ۲۸۔ تہرہ دروازہ ۔ ۲۹۔ دوہرا دروازہ ۔ ۳۰۔ ۱۹۱۸ء سے قبل ترک افواج کا مستقر ۔ ۳۱۔ یہودیوں کا مقام گریہ

فہرست

نقشہ جات وتصاویر

"جو لوگ ایمان اور عمل صالح کی راہ اپناتے ہیں۔ اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے" (قرآن مجید)

تاریخ عالم قوموں کے عروج و زوال کی داستان ہے۔ بلندی اور پستی کا یہ چکر امت مسلمہ کے ساتھ بھی چلتا رہا ہے، لیکن جب ہم اس کے عروج و زوال کے اسباب کی جستجو کرتے ہیں تو یہ سبب نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے کہ اس امت کی تخلیق و تشکیل جس غایت کے لیے ہوئی ہے۔ جب تک وہ اسے اپنا نصب العین بنائے رکھتی اور میدان جہاد میں بڑھتی ہے، اسے عروج حاصل رہتا ہے لیکن جہاں یہ اپنے نصب العین سے ہٹ جاتی اور اپنے آقا و مولا، سرور کائنات کی راہ سے گریز کا رویہ اپنا لیتی ہے، وہیں سے اس کے زوال کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ پھر کوئی مادی سہارا خواہ وہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، اسے ذلت و رسوائی تک لے جانے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔

عباسی دور خلافت میں جب بغداد ایشیا کا "پیرس" بن گیا اور کتاب و سنت کے وارث آپس میں معمولی معمولی باتوں پر لڑنے اور کفر و شرک کے فتوے لگانے میں لگے تھے۔ تاتاریوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی لیکن اسی دور میں امام ابن تیمیہ کی للکار نے، جس میں کتاب و سنت کی پوری روح جلوہ گر تھی، بڑھتے ہوئے تاتاری طوفان کا رخ موڑ دیا۔ ہماری تاریخ کی ایسی ان گنت مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ امت رسول ہاشمی ﷺ ایک خاص امتیاز رکھتی ہے جو اسے دوسری اقوام و ملل سے ممتاز کرتا اور اس کی قوت کا باعث بنتا ہے، یہ امتیازی وصف اس کی کتاب و سنت سے وابستگی ہے جو اس کے وجود کی بنیاد ہے۔ جب اس بنیاد میں کمزوری آتی ہے، تو اس کی طاقت کا سوتا سوکھ جاتا ہے، ماضی میں جب تاتاری یلغار مشرق وسطی کو اپنے سیلاب میں بہا لے جانا چاہتی تھی اور اس کی شکست و ریخت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی، کتاب و سنت کی روح سے سرشار ایک گروہ نے اسے للکارا اور وہ طوفان جو شمع توحید کو بجھانے کے لیے اٹھا تھا، بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔

آج پھر مشرق وسطی ایک نئے طوفان کی لپیٹ میں ہے یہ سیلاب صیہونیت کا ہے جو ماضی کے تاتاری فتنہ کی مثال بلکہ اس سے شدید تر ہے۔ حال اور ماضی کے ان دو فتنوں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا، کہ تاتاری فتنہ اپنے وجود میں مستقل تھا اور عہد حاضر کا صیہونی فتنہ استعماری طاقتوں کا ایک بہروپ ہے، چہرہ دیکھیے تو اسرائیل — لیکن اس کے دل و دماغ، اعضاء و جوارح، ارادے اور عزائم سب استعماری طاقتوں کے ہیں۔ اس میں ساری توانائی استعمار کی ہے اسے جنم بھی استعمار

نے دیا۔ غور و پرداخت بھی اسی نے کی، اور حفاظت بھی وہی کر رہا ہے اور یہی حقیقت اس کی فتنہ سامانی کو بڑھاتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کا بیشتر حصہ اس کے نام کی مناسبت سے بیت المقدس کی تاریخ و روایات سے متعلق ہے، لیکن ضمناً اسرائیل کا قیام اور منصوبوں کی تفصیلات بھی آ گئی ہیں۔

بیت المقدس ہمارا قبلۂ اول ہے یہ ہماری نسل کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اسے قبلۂ اول کے چھن جانے کے حادثے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس سے بھی زیادہ دل فگار حادثہ مسجد اقصیٰ کی توہین کا ہے یہودی اسے گرا کر اپنا معبد تعمیر کرنا چاہتے ہیں یہی نہیں بلکہ وہ حرمین الشریفین پر بھی حریصانہ نظریں ڈالتے اور نیل سے فرات تک توحید پرستوں کو نابود کر دینے کی آرزو رکھتے ہیں۔ لیکن ہم ابھی تک اس کے عزائم کو نہیں سمجھ سکے۔ اس لیے کہ ہمیں مسئلہ کی نزاکت کا احساس نہیں۔ اس شہر کی عظمت و فضیلت کو نہیں جان سکے جس کے لیے حضرت عمرؓ نے سفر کیا اور غازیٔ اسلام صلاح الدین ایوبیؒ اور ان کے جاں نثار ساتھی (خداوند قدوس ان پر ہزار ہزار رحمتیں نازل فرمائے) برسوں لڑتے اور دادِ شجاعت دیتے رہے یہاں تک کہ اس شہر کے ذرے ذرے میں ان کا خون رچ بس گیا، جو آج بھی مضطرب و بے چین اور ایک نئی کروٹ کا منتظر ہے۔

یہ کتاب اس شہر کی تاریخ ہے عظمت و فضیلت کی داستان ہے اور اس ناموس کا قصہ ہے جس کے لیے ہمارے اسلاف ایک پوری صدی تک اپنے خون کا خراج دیتے رہے۔ مجھے مؤرخ ہونے کا دعویٰ نہیں۔ البتہ میں نے اپنی روح کا اضطراب اور اپنے دل کی تڑپ آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

مجھے فخر ہے کہ شہر انبیاء پر اردو میں ایک مکمل کتاب لکھنے کی سعادت میرے حصہ میں آئی اس کے لیے میں خدائے قدوس کا لاکھ لاکھ شکر گزار، اور اپنے دوست بلکہ مشفق و مہربان بھائی سید قاسم محمود کا ممنون ہوں کہ ان کی تحریک اور ان کے اعتماد نے مجھ سے یہ کتاب لکھوائی۔ اس کتاب کی تدوین و تالیف میں جن ذرائع سے اخذ و استفادہ کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر اہلِ پاکستان کے لیے نئے ہیں ان کے لیے میں معتمر غازہ، مفتیٔ اعظم فلسطین کی موتمر العالم الاسلامی عبدالحق شہباز اور محمد حنیف شاہد کا مشکور رہوں۔ آخر میں مجھے پبلشر کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے جو میرے اور آپ کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے۔

میں جناب زاہد حسین انجم صاحب کے لیے سراپا سپاس ہوں کہ انہوں نے انگریزی عبارتیں لکھ دیں اور کتاب میں آنے والے نقشے بھی بنا دیئے۔

ممتاز لیاقت

صبحِ قیامت

——— ۷ جون ۱۹۶۷ء

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ

القدس ... پیغمبروں کی سرزمین .... امت مسلمہ کا قبلۂ اوّل ... سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ معراج کی پہلی منزل ... وہ سرزمین جس کے ذرے ذرے پر تیرہ صدیوں کی اسلامی تاریخ کے نقوش ثبت ہیں۔

۷ جون ۱۹۶۷ء تاریخ اسلام کا ایک المناک ترین دن ہے۔ اس روز القدس پر کیا گزری؟ یہ ایک ایسی داستان ہے کہ جسے سننے کے لیے پتھر کا دل چاہیے۔ یہ کہانی ایسی ہے جسے ہر شخص اشک بار آنکھوں سے سناتا ہے۔

سپیدہ سحر نمودار ہو چلا ہے۔ پیغمبروں کی یہ سرزمین پارے کی طرح لرز رہی ہے۔ القدس کے باشندوں نے پچھلی دو راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ شرق اردن اور عراق کی فوجیں دیوارِ گریہ کے اس پار یہودی علاقہ میں دشمن پر آگ برسا رہی ہیں۔ توپوں کی گولہ باری اور جہازوں کی بمباری سے در و دیوار لرز رہے ہیں۔ گھن گرج اتنی ہے کہ دل دہل جاتے ہیں۔ ننھے بچے ماؤں کے سینے سے چمٹے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہے ہیں کہ ہماری گیتی پہ کیا بیت رہی ہے؟ بوڑھے پریشان، آسمان کی جانب آنکھیں اٹھائے اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلائے آنسوؤں کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ اور نوجوان ہاتھوں میں خنجر، لاٹھیاں، تلواریں اور بندوقیں لیے گلی کوچوں کے ناکوں پر سینے تانے پہرہ دے رہے ہیں۔ جیسے فولادی دیوار ہوں۔

پو پھٹ رہی ہے۔ مسجد اقصےٰ کے مشرقی کنارہ پر شفق کی سرخی اور گہری ہو گئی ہے یوں لگتا ہے جیسے القدس کے پچاس ہزار عربوں نے اپنے خون سے آسمان کو لالہ زار بنا دیا ہے

اچانک مسجد اقصیٰ کے مینار سے اذان کی آواز گونجتی ہے۔ اس مینار سے مؤذن اہل ایمان کو صدیوں سے بلاوا دیتے آئے ہیں۔

"آؤ۔ نماز کی طرف، دوڑو فلاح و کامرانی کی طرف ___"

اور شہر کے باشندوں نے اس اذان کو پہلے بھی کئی بار سنا ہے، لیکن آج تو یوں لگتا ہے جیسے یہ اذان نہیں بلکہ آخری انتباہ ہے جو محراب عمرؓ سے مسلمانوں کو کیا جا رہا ہے۔ آہ! مؤذن کی پکار بے پناہ درد و اضطراب میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کی آواز کبھی اُبھرتی، کبھی دھیمی ہوتی ہے۔ خون کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی پکار کا ایک ایک لفظ دلوں پہ قیامت ڈھا رہا ہے! اب مؤذن کی آواز سسکیوں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اور جب وہ کہتا ہے:

"حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" (نماز کی طرف دوڑو) تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔ لاؤڈ سپیکر پر اس کی سسکیاں اور دبی دبی چیخیں القدس کے شہریوں کے دل میں تیر کی طرح اُتر جاتی ہیں، ان چیخوں کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے، لوگ رونے لگتے ہیں۔ آج انہیں احساس ہوا ہے کہ مؤذن انہیں جس راہ کی طرف بلاتا رہا ہے۔ وہ اس سے کس طرح اعراض کرتے رہے ہیں۔ آج یہ اس کی آخری پکار ہے۔ جو بیت المقدس کی فضا میں گونج رہی ہے۔ تقریباً پونے چھ سو برس قبل بھی اس پہ ایک دور ایسا آیا تھا جب اس کی فضا اذان سے محروم رہی۔ یہ عرصہ پورے نوّے (۹۰) برس پہ محیط تھا۔ مسلمانوں کو اس عرصے میں بے انتہا قربانیاں دینا پڑیں۔ تب کہیں صلاح الدین ایوبیؒ کی قیادت میں وہ اس مقدس شہر کو غاصبوں کے چنگل سے نجات دلانے میں کامیاب ہو سکے۔ اب یہ فضا پھر اس پکار سے کتنی دیر محروم رہے گی؟ اور اس ارض پاک کو غاصب یہودیوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے عالم اسلام کو کتنا خون دینا پڑے گا؟ اس کا تصور بھی انہیں رُلائے دیتا ہے۔

دھیرے دھیرے سورج کی روشنی پھیل رہی ہے، سورج نے مشرق سے ابھر کر سر باہر نکالا ہے اور چھ سو برس بعد پہلی مرتبہ دیکھا ہے کہ فلسطین پر ایسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے کہ جو پہلے چشم فلک نے نہیں دیکھی تھی۔ اردنی فوجوں کی مزاحمت ختم ہو چکی ہے، اکثر سپاہی اپنی جانیں نچھاور کر چکے ہیں، باقی پیچھے ہٹ آتے ہیں۔ گاہے گاہے گولہ باری کی آواز اب بھی آ جاتی ہے۔ یہودی فوجوں نے بیت المقدس کو گھیر لیا ہے۔ شہریوں کی زبردست مزاحمت سے مقابلہ کے بعد ان کے دستے سٹیفن گیٹ اور باب دمشق سے شہر میں داخل ہو گئے ہیں اور وسطِ شہر

کی طرف بڑھ رہے ہیں، مسلمان قدم قدم پر ان کی مزاحمت کرتے ہیں۔ بالاخانوں اور کھڑکیوں سے گولیاں برس رہی ہیں، اسرائیلی مشین گنوں اور مارٹر توپوں کے منہ کھول دیتے ہیں اور دو گھنٹے کے اندر شہریوں کی مزاحمت دم توڑ دیتی ہے۔ القدس پر قیامت گزر گئی ہے۔ ان دو گھنٹوں کی کہانی دردناک داستان ہے۔ ظلم و جور کے وہ کون سے پہاڑ ہیں جو ان عربوں پر نہیں ٹوٹے اسرائیلی فوجیں شہر میں داخل ہوئیں تو انہیں یہ محسوس ہوا کہ ہر دروازے پر ان کا دشمن سینہ تانے کھڑا ہے۔ کسی نے بندوق سے مقابلہ کیا اور کوئی ننگی تلوار لے کر ٹوٹ پڑا۔ بعض نے ترکاری اور تربوز تراشنے والے چاقو ہی سٹین گنوں سے مسلح اسرائیلیوں کے پیٹ میں گھونپ دیئے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسٹالن گراڈ کے گلی کوچوں میں لوگوں نے بے جگری سے مقابلہ کیا۔ اور اپنے شہر کو دست برد سے بچا لیا تھا۔ لیکن بیت المقدس کے مسلمانوں نے روسیوں سے بھی زیادہ بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ارض مقدس پر جان قربان کر دی ہے، وہ کونسی گلی ہے جو نوجوان عربوں کی لاشوں سے اٹ نہ گئی ہو۔ اور وہ کونسا دروازہ ہے۔ جس کی دہلیز پر خون میں لت پت اردنی مقابلہ کرتے ہوئے شہید نہ ہو گئے ہوں۔ خود مسجد اقصیٰ کے صدر دروازے پر اپنی مقدس عبادت گاہ —— اپنے قبلہ اول کے لیے جان کی بازی لگانے والے مسلمانوں کی لاشوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔

ہیکل سلیمانی کا خواب دیکھنے والے یہودی مسجد اقصیٰ کے اندر داخل ہو گئے۔ مسجد کا مؤذن عزیز ان کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ شیر کی طرح بپھرا اور چیتے کی طرح تنہا ہی دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک آہنی سلاخ ہے، جس کی لمبائی چھ فٹ سے زیادہ نہیں، یہودی سپاہیوں نے ایک قہقہہ لگایا اور رائفل کی سنگین اس کے سینے سے پار کر دی۔ مسجد عمرؓ سے اذان بلند کرنے والی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش کر دی، نماز ظہر کے وقت پہلی مرتبہ یہاں اذان کی آواز بلند نہیں ہوئی۔ اب یہودی گلی کوچوں میں بوڑھوں، عورتوں اور بچوں پر یوں پل پڑے، جیسے وہ صدیوں سے مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہوں، مقابلہ کرنے والے نوجوان یکے بعد دیگرے جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ گلی کوچوں میں ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔ گھروں اور ہسپتالوں میں لاشوں کے انبار لگے ہیں۔

ناصرہ کے مشن ہسپتال میں غیر ملکی رپورٹر ایک امریکی اخبار نویس کی لاش لینے پہنچے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کمرے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ فرش سے چھت تک لاشوں

کے انبار لگے ہیں۔ ہسپتال کا بوڑھا پادری کہتا ہے :

"تم ایک شخص کی لاش لینے آئے ہو، ہمارے پاس تو بے شمار لاشیں ہیں،
..... تمہیں بس ایک لاش کی فکر ہے اور کچھ لو نہ ....."

یہ کہہ کر وہ فرش پر لگے ہوئے ایک ڈھیر سے کمبل ہٹا دیتا ہے۔ گڑیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اردنی بچوں کے خون میں لت پت ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے بڑا ہی دردناک منظر پیش کر رہے ہیں۔ ان بچوں کے درمیان ایک اردنی خاتون ہاتھ پھیلائے اس طرح پڑی ہے، جیسے وہ انہیں آسمان سے برستی ہوئی آگ سے بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔

دشمن نے ہزاروں لاشوں پر سے گزر کر القدس فتح کر لیا ہے، جو لوگ بچ گئے ہیں ان میں سے اکثر زخموں سے چور ہیں، مگر ان کے دل اب بھی غیر مفتوح ہیں۔ جگہ جگہ کمین گاہیں قائم ہیں۔ جہاں سے اسرائیلیوں پر گاہے گاہے فائرنگ ہوتی رہتی ہے۔ اسرائیلی شہر پر قابض ہونے کے باوجود اپنے آپ کو محصور تصور کرتے ہیں۔ سر فروش نوجوان کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اسرائیلی آ چکے ہیں۔ اپنے ایک ایک زخمی اور مرنے والے کا انتقام دس دس بارہ بارہ اردنیوں سے لیتے ہیں۔ مگر حملوں کے واقعات میں کمی نہیں آنے پائی۔ تحریک مزاحمت کے نوجوان ڈھونڈ ڈھونڈ کر گرفتار کیے جا رہے ہیں۔

دیوارِ گریہ کے اس پار شارع الحکم پر شہر کے رئیس طارق الاحمد کا خوبصورت بنگلہ ہے وہ یہودیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں، اسرائیلی سپاہی بنگلہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ شہید کی بیوہ نے یہ دیکھ کر پستول نکال لیا ہے لیکن اس سے پہلے کہ کوئی گولی پستول سے نکل کر کسی یہودی کو ٹھنڈا کرے، خود ان کے سینے میں کئی گولیاں پیوست ہو جاتی ہیں۔ یہودی سپاہیوں نے پے در پے گولیاں چلا کر ان کے سینے کو چھلنی کر دیا ہے۔ اس وقت ان کے تین کمسن بچے ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ایک کونے میں کھڑے ہیں۔ ان میں بڑے کی عمر گیارہ سال اور چھوٹے کی تین سال ہے۔ ننھے سہیل کو صرف اتنا معلوم ہے کہ جب ماں غضب ناک ہوتی اور اسے ڈانٹنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی تھیں تو وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیا کرتا تھا اور اس وقت امی اسے لپک کر اٹھا لیتیں اور سینے سے لگا لیا کرتی تھیں۔ اس نے یہودیوں کو غضب ناک دیکھا تو غیر شعوری طور پر دونوں

ننھے ننھے ہاتھ جوڑ دیے لیکن اسے امی کے پیار کے بجائے پہلے تو ایک زناٹے دار تھپڑ ملتا ہے پھر ایک یہودی نے اس کے پیٹ میں سنگین چبھو کر اچھال دیا اور یہ کہتا ہوا آگے نکل گیا ہے:

"سانپ کے بچے کو بھی زندہ چھوڑنا یہودیوں سے دشمنی کے مترادف ہے[1]"

یہودی فوج ایک نوجوان یوسف قمر کی تلاش میں ہے، ایک دستہ ایک دو منزلہ مکان کو گھیر لیتا ہے، فوجی افسر دروازے پر دستک دیتا ہے، ایک بوڑھا عرب دروازہ کھولتا ہے، اسرائیلی دراتہ اندر گھس جاتے، مکان کا کونا کونا چھانتے اور یوسف قمر کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ فوجی گاڑی اسے لے کر روانہ ہو جاتی ہے۔ یوسف ہتھکڑی پہنے درمیان میں ہے اور اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے اسرائیلی فوجی رائفلوں پر سنگین چڑھائے بیٹھے ہیں۔ دُور ایک دو منزلہ مکان کی کھڑکی سے آل معلمی کا ایک نوجوان یہ منظر دیکھ رہا ہے۔

وہ یوسف قمر کا بچپن کا دوست ہے۔ دونوں سکول میں ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں دونوں القدس کی فضا میں اکٹھے پروان چڑھے ہیں، اور دونوں یہودیوں کے ساتھ لڑے جانیوالے معرکوں میں دوش بدوش حصہ لیتے رہے ہیں۔ معلمی کے ہاتھ میں دستی بم ہے۔ بم کا پن اس نے نکال لیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آنے والی فوجی گاڑی پر دے مارے مگر یوسف قمر کو دیکھ کر رک جاتا ہے۔ اس کا دماغ کہتا ہے:

"بم مارو" —— لیکن دل آڑے آجاتا ہے، بچپن کا ساتھی مارا جائے گا... گاڑی قریب تر آتی جا رہی ہے —— وہ فرض اور محبت کی کشمکش میں مبتلا ہے، اب اسرائیلی یوسف قمر کو لئے بالکل قریب پہنچ جاتے ہیں۔ یوسف کی نگاہیں بے اختیار اپنے دوست کے مکان کی طرف اٹھ جاتی ہیں، وہ دیکھتا ہے کہ معلمی کھڑکی میں کھڑا ہے اور بم اس کے ہاتھ میں ہے، فوراً سمجھ جاتا ہے کہ معلمی کشمکش میں ہے۔ وہ اشارے سے کہتا ہے

"ہچکچاؤ مت .... بم پھینک دو.... میری پرواہ نہ کرو"

معلمی نفی میں سر ہلا دیتا ہے، فوجی گاڑی اب کھڑکی کے عین نیچے پہنچ گئی ہے۔ اسرائیلی یوسف قمر کی آنکھوں کے اشارے سے چوکنے ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہیں اُوپر

---

[1] یہ واقعہ مہاجر کیمپ میں پہنچ کر ننھے سہیل کے گیارہ سالہ بھائی نے سنایا (الجمہوریہ قاہرہ)

اُڑ پڑا ہنستی ہیں۔ اور وہ معلمی کو بم ہاتھ میں لئے دیکھ لیتے ہیں۔ ایک فوجی اپنی بندوق پھینکتا ہے، مگر ابھی وہ گھوڑا دبانے بھی نہیں پاتا کہ معلمی بم دے مارتا ہے۔ بم ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ پھٹتا ہے۔ فوجی گاڑی اور اس میں سوار سب لوگوں کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں۔

معلمی کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ مگر اپنے دوست کی موت پر آنسو بہانے کا وقت کہاں ہے؟ ..... چند لمحے بعد فوج کی زبردست جمعیت بل ڈوزر لے کر پہنچ جاتی ہے معلمی کا مکان مسمار کیا جا رہا ہے۔ مکینوں کو باہر نکلنے کی مہلت بھی نہیں دی گئی۔ مکان اپنے مکینوں سمیت زمین کے برابر کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ مکان کے ملبے تلے زندہ دفن ہو گئے ہیں۔ ان میں ایک بچہ بھی ہے، جو صرف بیس دن پہلے پیدا ہوا تھا۔

القدس میں کئی روز سے قتل و غارت کا سلسلہ جاری ہے، اسرائیلیوں کے ہاتھ سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ بوڑھے نہ جوان نہ بچے۔ عورتیں اپنے گوہر عصمت سے محروم کی جا چکی ہیں۔ بوڑھوں کو گھروں سے ہانک کر لے جاتے ہیں اور ان سے دھوپ میں دوڑ لگواتے ہیں۔ یہ سب کچھ اسرائیلی فوج کے اعلیٰ افسروں کے سامنے ہو رہا ہے۔ بعض غیر ملکی نامہ نگار اسرائیلی فوجیوں کی چیرہ دستیوں کا ذکر جب اسرائیلی ہائی کمان سے کرتے ہیں تو انہیں جواب ملتا ہے:

"آخر ہمارے فوجی انسان ہی تو ہیں" اور یہ "انسان" وہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ جن کا مجرم یہودی نازیوں کو گردانتے ہیں۔

رات کے وقت کرفیو لگا دیا جاتا ہے۔ کوئی شخص اپنے گھر سے نکل نہیں سکتا۔ اس دوران میں یہودی فوجی دکانوں کے دروازے توڑ کر گھس جاتے ہیں اور جو چیز بھی ہاتھ لگتی ہے، فوجی گاڑیوں میں لاد کر لے جاتے ہیں۔ عبادت گاہوں کی حرمت اُن کی نظر میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ بیت لحم کی مسجدوں اور کلیساؤں کو اسرائیلی طیاروں نے تاک تاک کر تباہ کیا ہے۔ لطرون کے علاقے میں تو مساجد اور رہائشی گھروں کا بالکل صفایا کر دیا ہے۔ "فتح" کے بعد انہوں نے مسجد اقصیٰ کے صحن میں جشن مے نوشی منایا۔ اور خدا جانے کہ القدس کے مقدس مذہبی مقامات کی یہ بے حرمتی کب تک ہوتی رہے گی[1]

---

[1] یہ باب جنگ کے فوراً بعد کے عرب اخبارات بالخصوص بیروت کے ہفت روزہ "الجمہوریہ جدیدہ" کی رپورٹوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ جس کا نامہ نگار جنگ بندی کے بعد چھپ کر مقبوضہ عرب علاقے [illegible] گیا تھا۔

شہر مقدس

"آہ! القدس میں تقدیر الٰہی نازل ہوئی"

بیت المقدس ــــ جہاں عہدِ حاضر کا یہ خوفناک خونی ڈرامہ کھیلا گیا۔ اور جس میں اللہ کے حبیب ؐ کی اُمت اَن گنت قربانیوں کے باوجود بھی سرخرو نہ ہو سکی، ان شہروں میں سے ایک ہے، جنہیں نوعِ انسانی عزت و تکریم کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ جس کا ذرّہ ذرّہ مقدس ہے۔ اکثر انبیاء اسی شہر میں مبعوث ہوئے اور اس شہر کے اردگرد پھیلی ہوئی ارضِ فلسطین کے فلاح آج بھی خود کو کسی نہ کسی نبی کی اولاد بتاتے ہیں۔ یہ شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے یکساں متبرک ہے۔ اہلِ اسلام کا قبلہ اول اور حرم کعبہ اور حرم نبوی کے بعد تیسرا حرم ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد بھی سترہ ماہ تک اسی کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے رہے۔ سفرِ معراج میں یہی شہر اُن کی پہلی منزل تھا۔ یہیں حضور ؐ نے انبیاء سابق کی امامت فرمائی۔ اسی جگہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان ؑ کا مدفن اور حضرت عیسےٰ کی مہد اور لحد ہے[1]۔

یہ شہر دنیا کی تاریخ میں اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے عجیب ترین ہے، اور ڈھلوان پہاڑی پر واقع ہے، جو جزیرہ کی زرخیز زمین سے لے کر ادومیا دعقبہ تک پھیلا ہوا ہے اس کی حیثیت ایک جزیرہ نما کی سی ہے۔ جو جنوب مشرقی کونے کے علاوہ پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ جسے ایک وادی دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اس جگہ یہاں شہر آباد ہے، دو پہاڑیاں ہیں۔ ایک موریہ اور دوسری زیتون۔

بلند ترین زیتون کی پہاڑی ہے، جو بحیرہ رُدم کی سطح سے ۲۶۰۰ فٹ اور بحیرۂ مُردار

[1] عیسائی عقائد کے مطابق حضرت عیسیٰ مصلوب ہو کر مدفون ہوئے جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ زندہ آسمانوں کی طرف اٹھا لیے گئے۔

سے ۳۵۰۰ فٹ بلند ہے۔ نچلی پہاڑی مور یا سطح سمندر سے ۲۴۴۰ فٹ بلند ہے۔ بحیرۂ روم یہاں سے ۳۳ میل اور بحیرۂ مُردار ۱۰ میل ہے۔

اس سطح مرتفع میں کئی جگہوں پر چُونے کا پتھر عام ہے اور شہر کے جنوب میں نصف میل کے فاصلے پر وادی کیدرمن میں غیر یقینی گہرائیوں تک گلابی اور سفید رنگ کا سنگ مرمر ہے۔ جسے SANTA CROCE کہتے ہیں۔ اس کے قریب نرم سفید چونے کا پتھر ہے۔ جو تقریباً چالیس فٹ موٹائی کا ہے۔ تھوڑا اوپر ۵، فٹ گہری سخت چاک کی سطح ہے جبکہ اس سے اوپر ۲۹۱ فٹ موٹائی تک کا چُونے کا پتھر ہے۔ اور کوہِ زیتون اسی پتھر سے بنا ہے۔

یہ شہر کسی درہ کے دہانے پر ہے نہ ہی کسی دریا کے کنارے اور نہ کسی اہم تجارتی شاہراہ پر واقع ہے۔ اس کے باوجود یہاں کبھی قحط نہیں پڑا اور یہ شہر تین ہزار سال سے موجود ہے۔ عہد نامہ عتیق کے مطابق اس کی آبادی کو پانی کی فراہمی صرف نہرام الدراج (دریائے جیحون) سے لائے ہوئے چشموں سے ممکن تھی' جو آج بے کار ہو چکے ہیں۔ البتہ گھروں میں حوض اور چشمے آج بھی ہیں اور ان حوضوں میں موسم برسات کا پانی جمع ہو کر مکینوں کے لیے سال بھر کافی ہوتا ہے۔

اس شہر میں زیارتیں اَن گنت ہیں اور کوئی شخص ان زیارتوں کو گائیڈ کے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔۔۔۔ زائرین، جو سینکڑوں میلوں کے فاصلے سے یہاں پہنچتے ہیں۔ اُس کے گرد و نواح کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ اس کے اطراف میں پھیلی ہوئی بنجر وادیاں اور بے گیاہ پہاڑیاں اُن کے لیے استعجاب کا باعث بنتی ہیں۔

برٹانیکا انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ یہ ۳۳ صدیاں پرانا شہر ہے۔ اس نے قدرت اور انسان کے ہاتھوں تکلیفیں ہی تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ یہ مقدس شہر کئی بار اُجڑا اور آباد ہوا۔ کئی مرتبہ زلزلوں سے کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔ بیس مرتبہ محصور اور اٹھارہ دفعہ ازسرِ نو تعمیر ہوا۔ دو بار مکمل بربادی ہو چکی ہے۔ ہادریان اور بخت نصر کے عہد میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ بیت المقدس پر مذہب کی تبدیلی کے چھ دَور گزرے ہیں۔۔۔۔ اس پر ایسا زمانہ بھی آیا۔ کہ اس کو زمین کے برابر ہموار کر دیا گیا۔ گلی کوچے اور عمارتیں تباہ اور اس کے باشندے قتل یا جلاوطن کر دیئے گئے۔

بیت المقدس کے کئی نام ہیں، مختلف قوموں نے اپنے اپنے عقیدے کی بنا پر اسے مختلف ناموں سے نوازا۔ یہودی اور عیسائی آج بھی اسے یروشلم کہتے ہیں سب سے پرانا نام یبوس (JEBUS) ہے۔ یروشلم کا نام حضرت داؤد کے عہد میں اختیار کیا گیا، لیکن یہودی ربّیوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب کرنے کے لیے یہ کہا ہے کہ آپؑ نے اسے جریح (JEREH) کہا تھا اور شلم کا اضافہ شیلم (SHELM) یا شالیم نے کیا جو ۲۰۰۰ ق م میں یہاں حکمران تھا۔ رینالڈ اور الوالڈ کا کہنا ہے کہ یہ دو عبرانی الفاظ "یرو" "شلیم" کا مرکب ہے جس کے معنی "ورثۂ امن" (INHERITENCE OF PEACE) ہے۔ ایک دوسرے یورپی مؤرخ نے اس کے معانی "اساسِ امن" قرار دیئے ہیں۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ دو شہر جیبس JEBUS اور سلم (SALAM) تھے جو ایک ہو گئے اور نام بھی مرکب ہو گیا۔ جو بگڑ کر یروشلم کہلایا۔ جو لوگ اسے دو عبرانی الفاظ کا مرکب قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل لفظ جرسلم ہے۔ بعض اسے سمتی الفاظ یوری (URI) (بمعنی شہر) اور سلیم (SALIM) (دیوتائے امن کا نام) کا مرکب قرار دیتے ہیں۔ جس کے معنی "دیوتائے امن کا شہر" ہوئے۔ قدیم عبرانی نام سے عرب بھی واقف تھے۔ چنانچہ یاقوت نے "یری شلم" ۔۔۔ (بلا تشدید ل) نیز "شلم" مختلف نام لکھے ہیں۔ جو یہودیوں کے زمانے میں مروّج تھے۔ لیکن مسلمانوں نے ہمیشہ اسے بیت المقدّس (متبرک مکان) یا بیتُ المقدِس (پاک ترین مقام) کے نام سے پکارا ہے۔

قیصر ہادریان نے یہودیوں سے خالی کرانے کے بعد (۱۳۰ء) میں شہر کو "ایلیا کاپی تو لی نا" سے موسوم کیا اور اس کا پہلا جزو "ایلیا" کی شکل میں عربی میں محفوظ رہا۔ عربوں کے لیے یہ بے معنی لفظ تھا لہٰذا طرح طرح کے افسانے مشہور ہو گئے۔

یاقوت لکھتا ہے کہ:

"کعب کی سند سے روایت کی جاتی ہے کہ اس مقدس شہر کا نام ایلیا اس لیے ہوا کہ اسے ایک عورت ایلیا نے آباد کیا تھا۔" ایک اور جگہ لکھا ہے کہ "ایلیا کے معنی بیت اللہ کے ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی نقل ہے کہ یہ اپنے بانی ایلیا کے نام پر ہے۔ جو اِرم بن سام بن نوح کا بیٹا تھا اور دمشق، حمص اور فلسطین اس کے بھائیوں کے نام تھے۔

شعراء کے ہاں یروشلم کو کہیں کہیں "البلاط" کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں دربار یا شاہی محل۔ اور عربوں نے یہ لفظ لاطینی "پلا تیوم" سے لیا ہے۔ اس کے علاوہ اُسے (GOLDEN CITY) سنہری شہر بھی کہا جاتا رہا، جو اب تک رائج ہے۔ یہ اس لیے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی کرنوں سے سنہری پتھروں کے بنے ہوئے مکانات جگمگا اُٹھتے ہیں۔ اسے امن کا شہر (CITY OF PEACE) بھی کہتے ہیں لیکن جب اسے اس نام سے پکارا جاتا ہے تو تاریخ اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس شہر کی قدیم تاریخ میں بمشکل بیس سال ایسے ملیں گے۔ جن کے دوران یہاں کے باشندوں کو امن و سکون دیکھنا نصیب ہوا۔ ورنہ نوع انسان کی خون آشام تاریخ یہاں اپنے آپ کو بار بار دُہراتی رہی ہے۔ ان واقعات کو اگر یکجا کیا جائے تو یہاں ہونے والی لڑائیوں کا شمار ناممکن ہے مرنے والوں اور مجروح ہونے والوں کی گنتی انسان کو تھکا دے گی۔ اور لڑائیوں کی فہرست مرتب کرنے کے لئے عمریں درکار ہیں۔ اس کے باوجود یروشلم یا بیت المقدس اپنی جگہ پر موجود ہے۔ اس کی تقدیس میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوئی۔ اور یہ کرۂ ارض کی مختلف اقوام کے نزدیک آج بھی امن کا شہر ہے۔ یہودیوں نے اسے اس وقت مقدس شہر قرار دیا۔ جب انہوں نے اینٹی اوکس ایپی فینس کو شکست دی اور یہ ۲۰۰ ق م کا واقعہ ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک یہ اس لیے مقدس ہے کہ صلیب الصلبوت اسی جگہ تھی اور حضرت عیسیٰ اسی شہر میں مصلوب ہوئے۔ لیکن مسلمانوں کے دین نے روزِ اوّل ہی سے اسے مقدس قرار دیا ہے۔ اس کی بنیاد یبوسی بادشاہ صادق ملیک نے رکھی جو عرب تھا۔

قدامت

انسانی یاد میں دنیا کا کوئی مقام بیت المقدس سے قدیم اب تک معلوم نہیں ہوا لیکن تاریخ اس کے قدیم دور کی داستان محفوظ نہیں کر سکی۔ جو کچھ مواد جمع ہوا ہے۔ اس کے مطابق یہاں پہلے پہل آل سام ۲۵۰۰ قبل مسیح میں جو کنعنی یا فونیقی کہلاتی تھی آباد ہوئی۔ آل سام کے یہ قبائل جزیرۃ العرب سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے انہی قبائل کی ایک شاخ یبوسیوں کے نام سے مشہور تھی ۲۰۰۸ ق۔م میں شالیم بادشاہ کی حکومت تھی اور سب سے پہلے حضرت ابراہیم شہر اُر (یہ دجلہ و فرات کے سنگم پر واقع ہے) سے ہجرت فرما کر اس علاقے میں پہنچے اور حبرون (HEBRON) کے مقام پر قیام کیا جو الخلیل ... کہلانے لگا۔ اس علاقے

میں مختلف مقامات سے برآمد ہونے والی تختیوں اور کتاب مقدس کی روایات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہاں کا حاکم بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح نہ عبادت کرتا اور خود کو خدا کا فرستادہ بتاتا تھا۔ کتاب پیدائش اور ابن کثیر کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ حضرت ابراہیمؑ خاص قوت و طاقت کے مالک ہو گئے۔ اور جب دمشق کے بادشاہوں نے جناب لوطؑ سے، جو وادئ اردن میں مقیم تھے، گستاخی کی تو حضرت ابراہیمؑ اپنے آدمیوں کے ساتھ دمشق والوں کے ساتھ لڑے اور انہیں شکست دے کر دمشق تک ان کا تعاقب کیا۔

ابن کثیر کا بیان ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اس فتح کے بعد لوٹے تو بیت المقدس کے شاہ نے (جو مصر کا باجگذار تھا) شہر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا۔ یہ بادشاہ یبوسی تھا — کتاب پیدائش اور قدیم عربی مؤرخین کی روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس وادی سے حضرت ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو وادئ فاران میں چھوڑ گئے تھے۔ اور حضرت ابراہیمؑ نے ۱۷۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ تو اسی وادی کے شہر (حبرون) میں مدفون ہوئے۔ ان کی وفات کے چالیس سال بعد حضرت یعقوبؑ نے بیت المقدس کے ایک مقام "بیت ایل" پر ایک مذبح تعمیر کیا، جس کے کھنڈروں پر صدیوں بعد حضرت سلیمانؑ نے ہیکل کی عمارت اٹھائی۔

کتاب پیدائش میں ہے:

> "یعقوب ان سب لوگوں سمیت، جو ان کے ساتھ تھے، لوز پہنچا، بیت ایل یہی ہے اور ملک کنعان میں ہے، وہاں اس نے مذبح بنایا۔ اور اس کا نام ایل "بیت ایل" رکھا" باب ۳۶۔

اور جب یعقوبؑ عرصۂ دراز جلاوطنی میں گزارنے کے بعد واپس لوٹے تو ان کا نام اسرائیل ہو گیا۔ ان کی یہ جلاوطنی اپنے بڑے بھائی ادوم کے خوف سے تھی۔ جب وہ بھائی سے مطمئن ہو گئے اور واپس آئے تو بھائی ادوم نے ایثار کرتے ہوئے ادومیا کی طرف پسپائی کی۔ حضرت ایوبؑ آدوم کے بیٹے تھے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کا دور بائیسویں صدی قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے۔ ایل بیت ایل (یعنی بیت ایل کا خدا) کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے بیت ایل میں خدا کو رؤیا میں دیکھا اور اس کی یاد میں وہاں ایک مذبح بنا دیا۔ حضرت یعقوبؑ کے صاحب زادے حضرت یوسفؑ جب امتدادِ زمانہ سے مصر پہنچے اور بادشاہ ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کے پوتے اسرائیلؑ (یعقوبؑ) کی اولاد اپنے جد امجد

کی وفات سے ڈیڑھ دو سو برس بعد مصر میں منتقل ہو گئی اور اسے خوب عروج حاصل ہوا۔ لیکن حضرت یوسفؑ کے انتقال کے بعد یہ قوم معتوب ہوئی حتیٰ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے رحم فرمایا اور مصر میں آمد سے چار سو سال بعد حضرت موسیٰ کو اس میں مبعوث کیا، جنہوں نے اسے فرعون کے پنجۂ ظلم و استبداد سے نجات دلائی اور بنی اسرائیل دریائے نیل پار کر کے وادیٔ سینا میں داخل ہو گئی۔ مگر یہ قوم اپنے نبی کی نافرمان اور احسان فراموش ثابت ہوئی اور بتوں کی پوجا کرنے لگی، اور جب موسیٰؑ نے اسے ڈانٹ پلائی تو ان پر چڑھ دوڑی، مگر اللہ نے اپنے کلیمؑ کی حفاظت فرمائی۔ اس کے بعد جب حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ تو یہ قوم فرمانِ پیغمبر کی تعمیل سے گریزاں ہوئی اور صاف کہہ دیا۔

"تو اور تیرا رب جائے۔ ان سے لڑے ہم تو یہیں بیٹھے ہیں"

بنی اسرائیل کی یہ گستاخی، خداوند موسیٰؑ کو ناگوار گزری، اس نے یہ سزا دی کہ جب تک موجود نسل کے تمام بالغ نہیں گئے وہ وادیٔ تیہ ہی میں بھٹکتی رہی۔ طبری کے مطابق یہ عرصہ چالیس سال پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں ہلاک ہونے والے یہودیوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ بیت المقدس میں وہ دو سو سال بعد داخل ہوئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یشوع بن نون نے ۱۴۵۱ ق م میں بیت المقدس پر حملہ کیا۔ اس وقت اُدونی صدق یروشلم کا بادشاہ تھا۔ حبرون، یرموت، لکیس اور عجلون کے بادشاہ اس کے معاون و مددگار تھے۔ اور وہ سب کے سب عموری تھے۔ یشوع نے انہیں جبعون کے مقام پر شکست دی۔ پانچوں بادشاہ مارے گئے اور کنعان پر بنی اسرائیل کا قبضہ ہو گیا۔

بائبل کے مطابق یروشلم اس وقت بھی مقدس شمار ہوتا تھا۔ اسرائیل نے کامیابی کے بعد حبرون کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور ان کی سلطنت اردن، شام اور یمن کی سرحدوں تک جا پہنچی۔ آثارِ قدیمہ کی کھدائی بتاتی ہے کہ یشوع بن نون کی آمد سے پانچ سو سال قبل برنجی دور شروع ہو چکا تھا۔ اور مقامی لوگ تانبے میں ٹین ڈھال کر نئی دھات کا استعمال کرنے لگے تھے۔

بائبل گواہ ہے کہ جب بنی اسرائیل فراعنۂ مصر کے تحت ذلت کی زندگی گزارنے اور چالیس سال تک وادی تیہ میں بھٹکنے کے بعد فلسطین میں داخل ہوئے تو اس وقت حضرت ابراہیمؑ کے انتقال کو قریباً "پانچصد برس بیت چکے تھے" اور اس وقت بنی اسرائیل نہایت خدا پرست اور اللہ کے احکام بجا لانے والے تھے۔

بائیبل کے مطابق یشوع نے ارضِ فلسطین کی تقسیم میں یروشلم یہوداہ کو دیا لیکن یہ بھی بائیبل ہی کا بیان ہے کہ یہوداہ نے اپنے بھائی شمعون کی مدد سے لڑ کر اس شہر پر قبضہ کیا تھا اور یہ واقعہ ۱۴۰۰ق م کا ہے۔ بائیبل اس امر کی بھی گواہی دیتی ہے کہ باوجود اس کے کہ بنی یہوداہ نے یروشلم میں لوگوں کو تہ تیغ اور شہر کو تباہ کرنے میں فراخ دلی دکھائی تھی۔ بنی بنیمین، جنہیں یہوداہ آگے بڑھتے ہوئے شہر کی نگرانی سونپ گیا تھا "یبوسیوں کو جو یروشلم میں رہتے تھے، نہ نکال سکے" (قضاۃ ۱ : ۲۱) پھر جب بنی اسرائیل طاقت کے نشے میں راہِ ہدایت سے بھٹک گئے، انہوں نے احکامِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیا اور وہ جذبہ جس نے انہیں فاتح بنایا تھا دم توڑ گیا۔ تو وہ ذلیل ہو گئے۔ البتہ کبھی کبھار ان میں سے کسی کی غیرتِ ایمانی بھڑک اٹھتی، وہ ان کے جذبہ کو ہوا دیتا اور یہ وقتی طور پر ابھر آتے، لیکن اس کی موت کے ساتھ پھر ذلت و رسوائی کے قعر میں ڈوب جاتے تھے۔ یہاں تک کہ یبوسیوں نے انہیں وہاں سے نکال دیا اور یروشلم ان کے لیے "اجنبی کا شہر" بن گیا۔ اس دور میں ان پر قاضی حکومت کرتے تھے۔ لیکن ان کی قومی زندگی، طوائف الملوکی کا شکار تھی۔ کہ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک تھا، خود قاضی اور کاہن اپنی قوم کی بداعمالیوں اور بدعنوانیوں میں برابر کے شریک تھے۔ اللہ نے ان میں سموئیل نبی کو، جو یہود میں حضرت موسیٰؑ کے بعد دوسرے نبی شمار ہوتے ہیں، مبعوث فرمایا۔ سموئیل نبی نے یہودیوں کو صنم پرستی سے چھٹکارا اور فلستیوں کی غلامی سے نجات دلائی۔ چنانچہ اللہ کی شریعت پر عمل کرنے سے اسرائیلیوں پر ماضی کی شان و شوکت لوٹ آئی۔ حضرت سموئیل جب اپنی آخری منزل کو پہنچے تو انہوں نے بنی اسرائیل کی منشا کے مطابق ان پر حضرت طالوت (ساؤل) کو بادشاہ مقرر کر دیا۔ اس کے حاکم ہونے سے تیس سال قبل یعنی ۱۰۵۰ق م میں اشدودی، بنی اسرائیل کو شکست دے کر تابوت سکینہ لے گئے تھے، جو سات ماہ بعد انہوں نے خود ہی لوٹا دیا تھا۔

طالوت ۱۰۲۰ق م میں بادشاہ بنا اور اس کا سارا عرصہ فلستیوں سے لڑائیوں میں گزرا۔ ان جنگوں میں ایک نوجوان نے تلوار کے جوہر خوب دکھائے اور مشرکین کا سالارِ اعلیٰ جالوت بھی اسی جوانِ رعنا کے وار سے ہلاک ہوا۔ یہ نوجوان حضرت داؤدؑ تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سموئیل نبی کی آمد تک یہود باقاعدہ قوم کی حیثیت اختیار نہیں کر سکے تھے۔ بلکہ ان کے قبائل کی انفرادیت برقرار تھی اور وہ ایک دوسرے پر بالاتری حاصل

کرنے کی فکر میں رہتے تھے اس صورتِ حال نے انہیں شدید نقصان پہنچایا تھا حضرت سموئیل آئے۔ تو ان کی قبائلی انفرادیت کو ختم کر کے اسے ایک متحد قوم کی صورت دے دی۔ سموئیل ایک روحانی آمر تھے ــــ وہ بیک وقت شہنشاہ اور رہنما تھے اور انہیں قاضی القضاۃ استاد اور پیغمبر کے فرائض انجام دینا پڑے۔ گو انہوں نے باہم متصادم قبائل کو اکٹھا کر دیا تھا۔ لیکن ساؤل (طالوت) کے عہد میں بھی ان کی قبائلی عصبیت ختم نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ حضرت داؤدؑ مبعوث ہوئے۔ یہود کا ابتدائی دارالحکومت حبرون تھا۔ طالوت کی تخت نشینی اسی شہر میں ہوئی اور وہ یہیں سے فوجی جنگوں اور شہری مہموں کی نگرانی کرتا رہا۔ طالوت شاہی آداب کا حامل تھا۔

شہر داؤدؑ و سلیمانؑ

طالوت کے بعد بنی اسرائیل نے متفقہ طور پر حضرت داؤدؑ کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ ان کا ابتدائی دارالحکومت حبرون ہی تھا۔ اور بیت المقدس پر یبوسی قابض تھے۔ حضرت داؤدؑ نے اسرائیلیوں کی متحدہ طاقت کے ساتھ جنوب سے شہر القدس پر حملہ کیا۔ زیریں حصہ بآسانی فتح ہو گیا۔ مگر بالائی حصہ کے مکین ڈٹے رہے۔ اور حضرت داؤدؑ کی یوں تضحیک کی کہ لولے لنگڑے لوگ فصیل شہر پر لا کھڑے کیے اور پیغام بھجوا دیا۔ کہ پہلے انہیں قابو میں لائیے۔ اس پر حضرت داؤدؑ نے زبردست حملہ کیا اور آخر بالائی شہر فتح ہو گیا۔ حضرت داؤدؑ کی فوج قریباً دو لاکھ اسی ہزار تھی۔ شہر پر قبضہ کے بعد حضرت داؤدؑ نے یبوسیوں کو شہر بدر کر دیا۔ اس سے پورے فلسطین پر ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ اور ان کی عظمت میں زبردست اضافہ ہو گیا۔

ہمسایہ سلطنتیں خوف زدہ ہو کر متحد ہو گئیں اور حضرت داؤدؑ پر حملہ کرنے کی ٹھانی۔ لیکن وہ یروشلم تک نہ پہنچ سکیں بلکہ رفائیم کی وادی ہی میں شکست کھا کر پسپا ہوئیں۔ جس کے بعد حضرت داؤدؑ کی طاقت سے مرعوب ہو کر بہت سے ہمسایہ حکمرانوں نے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ جنگ و صلح کے اسی دور میں حضرت داؤدؑ نے بالائی و زیریں شہر کو ایک کر دیا اور شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کرائی۔ اس کے علاوہ جبل زیتون پر شاہی محل اور وادی میں شاہی باغ تعمیر کرایا اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ بنی اسرائیل نے یروشلم پر قبضہ کیا۔

لیے اندر "پاکیزترین جگہ" بنائی گئی جہاں "خداوند کے عہد کا صندوق" (تابوتِ سکینہ) رکھا گیا (تابوتِ سکینہ بخت نصر کے حملہ کے بعد ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا سراغ نہیں لگایا جا سکا۔)
ہیکل سلیمانی کی عمارت، کہ موریہ پہ قبۃ الصخرہ سے مغرب میں کچھ دور واقع تھی۔
"تاریخ بتاتی ہے کہ ہیکل اس دور کے فنِ تعمیر کی تکمیل تھا، اور اس سے بہتر کوئی عمارت نہ تھی۔" تاریخ یہ بھی کہتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے "ربیوں اور خادموں کے لیے بھی رہائش گاہیں بنائیں، اس کے باوجود ہر آنے والا بادشاہ اس ہیکل کی بارہ دریوں اور برآمدوں میں اضافہ کرتا رہا۔ حتیٰ کہ "تابوتِ سکینہ" کا کمرہ ان مختلف ادوار کی عمارتوں میں چاروں طرف سے گھر گیا۔

حضرت سلیمانؑ نے اپنے لیے بھی ایک عظیم محل تعمیر کرایا، جو ہیکل کے بعد دوسری عظیم عمارت تھی، اس کی تعمیر پر تیرہ سال لگے۔ اور اس کی اہم بلڈنگ ۱۵۰ فٹ لمبی، ۷۵ فٹ چوڑی اور ۴۵ فٹ بلند تھی، یہ عمارت سہ منزلہ تھی۔ حضرت سلیمانؑ کی شان و شوکت کا اندازہ اس سے لگا لیجئے۔ کہ خادموں اور نجی ملازموں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی۔ کھانے کے میز اور برتن سونے کے تھے، اور اسی شان و شوکت نے ساری دنیا کو متحیر کر دیا۔ چنانچہ ملکۂ سبا بھی متاثر ہوئی اور ایک عظیم فوج کو ساتھ لے کر شاہانہ وقار سے یروشلم میں داخل ہوئی، اس کے کاروان میں سینکڑوں اونٹ تھے جو خوشبوؤں سے لدے تھے۔ "تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس نے اس کے بعد آج تک کبھی ایسی خوشبوئیں نہیں دیکھیں، مزید برآں سونا اور بیش قیمت جواہرات تھے، اور ایک اندازہ کے مطابق ملکہ ۱۲۰ قنطار سونا لائی تھی۔
جوسیفس لکھتا ہے کہ حضرت سلیمان نے شہر پناہ کو اور مضبوط کیا اور ہیکل کی پہاڑی کو بھی فصیل کے اندر لے لیا۔ شہر کو پانی کی فراہمی کے لئے دور کی وادیوں سے نہریں کھودی گئیں، چشمے اور حوض بنائے گئے۔ ان میں سے "کنواری کا چشمہ" آج بھی دورِ سلیمانی کے فنِ تعمیر کا عظیم شاہکار ہے۔ دوسری عمارتیں بنائیں۔ سڑکوں کو پختہ کیا۔ نتیجۃً بیت المقدس اپنے دور کا خوبصورت ترین شہر بن گیا اور عظیم تجارتی کارواں اس شہر تک آنے لگے۔
حضرت سلیمان نے ایک بحری بیڑا بنایا۔ جو ہرکولیس کے روایتی شہر اور برطانیہ تک پہنچا کولمبس نے جب شمالی امریکہ دریافت کیا تو اس کا خیال تھا کہ حضرت سلیمانؑ کی دولت کا خزانہ ویسٹ انڈیز تھا۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سلیمانی بحریہ نہایت فعال تھی اور

کے اندر "پاکیزہ ترین جگہ" بنائی گئی جہاں "خداوند کے عہد کا صندوق" (تابوتِ سکینہ) رکھا گیا۔ (تابوتِ سکینہ بخت نصر کے حملہ کے بعد ایسا غائب ہُوا کہ آج تک اس کا سراغ نہیں لگایا جا سکا۔)
ہیکل سلیمانی کی عمارت، کہ موریہ پہ قبۃ "الصخرہ" سے مغرب میں کچھ دُور واقع تھی۔
"تاریخ بتاتی ہے کہ ہیکل اس دَور کے فنِ تعمیر کی تکمیل تھا، اور اس سے بہتر کوئی عمارت نہ تھی۔" تاریخ یہ بھی کہتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے "ربیوں اور خادموں کے لیے بھی رہائش گاہیں بنائیں، اس کے باوجود ہر آنے والا بادشاہ اس ہیکل کی بارہ دریوں اور برآمدوں میں اضافہ کرتا رہا۔ حتیٰ کہ "تابوتِ سکینہ" کا کمرہ ان مختلف ادوار کی عمارتوں میں چاروں طرف سے گھر گیا۔

حضرت سلیمانؑ نے اپنے لیئے بھی ایک عظیم محل تعمیر کرایا، جو ہیکل کے بعد دوسری عظیم عمارت تھی، اس کی تعمیر پر تیرہ سال لگے۔ اور اس کی اہم بلڈنگ ۱۵۰ فٹ لمبی، ۷۵ فٹ چوڑی اور ۴۵ فٹ بلند تھی، یہ عمارت سہ منزلہ تھی۔ حضرت سلیمانؑ کی شان و شوکت کا اندازہ اس سے لگا لیجئے۔ کہ خادموں اور نجی ملازموں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی۔ کھانے کے میز اور برتن سونے کے تھے، اور اسی شان و شوکت نے ساری دنیا کو متحیر کر دیا۔ چنانچہ ملکۂ سبا بھی متاثر ہوئی اور "ایک عظیم فوج کو ساتھ لے کر شاہانہ وقار سے یروشلم میں داخل ہوئی، اس کے کاروان میں سینکڑوں اونٹ تھے جو خوشبوؤں سے لدے تھے۔" تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس نے اس کے بعد آج تک کبھی ایسی خوشبوئیں نہیں دیکھیں، مزید برآں سونا اور بیش قیمت جواہرات تھے، اور ایک اندازہ کے مطابق ملکہ ۱۲۰ قنطار سونا لائی تھی۔
جوسیفس لکھتا ہے کہ حضرت سلیمان نے شہر پناہ کو اور مضبوط کیا اور ہیکل کی پہاڑی کو بھی فصیل کے اندر لے لیا۔ شہر کو پانی کی فراہمی کے لئے دُور کی وادیوں سے نہریں کھودی گئیں، چشمے اور حوض بنائے گئے۔ ان میں سے "کنواری کا چشمہ" آج بھی دورِ سلیمانی کے فنِ تعمیر کا عظیم شاہکار ہے۔ دوسری عمارتیں بنائیں۔ سڑکوں کو پختہ کیا۔ نتیجتہً بیت المقدس اپنے دور کا خوبصورت ترین شہر بن گیا اور عظیم تجارتی کارواں اس شہر تک آنے لگے۔
حضرت سلیمان نے ایک بحری بیڑا بنایا۔ جو ہرکولیس کے روایتی شہر اور برطانیہ تک پہنچا۔ کولمبس نے جب شمالی امریکہ دریافت کیا تو اس کا خیال تھا کہ حضرت سلیمانؑ کی دولت کا خزانہ ویسٹ انڈیز تھا اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سلیمانی بحریہ نہایت فعال تھی اور

دور تک پہنچتی تھی، مختصر الفاظ میں حضرت سلیمان کے عہد میں سلطنتِ اسرائیل اپنے عروج پر تھی۔

حضرت سلیمان کا انتقال ۹۷۵ ق م میں ہوا اور اس کے ساتھ ہی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ جنوبی سلطنت، یہوداہ، جس میں جنوبی فلسطین اور ادوم شامل تھا، کا پایۂ تخت یروشلم ـــ اور شمالی سلطنت ـــ اسرائیل، جو شمالی فلسطین اور شرق اردن پر مشتمل تھی، کا دارالحکومت سامرہ (نابلس) قرار پایا۔ جنوبی حکومت کا حکمران رحجام بن سلیمان اور شمالی کا یربعام تھا، دونوں ریاستوں میں ٹھن گئی۔ اور "یہوداہ نے خدا کے حضور بدی کی اور اپنے گناہوں سے اس کی غیرت کو برانگیختہ کیا۔ کیونکہ انھوں نے اپنے لیے ہر اونچے ٹیلے پر ہر درخت کے نیچے، اونچے مقام، ستون اور یسیرتیں بنائیں (یعنی غیر اللہ کی پرستش شروع کی) اور اس ملک میں لوطی بھی تھے۔ وہ ان قوموں کے سب مکروہ کام کرتے تھے، جن کو خداوند نے بنی اسرائیل کے سامنے سے نکال دیا تھا۔" (سلاطین ۱۴: ۲۳ تا ۲۵)۔ کہ رحجام کے پانچویں سال شاہِ مصر سی ساق (سی شاک)، نے یروشلم کی طرف پیش قدمی کی اور بغیر کسی مزاحمت کے شہر میں داخل ہو گیا۔ اس نے ہیکلِ سلیمانی اور شاہی خزانوں کو لوٹا اور عبادت گاہ کی تمام قیمتی چیزیں لے گیا ـــ یہ بیت المقدس کے سترہ محاصروں میں سے پہلا اور سب سے کم نقصان دہ حملہ تھا۔ سلیمان کا بیٹا مصر کا باجگذار بن گیا ـــ پھر ایسی افتاد شروع ہوئی۔ کہ سلیمان سے ہیرودس اعظم تک بیت المقدس کئی حملہ آوروں کا نشانہ بنا۔ بار بار اندرونی انتشار کا شکار رہا۔ اور اس پر اتنی مصیبتیں آئیں کہ اس کی ہیئت بدل گئی، گہری وادیاں ملبے سے اٹ گئیں۔ اور حالت اتنی بدل گئی کہ اس کے پہلے باشندوں میں سے کوئی اسے دیکھے تو پہچان نہ سکے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے حضرت سلیمان کی وفات کے بعد ہی بنی اسرائیل کی ریاست دو طاقتوں میں بٹ گئی، جو ہمیشہ باہم دست و گریباں رہیں۔ اور صدیوں تک الگ الگ بادشاہ الگ الگ مقرر ہوتے رہے۔ یہی نہیں، بلکہ بنی اسرائیل فواحش، حرامکاری، عیاشی، بدمعاشی میں کھو کر کمزور اور توحید سے منحرف ہو کر کنعان کے قدیم قبائل کی طرح بُت پرستی پر بھی مائل ہو گئے۔ وہ اپنے خدا "یہوداہ" کی مورتیاں بنانے اور دیوی دیوتاؤں کی طرح ان مورتیوں سے عجیب و غریب روایات منسوب کرنے لگے۔ انھوں نے توراۃ میں اپنی حسب منشا ردوبدل کر لیا، نبی اور کاہن مخصوص مفادات کے تحت توریت کی عبارتیں مسخ کر دیتے تھے۔

اس دور میں جو بھی ان کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرتا بنی اسرائیل اس کا تمسخر

اڑاتے، اذیتیں پہنچاتے اور قتل کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ چنانچہ قدرت نے انہیں سزا دی اور ذلت و رسوائی ان کا مقدر ہو کر رہ گئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت جب بنی اسرائیل باہم متصادم و متحارب تھے، اور خدا کی پرستش کرنے کے بجائے بتوں کو پوجنے لگے تھے۔ ۸۹۹ ق م میں جب یہوداہ کی سلطنت پر یہورام بادشاہ تھا، فلستیوں اور عربوں کی متحدہ طاقت نے یروشلم پر حملہ کیا۔ انہوں نے ہیکل کو لوٹا اور شاہ کے گھر میں داخل ہو کر جو کچھ ملا اٹھا لیا۔ حتیٰ کہ شاہ کی بیویاں اور بچے ماسوا سب سے چھوٹے بچے کے، قیدی بنا کر ساتھ لے گئے۔ یہ حملہ محض لوٹ مار کی خاطر تھا اس لئے حملہ آوروں نے شہر کو کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ لیکن اس حملہ کے فوراً بعد شاہ اسرائیل، یہوآس یروشلم پر حملہ آور ہوا، اس نے ہیکل کے سونے چاندی کے برتنوں کو سمیٹا اور سامرہ واپس چلا گیا۔ پھر ایک عرصے تک یہوداہ کی سلطنت سنبھل نہ سکی بلکہ مقامی باشندوں نے شاہ یہوداہ امصیاہ کے خلاف بغاوت کر کے اسے قتل کر دیا، اور یوں بیت المقدس، بنی اسرائیل کے قبضہ سے نکل گیا۔ لیکن امصیاہ کا بیٹا عزیاہ یہوداہ کا وارث ہوا۔ وہ سولہ برس کا تھا، جب تخت سلطنت پر بیٹھا۔ چونکہ خدا کا طالب ہوا۔ اس لیے خدا نے اسے کامیاب کیا اور یروشلم پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے معبد اور فصیل شہر کی شکستہ دیواروں کی مرمت کرائی۔ اسرائیلی فوج کو از سر نو منظم کیا اور کھیتی باڑی پر بھی توجہ دی۔ لیکن جب وہ زور آور ہو گیا تو بہک گیا اور اپنے خدا کی نافرمانی کرنے لگا۔ چنانچہ ایک زلزلہ آیا جس کے جھٹکوں سے شہر کی بنیادیں ہل گئیں۔ شاہی باغ تباہ ہو گیا اور ہیکل میں بھی دراڑیں پڑ گئیں۔

عزیاہ کے بعد اس کا بیٹا یوتام تخت نشین ہوا۔ یوتام انبیاء کی بتائی ہوئی راہ پر قائم رہا اور سولہ برس تک کامیابی سے حکومت کرتا رہا، اس کے انتقال پر آحز بادشاہ ہوا وہ انتہائی مکار اور گمراہ تھا۔ اس کے دور حکومت میں ۷۳۵ء ق م کے لگ بھگ شامی فوجوں نے یروشلم پر حملہ کیا شدید لڑائی ہوئی اور آحز شام کا مطیع ہو گیا۔ لیکن شامی فوجوں کے لوٹتے ہی شمالی بادشاہت (اسرائیل) نے حملہ کر دیا۔ یہوداہ کی کمزور سلطنت مقابلہ نہ کر سکی شمالی بادشاہت نے شہر کو لوٹا اور دو لاکھ عورتوں کو گرفتار کر کے ساتھ لے چلے، لیکن سامرہ پہنچتے ہی انہیں آزاد کر کے واپس بھیج دیا۔ آحز نے ادومیوں اور فلستیوں کے مقابلے کے لیے شاہ اشور تگلت پلنا سے مدد طلب کی۔ یہ دعوت اس کے لئے انتہائی

غلط ثابت ہوئی، کیونکہ تگلت پلناسر آیا تو سہی لیکن اس کی مدد کرنے کے بجائے ہیکل کا قیمتی سامان لوٹ کر اشور لے گیا۔

آحز کے بعد اس کا بیٹا حزقیاہ پچیس برس کی عمر میں تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اس نے ۷۲۰ ق م سے ۶۹۲ تک چالیس برس حکومت کی۔ حزقیاہ نے قوم کو بت پرستی سے نجات دلائی اور ہیکل سلیمانی کی عظمت کو بحال کیا۔ اس کے عہد میں اشوری بادشاہ سنحریب نے یروشلم پر حملہ کیا، لیکن ابھی محاصرہ جاری تھا کہ ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی جس سے اس کے سردار اور جرنیل مرنے لگے اور وہ محاصرہ اٹھا کر واپس چلا گیا۔

حزقیاہ کے بعد اس کا بیٹا منسّی بارہ برس کی عمر میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور یروشلم میں پچپن برس تک حکومت کی۔ اس کے عہد میں بنی اسرائیل پھر راہ توحید سے بھٹک گئے بت پرستی نے زور پکڑا اور بدمعاشی وعیاشی نے راہ پائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ۶۷۷ ق م کے لگ بھگ شاہ اسور کے سپہ سالاروں نے اس پر حملہ کیا تو یروشلم کے لوگ مقابلہ نہ کر سکے۔ حملہ آور منسّی کو زنجیروں سے جکڑ کر اور بیڑیاں ڈال کر بابل لے گئے۔ اور چند سال قید رکھنے کے بعد واپس یروشلم بھیج دیا۔ بادشاہت پر بحالی کے بعد اس نے کچھ تعمیراتی منصوبے مکمل کئے اور بیت اللہ کو بتوں سے پاک صاف کیا۔

اس کا جانشین بائیس سالہ امون دو ہی سال بعد اپنے غلاموں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ ۶۴۲ ق م میں اس کا بیٹا یوسیاہ وارث ہوا اور ۳۱ سال تک یروشلم میں حکومت کرتا رہا۔ اس کے عہد میں ہیکل کی مرمت اور عظمت بحال ہوئی۔ یوسیاہ شاہِ مصر نکوہ سے مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا، اور اس کا بیٹا یہوآخز اس کا جانشین ہوا، لیکن فرعون مصر نکوہ نے اسے بھی شکست دی اور تاوانِ جنگ کے طور پر سو قنطار چاندی اور ایک قنطار سونا وصول کر کے یہوآخز کو قیدی بنا کر ساتھ لے گیا اور اس کے بھائی یہویقیم کو اپنے باجگزار کے طور پر بیت المقدس میں سلطنتِ یہوداہ کا بادشاہ بنا گیا۔

یہویقیم کو سلطنت کرتے گیارہ برس ہوئے تھے کہ ۵۹۸ ق م میں بربادی اور تیرہ بختی بابل کے مقہور حکمران بخت نصر کی صورت میں نازل ہوئی۔ جو یہویقیم کو گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ اور اس کے بیٹے یہویاکین کو اپنے باجگزار کے طور پر شاہ یروشلم مقرر کر گیا۔ لیکن مصر کی سازش، ربیوں اور کاہنوں کے کہنے پر یہویاکین نے فرعونِ مصر سے سازباز

کر کے بخت نصر کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ جب یہ خبر بخت نصر کو پہنچی تو وہ بڑے طیش کے عالم میں بابل سے نکلا۔ پہلے مصری فوج کو جو یہویاکین کی مدد کے لیے آ رہی تھی۔ شکست دی۔ پھر یروشلم کا محاصرہ کر لیا اور جنگ کے نتیجے میں بے شمار یہودی مارے گئے۔ بادشاہ گرفتار ہو کر قتل ہُوا۔ اور دس ہزار پابہ زنجیر یہودی امیروں کے ساتھ بابل پہنچا دیا گیا۔ بخت نصر نے ہیکل کے نفیس برتنوں کو سمیٹا اور یہویاکین کے بھائی صدقیاہ سے اطاعت و وفاداری کا حلف لے کر بابل لوٹ گیا۔ گو کئی سال امن و امان رہا، لیکن یہودی کہاں چین سے بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے بادشاہ کو پھر اکسانا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدقیاہ بخت نصر سے باغی ہو گیا۔

مختصر سے عرصہ میں یہ تیسری بدعہدی اور بغاوت تھی۔ شاہ بابل بخت نصر یہودیوں کی پیمان شکنیوں سے تنگ آ چکا تھا؛ وہ بابل سے بحیثیت قوم یہود کے مکمل استیصال کا عزم لے کر نکلا اور فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوتے ہی اپنے فوجیوں کو قتل عام کا حکم دے دیا۔ یروشلم کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں، انہوں نے خدا کے گھر کو جلا دیا اور یروشلم کو زمین کے برابر کر دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب فاتح بادشاہ نے اپنا کام مکمل کیا تو یروشلم میں راکھ کے ڈھیر تھے اور ہر طرف دُھواں چھایا ہُوا تھا، وہ مالِ غنیمت اور بچے کھچے یہودیوں کو ساتھ لے کر بابل کی طرف لوٹ گیا۔ اس تباہی میں "تابوت سکینہ" غائب ہو گیا اور آج تک اس کا سراغ نہیں مل سکا، اس کے علاوہ بخت نصر نے یہودیوں کے تمام صحیفے نذرِ آتش کر دیے۔ اور ایک لاکھ مرد و زن قیدی بنا کر کئی میل لمبے جلوس کی صورت میں اس کے ساتھ چلے۔ بخت نصر نے انہیں اپنی سلطنت کے سرحدی علاقوں کی طرف نکل جانے کو کہا اور اس طرح غریب الوطنی ان کا مقدر ہو گئی۔ بتایا جاتا ہے کہ ان یہودیوں کی تعداد پچاس ہزار تھی۔

یہ یہود کی پہلی قومی تباہی تھی۔ اس تباہی و بربادی میں نہ صرف ہیکل سلیمانی کا نشان مٹ گیا بلکہ دیگر صحائف کے ساتھ ساتھ توریت بھی غائب ہو گئی کہتے ہیں کہ بابل کے زمانہ اسیری میں یہودی توریت کو یاد کر کے رویا کرتے اور آج بھی اس تباہی کی یاد میں "سلیمان کے روزے" رکھتے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بابل میں یہودی غلاموں کو دریائے فرات کے کنارے آباد کیا گیا اور انہوں نے اس بستی کا نام "تل ابیب" رکھا، اسرائیل کا موجودہ دارالحکومت "تل ابیب" اسی دور کی یاد تازہ کرتا ہے۔

تاریخ کے مطابق یہ تباہی ۵۸۶ ق م کے لگ بھگ کا واقعہ ہے اور اس کے پچاس برس بعد تک شہر تباہ اور اجاڑ پڑا رہا۔ البتہ زائر گریہ کناں آتے اور یروشلم کے کھنڈرات پر بیٹھ کر اسرائیل کی واپسی کے لیے دعائیں کیا کرتے اور جو یہاں پہنچ نہ پاتے وہ فرات کے کنارے یروشلم کو یاد کر کے رویا کرتے۔

اس دورِ غلامی میں دانیال اور عزیر نبی، یہود کی رہنمائی کرتے رہے، یہاں تک کہ زروبابل بن سالتی ایل نے، جو حضرت داؤد کی نسل سے تھا "صیہونیت" کی پہلی تحریک کا آغاز کیا۔

"صیہون" دراصل بیت المقدس کی ایک پہاڑی ہے، جس پر حضرت داؤد نے یروشلم کو فتح کرنے کے بعد "جشنِ فتح" منایا تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل اسی نسبت سے صیہون کو مقدس سمجھتے اور یروشلم کو "دخترِ صیہون" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ تحریک صیہونیت کا مقصد کھوئی ہوئی ریاست صیہون و یروشلم کو دوبارہ حاصل کرنا اور ہیکل سلیمانی کی ازسرِنو تعمیر تھا۔ چنانچہ جب بنی اسرائیل اپنے اعمال ـــ کی کافی سزا بھگت چکے اور ۵۳۹ ق م میں ایران کے پہلے کسریٰ خسرو جسے بائبل خورس کے نام سے یاد کرتی ہے، نے بابل کو فتح کیا۔ تو اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کے ذریعہ یہودیوں کو اپنے وطن واپس جانے کی اجازت دے دی، چنانچہ یہودیوں کے قافلے فلسطین کی طرف جانے لگے ـــ تاریخ بتاتی ہے، کہ سارے یہودی واپس نہیں گئے۔ صرف ۴۲۳۶۰، افراد لوٹے ـــ وہ خالی ہاتھ نہیں آئے تھے، بلکہ انہیں "خداوند خدا کے گھر کے برتن بھی دے دیئے گئے تھے، جو بخت نصر لوٹ لے گیا تھا، اور ان کا قائد شیس بضر تھا۔"

ان کی فلسطین میں آمد کے سات ماہ بعد یشوع بن یوصدق اور زروبابل بن سالتی ایل کی قیادت میں ہیکل کی ازسرِ نو تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ لیکن معماروں میں خاربے کے فقدان کی بنا پر یہ کام بیس سال جاری رہا اور ہیکل کی تعمیر ۵۱۶ ق م میں مکمل ہوئی۔ ہیکل بن چکا تو "عزرا نے، جو "ماہر فقیہہ تھا، وہ کتاب شریعت "توریت"، "پڑھ کر سنائی جسے اس نے بزرگانِ یہود کے مشورہ پر اپنی یادداشتوں سے قلم بند کیا تھا۔ اصل توریت بخت نصر کے عہد میں نابود ہو چکی تھی۔ نئی توریت عزرا نے تالیف کی اور نہ صرف اندازِ بیان میں بہت سا ردّ و بدل کیا بلکہ الحاقی عبارتیں بھی شامل کر دیں۔

"تاریخ بتاتی ہے کہ ہیکل ۵۱۶ ق م میں مکمل ہو چکا تھا، لیکن فصیل اور شہر ابھی ملبہ کا ڈھیر تھا، اور نحمیاہ کے دور تک انہیں دربار ایرانی میں اتنا اثر و رسوخ حاصل نہیں ہو سکا تھا کہ شہر کی مضبوطی کے لیے تعمیرات کی اجازت ملتی۔ چنانچہ بائیبل میں نحمیاہ کہتا ہے:

"اور چند آدمی یہوداہ سے آئے، اور میں نے ان سے ان یہودیوں کے بارے میں جو بچ نکلے تھے۔ اور اسیروں میں سے باقی رہے تھے۔ اور یروشلم کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ باقی لوگ جو اسیری سے چھوٹ کر اس صوبہ میں رہتے ہیں نہایت مصیبت اور ذلت میں پڑے ہیں اور یروشلم کی فصیل ٹوٹی ہوئی اور اس کے پھاٹک آگ سے جلے ہوئے ہیں۔" باب ۱ : ۴

چنانچہ نحمیاہ نے تعمیر شہر اور تعمیر فصیل کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی اور ایک روز جب شاہ ایران ارتخششتا (اردشیر اول) نشہ مے میں مست تھا، درخواست کی، جو منظور ہو گئی اور نحمیاہ یروشلم کی تباہی کے ۱۴۳ سال بعد ۴۴۵ ق۔م میں شاہی اجازت نامہ کے ساتھ یروشلم پہنچا۔ تعمیر فصیل کا کام فوراً شروع کر دیا گیا۔ بے شمار رکاوٹوں اور مخالفتوں کے باوجود ۵۲ دن کے مختصر عرصے میں دیوار یں شہر کی حفاظت کے قابل ہو گئیں۔ یہ فصیل پرانے سامان سے پرانی بنیادوں پر ہی اٹھائی گئی تھی۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک امن و امان رہا اور شہر خوشحال ہو گیا۔ نتیجۃً یہودی پھر عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ چنانچہ جب سکندر اعظم نے (۳۳۲ ق م) دارائے ایران کو شکست دی اور طائر اور غزہ کو فتح کرنے کے بعد یروشلم کی طرف بڑھا تو یروشلم کے یہودیوں نے مقابلہ کرنے کے بجائے شہر سے تین میل باہر جا کر اس کا استقبال کیا اور سکندر اعظم نے شہر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اخبار الطوال میں ہے کہ سکندر اعظم کا اسی شہر میں انتقال ہوا اور اس کی لاش کو سونے کے تابوت میں بند کر کے سکندریہ پہنچایا گیا۔

سکندر کی موت پر اس کی سلطنت کے حصے بخرے ہوتے تو یروشلم مصر کے یونانی حکمرانوں کے حصے میں آیا، اور اس دور میں بہت سے یہودی مصر کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ یہاں انہوں نے بہت جلد اثر و رسوخ اور اعتماد پیدا کر لیا۔ یونانی تہذیب نے یہودیوں کی نجی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

۲۰۳ ق م میں انطوخیوس اعظم شامی نے یروشلم پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا لیکن چار سال بعد

پھر سکندریہ کا جنرل سکوپس یروشلم پر قابض ہو گیا اور اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر شہر میں مستقل طور پر مصری فوج کی چھاؤنی قائم کر دی، لیکن شامی بادشاہ نے حملہ کر کے مصریوں کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا، یہودیوں نے مصریوں کو نکالنے میں انطوخیوس کی مدد کی تھی۔ لیکن یہ شاہ یہودیوں کا دوست ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے یہودیوں کے داخلی انتشار کو اپنی اغراض کے لیئے ہوا دی۔

۱۷۰ ق م میں ایپی فینس (یونانی دہیڈرین) نے اس شہر کو تباہ کیا، محلات جلا دیئے عبادت گاہ کی تمام دولت لوٹ کر لے گیا، اور لوگوں کو ان کے مذہب سے منحرف کیا، جو شخص قانونِ الہٰی کی کتاب پڑھتا اسے سخت سزا دی جاتی۔

یونانیوں کے اس ظلم و ستم کے نتیجہ میں ایک خدا پرستانہ تحریک "مکابی" نے جنم لیا۔ اس نے تقریباً اسی ہزار یہودیوں کو تہ تیغ کیا۔ مکابی دراصل ایک "کاہن" تھا۔ اس نے اپنے پانچ بیٹوں کی مدد سے یونانیوں کے خلاف بغاوت منظم کی، اور کامیاب ہو کر شہر اور معبدِ سلیمانی کی حرمت کو بحال کیا۔ مکابی نے جشنِ فتح منایا۔ جس کی یاد یہود آج تک عید ہنوکہ کی صورت میں مناتے ہیں۔

۱۶۸ ق م میں اینٹوکس مصری نے چڑھائی کر کے شہر کو فتح کر لیا۔ لیکن ۶۵۔ ق م میں اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے رومیوں نے مداخلت کی۔ اور شہر کا حاکم آرسٹوبولس روم کا باجگذار ہو گیا۔ مگر ارسٹوبولس کے خراج ادا نہ کرنے پر رومی جنرل پومپائی نے ۶۳ ق م میں شہر کا محاصرہ کر کے ہیکل کو تباہ کر دیا اور بارہ ہزار شہری اس کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اس کے ۲۳ سال بعد تک بیت المقدس قدرے محفوظ رہا مگر ۴۰ ق م میں جولیس سیزر اطلی پیٹر نے پارتھین فوجوں کی مدد سے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا "ہیرود اعظم" رومی شہنشاہ کے باجگذار کی حیثیت سے یہاں کا بادشاہ بنا، لیکن اسے اپنی سلطنت فتح کرنا پڑی اور پانچ ماہ کے محاصرہ کے بعد یروشلم میں داخل ہو سکا۔ اس کے بعد یروشلم کی تاریخ کا وہ دور شروع ہوا، جو ایک طرف اپنی عظمت اور دوسری طرف اپنے خوفناک جرائم کی وجہ سے مشہور ہے۔

ہیرود اعظم کے عہد میں بیت المقدس نے دوبارہ سلیمانؑ کے عہد کی عظمت حاصل کر لی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ حضرت سلیمانؑ کے عہد میں یہ خالص عبرانی اور یہودی شہر تھا، جبکہ ہیرود اعظم کے دور میں یہ دوسرا روم بن گیا۔ ہیرود اعظم نے شہر کے گرد تیسری مرتبہ فصیل بنائی اور ہیکل سلیمانی کو از سرِ نو عظمت بخشی۔ ہیرود نے شہر کی وادیوں میں تھیٹر، سیرگاہیں اور سرکس بھی

تعمیر کئے۔

کیپٹن وارن کی تحقیقات کے مطابق ہیرود کے وسیع شدہ ہیکل کا رقبہ قریباً ایک ہزار مربع فٹ تھا۔ اور شان وشوکت میں سلیمانؑ کے ہیکل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس نے ہیکل اپنی رعایا کو جیتنے کے لیے بنوایا تھا۔ لیکن وہ اپنی رعایا کا دل جیت نہ سکا۔ بلکہ قوم اس سے نفرت کرتی تھی۔ اور یہودی ربیوں نے ہیکل کی تعمیر کے سلسلے میں کبھی ہیرود کی محنت وخدمت کا اعتراف نہیں کیا۔

ہیرود نے سلیمانؑ کی طرح شہر میں فن تعمیر کے متعدد شاہکار قائم کرائے۔ تاریخ اس بات میں دونوں (سلیمانؑ اور ہیرود) کو مماثل قرار دیتی ہے کہ دونوں شاہوں پر بیرونی اثرات تھے اور دونوں کی عظیم عمارتیں غیر ملکی فن تعمیر کا نمونہ تھیں۔ حضرت سلیمانؑ نے اس سلسلے میں مصر اور ٹائر سے اثر لیا۔ تو ہیرود نے یونان وروما کی نقل کی۔ دونوں نے شہر کے گرد فصیل بنائی اور کوہ موریہ کو ہیکل سے زینت بخشی، سلیمانؑ نے معبد، یہوواہ سے عقیدت اور اس کی رضا کے لیے تعمیر کیا تھا، مگر ہیرود اپنے معماروں کی شہرت وعظمت تسلیم کرانے کا خواہاں تھا۔

حضرت سلیمانؑ کے عہد میں شہر خالصتاً مذہبی تھا اور پورے شہر میں کوئی عمارت ایسی نہ تھی، جہاں خود ساختہ دیوتاؤں کی پوجا ہوتی ہو، لیکن ان کے بعد اور بالخصوص مکابین کے تجدید مذہب کے بعد بڑے ربی کی حیثیت سے ایسے لوگ بھی سامنے آئے، جن کی شخصیت عوام کی گمراہی کا باعث بنی، انہی میں ایک یشوع تھا، جس نے ربی اعظم ہونے کے باوجود یہودی نام سے نفرت کی اور اپنا نام (JASON) جاسو رکھا۔ اس کے علاوہ ہیکل کے باہر سرکس کھیلوں کے سٹیڈیم اور تھیٹر قائم کیے اور ہیکل میں عبادت کرتے، کاہنوں کی آوازیں، سرکس وتھیٹر کے ہنگامے میں دب کر رہ جاتیں، ہیرود کی سرپرستی میں ان برائیوں کو بہت عروج حاصل ہوا تاریخ بتاتی ہے کہ ہیرود نے اپنی علاتی بھتیجی سے دوسری شادی کی تو حضرت یحییٰؑ نے اسے خلاف شرع قرار دیتے ہوئے احتجاج کیا۔ ہیرود سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے حضرت کا سر کاٹ کر اپنی بیوی کو نذر کیا۔ اس کے عہد میں برائیاں اپنے عروج کو پہنچ گئیں — اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کی موت کے ساتھ ہی سلطنت، نسل ونسب کے تفرقات کا شکار ہو کر تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ تاہم یہ تینوں ریاستیں رومیوں کی باج گزار رہیں۔

مسیح ناصری کا شہر

مؤرخین کا کہنا ہے کہ حضرت مسیح ہیرودؔ اعظم کے عہد میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے وہ اہلِ روم کا باجگزار تھا اور یہودی نہ تھا بلکہ ادومی تھا، جو حضرت یعقوب کے بڑے بھائی عیسو کی اولاد تھے۔ یہودی اس کو غاصب سمجھتے اور اس سے ناخوش تھے۔ تاہم اس نے سردار کاہن کی لڑکی سے شادی اور ہیکل کی از سرِ نو تعمیر اور اس کی آرائش و زیبائش پہ بے شمار دولت خرچ کر کے یہودیوں کے دل میں گھر کرنے کی بہت کوشش کی۔ یہ شخص بڑا ظالم اور سفاک تھا، جب ناصرہ میں حضرت عیسٰے کے پیدا ہونے کی خبر ملی تو اس نے اُن سب لڑکوں کو قتل کروا دیا۔ جو دو سال یا اس سے چھوٹے تھے" (متی ب ۲ : ۱۶) اور مرتے وقت اس خیال سے کہ لوگ اس کی موت کی خبر سن کر خوش ہوں گے یہ حکم دیا۔ کہ شہر کے معززین اور سرداروں کو بلا کر ایک مکان میں بند کر دیا جائے اور اس کی وفات پہ ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تا کہ لوگ اس کی وفات پہ خوشی منانے کے بجائے ان سرداروں کا سوگ منائیں۔

اس خونخوار شخص کی موت حضرت مسیحؑ کی پیدائش کے تھوڑے عرصہ بعد واقعہ ہوئی۔ اور یہودیہ کی سلطنت اس کے فرزندوں میں تقسیم ہو گئی۔ یہودیہ ملک شام کا ایک صُوبہ ٹھہرایا گیا۔ اور ارخلاؤس (اگرپا) اپنے باپ کی جگہ یہودیہ کا حکمران ہُوا۔

عیسائی مؤرخین کا کہنا ہے کہ حضرت عیسٰے کے والدین انہیں بیت المقدس میں پہلے پہل چار سال کی عمر میں لائے تاکہ ہیکل میں خدا کے حضور نذرانہ گزارا جائے اور اس طرح حضرت عیسٰے "قانونی بیٹا" (SON OF LAW) قرار پائیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت شہر میں دو مذہبی گروہ فریسی اور فقیہہ تھے۔ فریسی قدیم یہودیت کی نمائندگی کرتے اور فقیہہ لبرل تھے۔ اور اپنے اپنے عقائد میں دونوں گروہ متشدد تھے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ان لوگوں کا تھا، جن میں مذہب کا فقدان تھا، جو انسانی حسیات و جذبات کو اہمیت دیتا۔ عیش و عشرت کو مقصدِ زندگی گردانتا۔ اور بیت المقدس کے تھیٹروں اور کلبوں کی سرپرستی کرتا تھا، اول الذکر دونوں طبقوں کے رہنما نیک اور سادہ لوگ تھے، جبکہ مؤخر الذکر طبقہ کی سرپرستی بادشاہ اور اس کے درباری کرتے۔ اسی طرح شہر

یں مختلف زبانیں رائج تھیں۔ عبرانی زبان صرف ربی اور کاہن ہیکل میں عبادت کے دوران استعمال کرتے، عام لوگ فلسطینی آرامی بولتے، حضرت عیسٰیؑ اور ان کے حواریوں کی زبان یہی تھی۔ اور شاہی دربار اور کیمپ میں سادہ یونانی رائج تھی۔ ربی اور کاہن، دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھتے اور ان سے نفرت بھرا سلوک کرتے، ان کے نزدیک جو شخص عبرانی نہیں سمجھ سکتا تھا وہ بے رُوح تھا۔

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ بارہ برس کی عمر میں بیت المقدس آئے۔ اور لوگوں کے سامنے "اللہ کا فرستادہ" ہونے کا دعوٰے پیش کیا تو لوگوں نے انہیں جھٹلایا اس پر انہوں نے ہیکل کی طرف نگاہ اٹھائی اور تباہی کی خبر دیتے ہوئے کہا، کہ اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ نہیں رہے گی۔ اور ناصرہ لوٹ گئے۔ پھر ۲۹ء میں پانچ مرتبہ انہوں نے یہاں کا دورہ کیا۔ اور ہر بار یہودیوں کو دعوتِ حق دی، لیکن انہوں نے ایمان لانے کے بجائے انھیں ستانا شروع کیا اور رومیوں کے ساتھ مل کر انھیں سُولی پر چڑھانے کی سازش کی۔ اس وقت پنطش پلاطس بیت المقدس کا حکمران تھا۔ اس نے حضرت عیسٰیؑ پر الزام لگایا کہ وہ قیصرِ روم کے خلاف بغاوت پھیلا کر خود بادشاہ بننا چاہتے ہیں، متی کی انجیل میں ہے کہ پنطش پلاطس نے یہودی کاہنوں کے پُرزور اصرار پر کہ حضرت عیسٰیؑ کو صلیب دی جائے کہا کہ "میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں"۔ اس کے باوجود وہ یہود کے مطالبے کو ماننے پر مجبور ہو گیا اور حضرت عیسٰیؑ کو ۱۶ اپریل ۳۰ء کو عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق بیت المقدس میں (GOLGATHA) کھوپڑی کی جگہ صلیب پر چڑھا کر ہلاک کر دیا۔ قرآن پاک نے حضرت عیسٰیؑ کو مصلوب اور قتل کیے جانے کی تردید کی ہے، اور کہا ہے کہ "انھیں نہ قتل کیا گیا نہ مصلوب، بلکہ وہ (یہود و نصاریٰ) شبہ میں ڈال دیئے گئے، اور اللہ نے انھیں (حضرت عیسٰیؑ کو) اپنی طرف اٹھا لیا۔

یروشلم کی تباہی

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے عہد میں رہائشی اور تجارتی حصے الگ الگ تھے لیکن جب حضرت عیسٰیؑ اس شہر میں وارد ہوئے۔ شہزادوں اور حکمران خاندان کے دوسرے افراد اور تاجروں کی رہائش گاہیں بلند ہو گئی تھیں۔ اور ان کے پہلو بہ پہلو بازار اور دکانیں تھیں۔

سے ڈھائی لاکھ تک تھی۔ جو قریباً ۲۰۰ ایکڑ میں پھیلی ہوئی تھی۔ دولت کی فراوانی اور اشیائے ضرورت کی ارزانی نے شہر میں بدکاری و بداخلاقی کو رواج دیا۔ نتیجتہً ایک مخصوص گروہ کے سوا پوری قوم مکروہات و محرمات کی رسیا اور شائق تھی، اس کے باوجود اس کے نسلی تفاخر میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ واقعات شاہد عادل ہیں کہ یہود نے ہمیشہ خود کو دوسری اقوام سے بالاتر اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کو GOYIM گھٹیا تصور کیا ہے۔ تالمود میں ہے کہ " خدا نے یہود کو فرشتوں سے بہتر قرار دیا ہے " اور یہود اور غیر یہود میں وہی فرق ہے، جو انسان اور درندے میں۔ ان کا یہی ذہنی فتور بیت المقدس کی بار بار تباہی کا باعث بنا ۔۔۔ اور اب بھی جبکہ ان پر قیصر روم کا نمائندہ قیصریہ سے اُن پر حکومت کرتا تھا، وُہ رومیوں سے بیزار تھے۔ اور ہمیشہ ان کی حکومت سے آزاد ہونے کی فکر میں رہتے تھے۔ چنانچہ ۶۴ء اور ۶۶ء میں انہوں نے رومیوں کے خلاف زبردست بغاوت کی۔ لیکن ناکام رہے۔ اس وقت بیت المقدس کا حاکم ہیرود اعظم کی اولاد سے تھا۔ اسی دوران ۳۴ء میں پولس (سینٹ پال) نے جو پہلے فریسی کاہنوں میں تھا، عیسائیت قبول کر لی، اور بیت المقدس میں مسیحیت کی دعوت دینے لگا۔ یہودیوں نے اس "کافر" کو گرفتار کر کے حاکم قیصریہ کے پاس بھجوا دیا۔

۶۹ء میں بیت المقدس کے یہودیوں نے اپنے نسلی تفاخر کی آڑ میں الیعذر بن انانیاس کے کہنے پر قیصر کی نذروں کو جو ہیکل میں چڑھانے کے لئے بھیجی گئی تھیں، رد کر دیا۔ یہ گویا قیصر روم کے خلاف ایک نئی بغاوت کا آغاز تھا۔ ہیرود اعظم کے پڑپوتے اغریپا نے تین ہزار سوار بھیج کر اس سرکشی کو دبانا چاہا لیکن یہودیوں نے تمام رومی فوجی ہلاک کر دیئے۔ اس کی خبر قیصر روم کے نائب حاکم شام کستی اوس کو پہنچی تو وہ بغاوت کو کچلنے کے لئے بیت المقدس کی طرف بڑھا، لیکن ابھی وہ شہر سے چھ میل کے فاصلے پر تھا، کہ یہودیوں نے اس پر اچانک حملہ کر کے پانچ سو رومیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ کستی اوس مشتعل ہو گیا۔ اس نے تیزی سے شہر کی جانب کوچ کیا اور مضافات کے بعض حصوں کو نذرِ آتش کر کے ہیرود اعظم کے محل کے سامنے خیمے گاڑ دیئے۔ لیکن زبردست نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہونے پر مجبور ہوا۔ اس پسپائی کی خبر قیصر روم کو ملی۔ تو اس نے مشہور رومی جرنیل اور شاہ وسپین کے بیٹے طیطس (TITUS) کو یروشلم پر بھیجا۔ طیطس نے شہر کا محاصرہ کر لیا، جو ایک ماہ جاری رہا۔ ... لیکن کامیابی طیطس کے قدموں میں لوٹ

رہی تھی۔ ۹ اگست ۷۰ء کو وہ شہر میں داخل ہو گیا اور جب رومی سپاہی، یہودیوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہیکل کے اندرونی صحن میں داخل ہوئے، تو ایک یہودی نے جلتی ہوئی مشعل ہیکل کے اندر پھینک دی جس سے ہیکل میں آگ بھڑک اٹھی جو طیطس رومی کی کوششوں کے باوجود بجھ نہ سکی اور ہیکل جل کر راکھ ہو گیا۔ اتفاق زمانہ دیکھئے کہ یہ وہی دن تھا جس روز چھ سو سال پہلے شاہ بابل نے ہیکل سلیمانی کو برباد کر دیا تھا۔ لیکن اس دفعہ بربادی خود یہودیوں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب ہیکل جل رہا تھا۔ سپاہی برابر کشت وخون میں مشغول رہے قربان گاہ کے پاس لاشوں کا ڈھیر لگ گیا اور خون دریا کی طرح بہہ نکلا۔ ایک عجیب قسم کی شورش اور غلغلہ برپا تھا۔ فاتحین کے نعروں اور مفتوحین کی چیخوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ رومیوں نے جب ہیکل کو راکھ ہوتے دیکھا تو انہوں نے باقی حصہ عمارت کو بھی آگ لگا دی۔ ہیکل کا خزانہ جس میں بے شمار زر وسیم، لباس اور زیورات بلکہ قوم یہود کا تمام مال ودولت جمع تھا، جل کر خاک ہو گیا۔ اب صرف بیرونی حصے کے حجرے باقی تھے، جن میں چھ ہزار سے زیادہ عورتیں، بچے اور مرد حفاظت کے خیال سے جمع تھے، لیکن پیشتر اس کے کہ طیطس کوئی حکم دے۔ سپاہیوں نے ان کو بھی نذر آتش کر دیا۔ اور وہ سب کے سب وہیں جل مرے۔

جوسیفس لکھتا ہے کہ ہیکل کو آگ لگنے کے بعد اکثر لوگ بالائی شہر میں پناہ گزین ہو گئے اور انہوں نے وہاں مقابلے کی ٹھان لی۔ طیطس نے ساتویں ستمبر کو بالائی حصۂ شہر پر حملہ کیا۔ رومی شہر میں داخل ہو گئے قتل عام شروع ہوا اور شام تک جاری رہا۔ تمام گلی کوچے کشتوں اور بھوک سے مرے ہوئے لوگوں کی لاشوں سے پُر نظر آتے تھے۔ صبح ہوتے ہوتے شہر جل کر خاک سیاہ ہو گیا، جو لوگ قتل سے بچے رہے۔ وہ غلامی میں فروخت ہوئے۔ جن کی تعداد ۷۰ ہزار تھی۔ اس کے بعد شہر طیطس کے حکم سے بالکل زمین کے برابر کر دیا گیا۔

"عیسائیت کے ابتدائی ایام" کا مصنف راوی ہے کہ طیطس رومی نے جب بیت المقدس فتح کیا، تو دراز قد حسینائیں، فاتحین کے لیے چن لیں، ۱۷ سال سے زائد عمر کے لڑکے ہزار در ہزار مصر کی کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیے۔ کئی ہزار آدمیوں کو گرفتار کر کے مختلف شہروں میں بھجوا دیا۔ تاکہ ایمفی تھیٹروں میں جنگلی جانوروں سے پھڑوانے اور شمشیر زنوں سے کٹوانے یا خود آپس میں ایک دوسرے کو کاٹنے کے کام لایا جا سکے۔ دوران جنگ ۹۷ ہزار غدار قیدی بنے۔ جن میں سے گیارہ ہزار صرف اس وجہ سے مر گئے کہ ان

کے نگہبانوں نے انہیں کھانے کو کچھ نہیں دیا تھا، ان کے علاوہ جنگ کے دوران جو لوگ قتل ہوئے۔ ان کی مجموعی تعداد ۷۹، ۷، ۳۳، ۱ بتائی جاتی ہے۔ عیسائی مؤرخین کا کہنا ہے، کہ یہودیوں کو یہ سزا اس لیے ملی کہ انہوں نے اس حادثہ سے چالیس سال قبل جب، عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا، پلاطس کے حضور میں کہا تھا۔ کہ "اس کا (یعنی یسوع مسیح) کا خون ہم پر اور ہماری اولاد پر ہو۔" تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہ تباہی اتنی مکمل تھی کہ کوئی یہودی باقی نہ رہا، جو بتا سکتا۔ کہ ہیکل مغربی پہاڑی پر تھا۔ یا مشرقی پر ــــ اس بیان کی روشنی میں ہیکل کے بارے میں آجکل جو دعوے کیے جاتے ہیں۔ وہ بے بنیاد ہیں۔

اس کے بعد اگرچہ مسیح کے پرستاروں کو یہودیوں کے ظلم و تشدد سے نجات مل گئی۔ لیکن ان کی مصیبتوں کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ اب بُت پرست ان کے دشمن تھے، دوسری جانب تیس چالیس برس کے بعد فلسطین میں چھپے ہوئے یہودیوں نے پھر سر نکالنا شروع کر دیا۔ اس وقت بیت المقدس کی راکھ سے ایک نیا شہر جنم لے چکا تھا۔ چنانچہ یروشلم کا شہر عیسائیوں کے لیے شہر قیامت بن گیا۔ سنہ۱۰۰ء اور ۱۰۶ء میں یہودیوں نے عیسائیوں کو بے دریغ قتل کیا۔ ۱۳۵ء میں معبد دوبارہ بن کر تیار ہُوا لیکن رومیوں نے اسے گرا کر اس کی جگہ ہل چلا دیئے۔ ۱۳۶ء میں رومی شہنشاہ ہیڈرین نے اسے دوبارہ آباد کیا اور شہر کا نام پہلے "ایلیا" اور پھر "کیپی ٹو لینا" قرار دیا۔ یہودی پھر آباد ہوئے اور ۲۳۷ء، ۲۵۳ء، ۲۵۷ء، ۲۷۴ء، اور ۳۰۲ سن عیسوی میں عیسائیوں کو بے دریغ قتل کیا لیکن اقتدار کبھی حاصل نہ کر سکے۔ یہاں مسیحیت کا آغاز ۲۲۵ء میں آریجن کے دورہ فلسطین سے ہُوا تھا اور اس دور مصیبت میں بہت سے عیسائی پہاڑی غاروں میں جا چھپے تھے، مگر جب قیصر روم قسطنطین نے عیسائیت قبول کر لی۔ اور رومی سلطنت کے داخلی جھگڑوں سے تنگ آکر آبنائے فاسفورس کے قریب نیا شہر قسطنطنیہ آباد کر کے اسے اپنا دارالحکومت بنا لیا، تو عیسائیوں کا یہ دور ابتلا ختم ہوا اسی قسطنطین نے ۳۲۶ء میں بیت المقدس کو عیسائی ریاست میں شامل کر کے یہاں مشہد MARTYRION اور کلیسائے نشور (CHURCH OF RESURRECTION) تعمیر کرائے۔ ہزارہا عیسائی یورپ کے مختلف ملکوں سے زیارت کے لیے آنے لگے۔ جن کے لیے مسافر خانے تعمیر ہوئے اور سارا شہر عیسائی ہو گیا۔ عیسائی روایت کرتے ہیں۔ قیصر قسطنطین کی ماں ہیلینا نے خواب دیکھا کہ کیلوری کی پہاڑی میں وہ صلیب دفن ہے جس

پر مسیح کو مصلوب کیا گیا تھا، چنانچہ اس پہاڑی کی کھدائی کر کے وہ صلیب برآمد کی گئی اور اسے سونے چاندی سے منڈھ کر زر و جواہرات سے آراستہ کیا اور یروشلم کے بڑے کلیسا میں سجا دیا گیا۔ عیسائی مؤرخین کا بیان ہے کہ قسطنطین (CONSTENTINE) انتہائی ظالم تھا، اس نے اپنی بیوی، بچے اور خسر کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔

۳۹۵ء میں تھیوڈوسیس (THEODOSIUS) شاہِ روما نے اپنی سلطنت اپنے دونوں بیٹوں میں تقسیم کی تو بیت المقدس، روم کی مشرقی سلطنت کا حصہ بنا۔ اس وقت تک یہ شہر عالمِ مسیحیت کی عقیدت و ارادت کا مرکز قرار پا چکا تھا، لیکن خوشحالی کے ساتھ ساتھ اہلِ شہر بالعموم اور یہود بالخصوص عیش و عشرت میں ڈوب گئے تھے۔ ۵۲۷ء سے مسلسل ایک صدی تک یہود کی وجہ سے شہر میں حرام کاری اور بدکاری عروج پر رہی۔ آخر شہنشاہ ہرکولیس نے ساتویں صدی کے اوائل میں یہود کو بیت المقدس سے نکال دیا۔ چنانچہ یہود نے ہرکولیس (ہرقل) کے مقابلے میں ایران کی حمایت کی اور ۶۱۴ء میں ایران و روم کی کشمکش میں جو تقریباً ایک صدی سے جاری تھی، خسرو ثانی شاہِ ایران نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ ایک روایت کے مطابق ایرانی فوج نے بیس ہزار عیسائیوں کو تہ تیغ کیا اور یہودیوں پر مظالم کا بدلہ چکایا۔ کلیسائے مزار مقدس اور دوسرے کلیسا برباد کر دیئے، ان کے خزانوں پر قبضہ اور بڑے پادری کو قید کر لیا۔

چودہ برس بعد روم کے شاہ ہرقل نے عیسائیوں کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے حملہ کیا۔ اور خسرو شاہِ ایران کی فوجوں کو شکست دی، اصلی صلیب یروشلم لے گیا۔ اور یہودیوں کو فلسطین سے نکال باہر کیا۔ اس وقت عرب میں آفتابِ نبوت ضیا ریز ہو چکا تھا اور فتح روم کی شہادت مل چکی تھی۔ سورۃ الروم میں یہ بشارت موجود ہے۔ سردارانِ عرب ایران سے دلچسپی رکھتے اور ایرانی فتح کے خواہش مند تھے۔ اس لیے رومی فتح کی شہادت پر مسلمانوں اور رسول اللہ کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب روم کے لشکر کامیاب اور ایرانی ناکام ہوئے تو ان کے حوصلے پست ہو گئے۔

شاہ ہرقل کی کامیابی سے ۶۳۷ء تک جب بطریق صفرونیوس نے ستر دن (بروایتِ دیگر چار ماہ) کے محاصرہ کے بعد اس مقدس شہر کو مسلمانوں کے حوالے کیا۔ یہ عیسائیوں کے قبضہ میں رہا۔

اسراء و معراج

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیَاتِنَا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بڑا اہم واقعہ جو تاریخ میں اسراء و معراج کے عنوان سے موسوم ہے، کس سال، کس تاریخ اور کس مہینہ وقوع میں آیا۔ حتمی طور پر تاریخ کچھ فیصلہ نہیں کر سکی۔ لیکن اتفاق اس پر ہے کہ یہ واقعہ ۲۷ رجب کو واقعۂ ہجرت سے اٹھارہ ماہ قبل وقوع پذیر ہوا۔ جس نے مسلمانوں کی نظروں میں حرم کعبہ کے بعد حرم القدس کو عزت و عظمت کا مقام دیا۔

ابن ہشام اور ابن اسحاق کے بیان کی رو سے:

"پھر اللہ اپنے رسول کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔"

ابن سعد کے بیان کی رو سے رسول اللہ کو معراج ہجرت مدینہ سے پورے اٹھارہ مہینے پیشتر ہوئی تھی، اور رسول اللہؐ اس رات گم پائے گئے تھے۔ عبدالمطلب کے بیٹے انہیں ڈھونڈتے پھرے۔ عباس بھی ڈھونڈنے والوں میں تھے۔ وہ رسول اللہ کا نام لے لے کر انھیں پکار رہے تھے — یا محمد۔ یا محمد۔ رسول اللہ نے یہ آواز سن لی۔ جواب دیا۔ تو عباس نے ان سے پوچھا "کہاں گئے تھے"۔

رسول اللہ نے کہا: "میں بیت المقدس سے آیا ہوں"۔

عباس نے تعجب ظاہر کیا "ایک رات میں گئے اور لوٹ بھی آئے"۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: ہاں ایسا ہی ہوا ہے"۔

واقعہ معراج کی ایک بڑی راویہ جناب ام ہانی بنت ابی طالب فرماتی ہیں:

"رسول اللہ کو اسریٰ ہمارے گھر سے ہوا تھا اور اس رات عشا کی نماز پڑھ کر ہمارے ہاں ہی سو گئے تھے، فجر سے کچھ پہلے وہ اٹھے۔ جب نماز پڑھ چکے۔ کہا۔ اے ام ہانی—! میں نے تمہارے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔ جیسا کہ تو نے خود دیکھا تھا۔ پھر میں بیت المقدس گیا۔ میں نے وہاں نماز پڑھی۔ پھر اب تمہارے ساتھ صبح کی نماز پڑھی ہے"۔

مورخ القسطلانی کے نزدیک اسریٰ و معراج ایک ہی رات ہوا۔ اسریٰ آغاز تھا اور معراج منتہا۔ رسول اللہؐ عالم بیداری میں روح و جسم کے ساتھ مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ

تشریف لے گئے۔ پھر مسجد الاقصیٰ سے سات آسمانوں کی طرف پرواز فرمائی اور اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ خدا نے اس موقعہ پر رسول اللہ پر کچھ وحی کی۔ پانچ نمازیں فرض کیں۔ پھر رسول اللہ اسی رات لوٹ کر مکہ آ گئے اور یہ خبر عام کی، صدیقؓ اور مسلمانوں نے ان کی تصدیق کی اور کفار نے انھیں جھٹلایا۔"

ابن کثیر حضرت ابن عباس سے منقول کرتے ہیں: "معراج آنکھوں دیکھی رویا تھی۔ یہی مذہب پہلے اور بعد کے جمہور کا ہے، یہ سب کے سب اسی عقیدہ کے ہیں کہ رسول کو اسریٰ، بدن اور روح کے ساتھ ہوئی تھی۔"

سوار ہونے اور آسمان کی طرف صعود فرمانے کا سیاق یہی ظاہر کرتا ہے، اور اس لیے اللہ تعالےٰ نے فرمایا: پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ کی طرف لے گئی۔ جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے۔ تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں — قرآن کی یہ آیت اس بات کا ثبوت ہے کہ رسول اللہ کو معراج، بدن و روح کے ساتھ ہوئی تھی۔ کہ عبد، روح و جسم سے عبارت ہے، محض روح سے نہیں۔"

مختصر یہ کہ شب معراج میں آپؐ کی پہلی منزل بیت المقدس تھا۔ یہاں آپ نے مسجد اقصےٰ میں انبیاء سابقین کی امامت فرمائی اور "ثم عرج بی الی السماء" (پھر آسمان کی طرف صعود فرمایا۔)

شہر اسلام

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بیت المقدس کی ساری زندگی میں جس فاتح کے شہر میں داخل ہونے پر مفتوح باشندوں نے اس کے ورودِ مسعود کا جشن منایا۔ وہ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ تھے۔ انھوں نے بہت تھوڑا سا وقت ان کے پاس گزارا لیکن لوگوں نے جان لیا کہ جن شرائط پر صلح ہوئی ہے وہ اپنے عمل میں ان سے کہیں زیادہ فیاضی اور انسان دوستی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور اس قدر محتاط ہیں کہ اگر نادانستہ ان سے کوئی غلطی ہو بھی جائے تو اس کا فوراً ازالہ کر دیتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے بیت المقدس تشریف لے جانے کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ جنگ یرموک کے بعد حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح اور حضرت عمرو بن العاصؓ بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوئے۔

عمرو بن عاص جو بعد میں فاتح مصر کہلائے، اپنی سیاست اور ڈپلومیسی کے لیے بہت مشہور تھے۔ اور تاریخ میں انہیں "سیاس العرب" کہا جاتا ہے۔ بیت المقدس میں ان کے مقابلے پر رومیوں کا سب سے بڑا جرنیل ارطون تھا۔ جس کا شہرہ مدینہ تک جا پہنچا تھا، جب دونوں عظیم جرنیل آمنے سامنے ہوئے اور حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی تو آپ نے مسکرا کر فرمایا: "ہم نے عرب کے ارطون سے لڑا دیا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے۔"

حضرت عمروؓ بن عاص نے پہنچتے ہی بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ عیسائی قلعہ بند ہو کر لڑ رہے تھے۔ چند دنوں بعد حضرت ابو عبیدہؓ بھی اپنی مہمات شام سے فارغ ہو کر آ پہنچے، انہوں نے یروشلم کے بڑے بڑے سرداروں کو خط لکھے:

"صحت اور خوشی ان لوگوں کے لیے ہے، جو راہِ راست پر چلتے اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں۔ ہم تم سے یہ چاہتے ہیں کہ تم اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ۔ اور جب تم ایمان لاؤ گے، تو ہمیں حرام ہے کہ ہم تمہیں ماریں یا تمہارے بال بچوں کو ہاتھ لگائیں اور اگر تم ایمان نہیں لاتے تو ہم کو خراج دو اور ہماری حمایت میں رہنا اختیار کرو۔ اور جو یہ بھی نہ مانو گے تو میں تمہارے مقابلے میں ایسے لوگ لاؤں گا جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے کی آرزو رکھتے ہیں اور ہم بغیر فتح کیے یہاں سے نہیں ٹلیں گے۔"

بہت سے صلاح و مشورہ کے بعد پادری صفرونیوس (SOPHRONIOUS) نے صلح منظور کی اور کہا کہ یہ پاک مقام ہے۔ اس کو میں خلیفۃ المسلمین کے سوا اور کسی کے سپرد نہیں کروں گا اور عارضی صلح کے لیے معززینِ شہر کو سفید علم کے ہمراہ مسلمانوں کے پاس بھیجا اور صلح چاہی۔

ایک روایت ہے کہ جب تک حضرت عمرؓ خود بہ نفس نفیس چار ہزار سواروں کے ہمراہ بیت المقدس تشریف نہ لائے۔ فتح نہ ہوئی۔ دوسری روایت اس طرح ہے۔ کہ بیت المقدس کے لوگ قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہے اور محاصرہ کئی روز تک جاری رہا محصورین نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ جب شہر کی مقاومت شدید ہو گئی تو ابن عاصؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ میرا واسطہ سخت جان دشمن سے ہے فوج بہت کم ہے کمک بھجوائیے۔

حضرت عمرؓ بیت المقدس کے محاصرے کی طوالت سے پریشان تھے، طبری نے لکھا

ہے کہ بیت المقدس کے باشندے ابن عاص رضؓ کے لیے اور ابن عاص رضؓ ان کے لیے مصیبت بن گئے۔ خط مدینہ پہنچا تو آپ نے مسجد نبوی میں مسلمانوں سے مشورہ کے دوران میں خود کمک کے ہمراہ جانے کے ارادے کا اظہار کیا۔ حضرت عثمان رضؓ بن عفان نے آپ کی رائے سے اختلاف کیا۔ لیکن حضرت علی رضؓ نے تائید کی اور فرمایا:

"مسلمان سخت پریشان ہیں۔ انھوں نے موسم کی سختی، جنگ اور طویل مسافرت کی غیر معمولی مشقت برداشت کی ہے، بہتر ہے کہ آپ تشریف لے جائیں۔ انہیں تسلی ہوگی۔" حضرت عمر رضؓ نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ حضرت عثمان رضؓ کو اپنا نائب مقرر کر کے خود روانہ ہو گئے۔

اپنے وقت کا یہ طاقتور اور وسیع سلطنت کا حکمران خاکستری رنگ کی ایک اونٹنی پر سوار ہوا۔ اور مدینۃ الرسول سے قبلۂ اوّل کی طرف چل دیا۔ اونٹنی پر دو تھیلے لٹک رہے تھے۔ ایک میں ستو اور دوسرے میں کھجوریں تھیں۔ سامنے پانی کا مشکیزہ تھا اور ایک کشکول میں دیگر زادِ راہ۔

ہر روز صبح کے وقت آپ کشکول کھول کر سامنے رکھ لیتے اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے۔ بیت المقدس کے قریب ایک مقام جابیہ میں قیام فرمایا۔ ابو علبیدہ رضؓ اور خالد رضؓ بن ولید کو یہاں پہنچنے کا حکم مل چکا تھا۔ اور وہ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ بیت المقدس میں جب حضرت عمر رضؓ کے آنے کی خبر پہنچی تو ارطبون تھوڑی سی فوج لے کر مصر کی طرف کھسک گیا اور صفرونیوس نے جو اب اکیلا رہ گیا تھا، صلح کا پیغام بھیجا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس مقام پر مسلمانوں کے سپہ سالار اس عالم میں خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ سب سے آگے معاویہ رضؓ بن ابی سفیان رضؓ ان کے پیچھے ابو علبیدہ رضؓ آخر میں خالد بن ولید، رضی اللہ عنہم، ان کی پوشاکوں پر نگاہیں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ شان دار کپڑوں میں ملبوس تھے۔ حضرت عمر رضؓ یہ دیکھتے ہی تڑپ اٹھے۔ انتہائی غصہ میں زمین سے کنکریاں اٹھا کر ان کے سینوں پہ ماریں اور فرمایا:

"کتنی جلدی تم لوگوں نے اپنی وضع بدل لی ہے، اس لباس میں مجھ سے ملنے آئے ہو کیا تمہیں حیا نہیں آتی۔ کیا دو ہی برس میں تم اپنے آپ سے باہر ہو گئے ہو؟ اگر دو سو برس تمہاری یہ حالت رہی تو خدا تم کو بھول کر تمہاری حکومت اوروں کو دے دے گا۔"

فوج کے سرداروں نے اپنی لہراتی ہوئی عبائیں اٹھا کر وہ ہتھیار دکھائے، جو انھوں

نے جسم پر لگا رکھے تھے۔ اس پر حضرت عمرؓ کا غصہ قدرے کم ہوا۔ خود اُن کا لباس یہ تھا کہ
مدنے کا ایک ملبا کرتہ زیب تن تھا، جس پر کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ بعض مؤرخوں نے
لکھا ہے کہ گاڑھے کا کرتا تھا، جو ایک جانب سے پھٹ گیا تھا۔
تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ جب جابیہ پہنچے تو مقامی سردار جلومس کو بلایا۔
اپنا کرتہ اتار کر اسے دیا کہ اس کی مرمت کر کے اور اسے دھو کر لے آئے" اور کہا کہ جب
تک مجھے کوئی کپڑا دے دو۔ جلومس نے ایک ریشمی قمیض حاضر کی۔ فرمایا۔ یہ کیا ہے؟ عرض
کیا گیا، ریشم ہے۔ پوچھا، ریشم کیا ہوتا ہے؟ لوگوں نے بتایا تو فرمایا، اچھا ٹھیک ہے۔ اور
پہن لیا۔ اپنی قمیض دھل کر آئی تو اسے اتار دیا۔ اس پر جلومس نے کہا۔ آپ عرب کے شاہ ہیں
اپنے مفتوح ملک میں اونٹ پر سواری اور ایسا لباس اچھا نہیں۔ ترکی گھوڑا منگوا لیجیے اور
سفید لباس پہنئے۔ رومیوں کی نگاہ میں آپ کی عظمت بڑھے گی۔ ناراض ہو کر فرمایا۔ خدا نے
ہمیں اسلام کی وجہ سے جو عزت دی ہے اس کے سوا ہمیں کچھ نہیں چاہیئے۔ البتہ تھکی ہوئی
اونٹنی کا خیال کر کے گھوڑے کی سواری پر راضی ہو گئے، لیکن جب شاندار ترکی گھوڑا
اٹھلاتی ہوئی چال چلنے لگا تو فرمایا:۔

"روکو! روکو! میں نے اس سے پہلے کسی کو شیطان پر سوار ہوتے نہیں دیکھا۔"

ایک روایت میں ہے کہ مقامی سردار جلومس کے علاوہ خود مسلمانوں کی بھی خواہش
تھی۔ کہ آپ سفید کپڑے پہنیں اور ترکی گھوڑے پر سوار ہوں۔ سب نے مل کر آپ کو دونوں
باتوں پر آمادہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے اصرار پر سفید کپڑے زیب تن کیے، کندھے
پر وہ خوبصورت رومال ڈال لیا۔ جو ابن عاصؓ نے آپ کے لیے بھیجا تھا۔ ترکی گھوڑے پر
بڑی شان سے سوار ہوئے۔ مسلمان عسکری، جو اپنے خلیفہ اور سالارِ اعظم سے عشق کرتے
تھے، بہت خوش ہوئے۔ لیکن جب گھوڑے پر سوار ہوئے تو فوراً اتر آئے اور مسلمانوں
سے کہا" میری لغزش کو درگزر کرنا، اللہ قیامت کے روز تمہاری لغزش سے درگزر کرے گا۔
اس نخوت اور کبر و غرور نے اس وقت میرے دل میں راہ پائی۔۔ شاید تمہارے امیر کو
ہلاک کر دیتا۔" یہ فرما کر پھر اپنے پرانے کپڑے پہن لیے۔
ابن کثیر نے فلسطین کے سفر کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کا پیشانی
سے اُوپر کا حصہ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ سر پر ٹوپی تھی نہ عمامہ۔ دونوں پاؤں رکاب کے

بغیر اونٹنی کے کجاوے سے لٹک رہے تھے، اونٹنی کی پیٹھ پر ایک پرانا کمبل تھا۔ جو رات کو بستر کا کام دیتا۔ خرجی چیتے کی کھال سے بنی تھی۔ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ رات کو آپ اسے تکیہ بنا لیتے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کو خط لکھا تھا کہ بیت المقدس کی فتح آپ کی آمد پر منحصر ہے، چنانچہ آپ ایک اونٹنی پر اپنے خادم کے ساتھ روانہ ہوئے ایک منزل آپ سوار ہوتے اور خادم پیدل چلتا، دوسری منزل خادم اونٹنی پر ہوتا اور آپ آگے آگے چلتے، چنانچہ جب آپ جابیہ پہنچے تو آپ کا خادم سوار تھا اور اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھ میں تھی اور کتاب مقدس کا یہ فرمان پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا کہ "وہ اپنے غلام کے اونٹ کی مہار تھامے ہوئے شہر میں داخل ہوگا"

بہرحال حضرت عمرؓ کا خلیفۂ وقت کی حیثیت سے یہ پہلا اور آخری سفر بڑا سادہ لیکن پُروقار تھا۔ وہ اپنے مفتوحہ علاقوں سے گزر رہے تھے اور جگہ جگہ لوگوں کے سامنے اسلامی تعلیمات واضح کرتے جاتے تھے۔ رعایا کے حالات کا مشاہدہ بھی جاری تھا، تاریخ نے بڑے بڑے باجبروت شاہنشاہوں کے سفروں کو بھلا دیا، جن پر جشن کا گمان گزرتا تھا، لیکن اس سفر کی جزئیات تک تاریخ کا سرمایہ بن کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئیں۔

روایت ہے کہ معاہدۂ صلح پر دمشق میں دستخط ہو گئے اور اس کے بعد آپ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ ایک مؤرخ کے مطابق صلحنامہ جابیہ میں طے پایا۔ ایک اور بیان کے مطابق معاہدہ صلح کی تکمیل بیت المقدس میں ہوئی اور وہ اس طرح کہ صفرونیوس نے اپنے سفیر کی امان چاہی، جب آپ نے امان دے دی تو سفیر بلا روک ٹوک آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ہم سے صلح کر لی جائے اور خراج لے کر باجگزار بنا لیا جائے کوئی بھی روایت صحیح ہو، یہ حقیقت ہے کہ صلح ہوئی اور حضرت عمرؓ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ اس وقت حدود شہر بیت المقدس میں بارہ ہزار یونانی اور پچاس ہزار اصل باشندے موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے اصرار کیا کہ کل یونانی تین دن کے اندر شہر سے نکل جائیں۔ اور شہر کے اصلی باشندے خراج ادا کریں۔ چنانچہ ۵ دینار امراء پر، چار دینار متوسط الحال پر اور تین دینار ادنیٰ درجہ کے لوگوں پر فی کس سالانہ کے حساب سے یہ ٹیکس لگایا گیا۔

بوڑھے، بچے اور عورتیں ٹیکس سے مستثنیٰ کیے گئے

ممتاز باشندگانِ شہر اور مسلمانوں کے مابین فتح بیت المقدس کے بعد جو عہد نامہ تحریر پایا۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"یہ ایک تحریر اقرار ہے منجانب عیسائی باشندگانِ بیت المقدس جو مرتب کی گئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب خلیفۃ المسلمین کے نام۔

جب آپ ہم پر غالب آئے، ہم نے آپ کی اطاعت منظور کی اور ہم نے اپنے تئیں اپنے بچوں اپنے ہم مذہبوں اور اپنے مقبوضات کو آپ کے حوالے کر دیا اور عہد کیا کہ چھوٹے بڑے گرجوں، خانقاہوں اور راہبوں کے حجروں میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہوگی نہ ان میں سکونت اختیار کی جائے گی نہ یہ ڈھائے جائیں گے۔ ان میں کوئی ایسا شخص، جو مسلمانوں کا مخالف ہو، رہ نہ سکے گا۔ ان میں مسلمان ہر وقت داخل ہو سکیں گے، مسافروں اور سیاحوں کے لیے ان کے دروازے کھلے رہیں گے۔ اگر کوئی مسلمان مسافر ان میں رہنا چاہے گا تو اسے تین دن بطور مہمان کے کھانا اور جگہ دیں گے۔ اسے اپنے گرجاؤں میں کسی راز کے معلوم کرنے سے نہیں روکیں گے اور اس سے کوئی بات پوشیدہ نہ رکھیں گے۔ اسے اپنی کسی عبادت میں شریک نہیں کریں گے۔ کسی کو عیسائی مذہب کی دعوت نہیں دیں گے، نہ کسی طرح کا جبر کریں گے۔ اپنے کسی ہم مذہب کو اسلام قبول کرنے سے نہ روکیں گے مسلمانوں کی ہر جگہ تعظیم کریں گے۔ لباس، پٹکے، صافے، زیور یا سر کی مانگ میں مسلمانوں سے مشابہت نہیں کریں گے، ان کی زبان میں کچھ نہیں لکھیں گے نہ اپنے آپ کو ان کے خطابوں سے پکاریں گے۔ سواری میں گھوڑوں پر زین نہیں کسیں گے۔ اپنی تلواروں کو پیٹیوں کے سامنے نہیں لٹکائیں گے۔ تیر کمان، تلوار یا لٹھ لے کر نہیں نکلیں گے۔ اپنی انگوٹھی پر عربی رسم الخط میں کچھ نہیں کھدوائیں گے، شراب نہیں بیچیں گے، اپنی پیشانیاں منڈوائیں گے، اور ان پر کپڑا باندھیں گے، کمر میں زیادہ چوڑا پٹکا استعمال نہیں کریں گے۔ اپنی عبادت گاہوں کے باہر صلیب نہیں لگائیں گے۔ شارع عام یا مسلمانوں کے راستوں میں یا ان کی کاروباری جگہوں میں اپنی صلیبوں کو نہیں دکھائیں گے۔ گھنٹے زور سے نہیں بجائیں گے۔

اپنے مُردوں پر نوحہ نہیں کریں گے، مسلمانوں کی گزرگاہوں یا شارعِ عام میں چراغاں یا اسی قسم کی آراستگی وغیرہ نہیں کریں گے، اپنی میّتوں کو مسلمانوں کے قریب نہیں لے جائیں گے، غلام جو مسلمان ہو جائے گا اسے پھر اپنے پاس نہیں رکھیں گے نہ اس کے گھر کی طرف نگاہ کریں گے۔ اور ایلیاؔ (بیت المقدس) میں ہمارے ساتھ یہودی نہیں رہنے پائیں گے۔"

حضرت عمرؓ نے اس معاہدہ کی تصدیق کرتے وقت حسب ذیل اضافہ فرمایا:۔

"ہم مسلمانوں میں سے کسی کو اذیت نہیں دیں گے۔ یہ ہم اپنی طرف سے اور اپنے ہم مذہبوں کی جانب سے عہد و پیمان کرتے ہیں کہ ہم مذکورہ بالا شرائط کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور ہم ان میں سے کسی کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ اگر کریں تو ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہ کی جائے اور ہم اختیار دیتے ہیں کہ جو سخت سے سخت سزا دیں، ہم اس کے سزاوار ہوں گے" ــــ اور اس کے بعد اپنی طرف سے لکھا:

"اور جو کچھ اس میں تحریر ہے اس پر خدا کا، رسولِ خدا کا، خلفاء کا اور مسلمانوں کا ذمہ ہے بشرطیکہ یہ لوگ مقررہ جزیہ ادا کرتے رہیں۔"

اس تحریر پر حضرت عمرؓ نے مہر لگائی۔ خالدؓ بن ولید، عمروؓ بن العاص، عبدؓالرحمٰن بن عوف اور معاویہؓ بن ابی سفیان نے دستخط کیے۔ اور یہ معاہدہ ۱۵ھ (۶۳۶ء) میں لکھا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے۔ کہ بیت المقدس والوں کو اس صلحنامہ کی اطلاع ہوئی تو وہ حیران ہوئے اور انہوں نے خوشی سے جشن منایا، چنانچہ آپؓ شہر میں داخل ہوئے اور پادریوں اور عوام سے بے حد شفقت کا سلوک کیا۔

حضرت عمرؓ کے سامنے بیت المقدس کا عظیم شہر تھا، مسلمانوں کا پہلا قبلہ، عیسائیوں کے لیے حضرت عیسٰیؑ کی جائے ولادت، یہودیوں کے لیے ارضِ معاد "موعود"، انبیاء و رُسل کا شہر، حضرت موسیٰ کلیم اللہ یہودیوں کو مصر سے نکال کر یہیں لائے تھے، حضرت عیسٰیؑ کو صلیب دینے کا واقعہ یہیں پیش آیا، جس کی بنا پر کلیسائے قیامت تعمیر کیا گیا۔ محراب داؤدؑ، صخرۂ یعقوبؑ، دیوارِ گریہ، ہیکل سلیمانی ــــ الغرض اس شہر کے در و دیوار پر روحانیت کی تاریخ نقش تھی۔ معراج پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں سے تشریف لے گئے تھے۔ اور یہیں آپؐ کی امامت

میں جلیل القدر پیغمبروں نے نماز پڑھی۔ رسُولِ خدا کے بعد حضرت عمرؓ وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے یہاں نماز کی امامت کرائی۔

صبح کے وقت پادری صفرونیوس، حضرت عمرؓ کو شہر کی سیر کرانے لے گئے، اس پادری نے بڑے جذب وشوق اور عقیدت کے ساتھ مسلمانوں کے خلیفہ کو شہر کے آثار سے روشناس کرایا۔ سیر کے دَوران میں جب نماز کا وقت آیا تو آپ کلیسائے قیامہ میں تھے، پادری نے کہا۔ یہ بھی ایک سجدہ گاہِ خداوندی ہے، آپ یہاں نماز پڑھ لیں۔ لیکن آپ نے فرمایا "اگر میں نے یہاں نماز پڑھ لی تو مسلمان بھی ایسا ہی کریں گے اور عیسائیوں کو گرجوں سے نکال دیں گے"

آپ آگے بڑھے تو کلیسائے قیامہ کے دروازے پر عیسائیوں نے نماز کے لیے چادر بچھادی، ایک روایت ہے کہ آپ نے یہاں نماز پڑھ لی لیکن فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہُوا اور اسی وقت یہ فرمان لکھ کر پادری کے حوالے کیا۔ کہ "مسلمان کبھی گرجوں کی دہلیز پر نماز نہ پڑھ سکیں گے" اور اسی انصاف پروری کے اعتراف میں کلیسا کے بالکل سامنے مسجدِ فاروقی اس کی یادگار ہے۔ جسے عیسائیوں نے تعمیر کرایا تھا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ اس مقدس شہر میں داخل ہوئے تو ان کا سب سے بڑا مقصد اس متبرک مقام کی دریافت تھی، جسے الصخرہ کہا جاتا ہے۔ جہاں سے حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم براق پر سوار ہو کر معراج کی شب آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے راہب صفرونیوس سے فرمایا۔ کہ وہ ان کی رہبری کرے اور وہ مقدس جگہ دکھائے۔ راہب سب سے پہلے آپ کو کلیسائے نشور میں لے گیا اور کہا کہ یہی حضرت داؤدؑ کی مسجد ہے، آپ نے فرمایا۔ کہ "تو جھوٹ بولتا ہے۔ کیونکہ خدا کے رسول حضرت محمّدؐ نے مجھے جو جگہ بتائی۔ یہ اس کے مشابہ نہیں"۔ پھر وہ کلیسائے صیہون میں لے گیا اور کہا کہ یہ حضرت داؤدؑ کی مسجد ہے۔ آپ نے پھر فرمایا "تو جھوٹ بولتا ہے" اس طرح راہب آپ کو ہر گرجا میں لے گیا۔ آپ نے ہر بار یہی فرمایا کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ آخر کار راہب آپ کو اس دروازے سے لے گیا۔ جس کا نام اب باب المحمد ہے۔ سیڑھیوں پر سے کوڑا کرکٹ صاف کرنے کے بعد وہ ایک تنگ راستے میں داخل ہوئے۔ جہاں حضرت عمرؓ گھٹنوں کے بل چل کر وسطی بدرو کے پاس آئے اور کھڑے ہوئے۔ الصخرہ کی جانب نگاہ اٹھائی۔ فرمایا "قسم ہے اس خدا کے

بزرگ و برتر کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہی وہ جگہ ہے، جو اللہ کے رسول نے مجھے بتائی تھی" اس کے بعد آپ نے اس پر ایک مسجد تعمیر کئے جانے کا حکم دیا۔ جسے ۶۹ ھ میں عبدالملک نے از سرِ نو تعمیر کرایا۔ اور یہی مسجد الاقصٰے کہلائی۔

حضرت عمرؓ نے کئی دن بیت المقدس میں قیام کیا۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت بلالؓ سے اذان دینے کے لیے فرمایا۔ انہوں نے معذرت کی "میں عزم کر چکا ہوں کہ رسول اللہؐ کے بعد کسی کے لیے اذان نہ دوں گا۔ لیکن آج اور صرف آج آپ کا ارشاد بجا لاؤں گا۔" اذان دینی شروع کی، تو تمام صحابہ کو رسولؐ اللہ کا عہدِ مبارک یاد آ گیا۔ اور سب پر رقت طاری ہو گئی۔ حضرت عمرؓ کی ہچکی بندھ گئی، اور دیر تک سب پر ایک خاص کیفیت طاری رہی۔

خلافتِ راشدہ کے بعد

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب مسجدِ عمرؓ کی بنیاد رکھی تو فرمایا تھا کہ حضرت موسیٰؑ حضرت سلیمانؑ اور دوسرے انبیائے بنی اسرائیل، نیز حضرت عیسٰیؑ کے ہم مسلمان ہی صحیح وارث ہیں۔ اور وہ اس لیے کہ ہم ان سب کو مانتے ہیں اور بحیثیتِ انبیاء ان میں کوئی تفریق روا نہیں رکھتے۔ اور بلاشبہ مسلمانوں نے اسے بین المذاہب شہر کا درجہ دے دیا اور عیسائی اُن کے پہلو بہ پہلو اس شہر میں مقیم رہے۔

اس فتحِ عظیم کے بعد یہ شہر صدیوں تک مسلمان سلطنت کا حصہ بنا رہا۔ اس کے باوجود کہ القدس اپنی ولایت کا دارالحکومت کبھی نہیں رہا، اور یہ مرتبہ رَملہ کو حاصل تھا۔ مسجدِ اقصٰے اور قبۃ الصخرہ کی وجہ سے حجاز کے حرمین شریفین کے بعد مومنین صالحین کی نظر میں یہی سب سے مقدس بستی ہے۔ چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے مدینہ میں خلافت قائم کر لی۔ اور سارا حجاز ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا تو اموی خلیفہ عبدالملک نے اس رشک کی بنا پر کہ عبداللہ بن زبیرؓ کو حرمین شریفین کی تولیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے ان کی عزت و عظمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیت المقدس میں حرمِ سوئم ــــ قبلۂ اوّل پر توجہ دی اور مسجدِ اقصٰے کو شایانِ شان طریق سے تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا، اس کے تعمیراتی کاموں اور ذوق شوق کا ذکر تو مسجدِ اقصٰے کے باب میں آئے گا۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس نے مسجدِ عمرؓ کی تعمیر و تزئین کا کام سات سال میں مکمل کرایا۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس سے قبل بھی جندِ فلسطین کے وہ لوگ جو ایامِ حج میں اپنی بے بضاعتی کی بنا پر مکہ و مدینہ نہیں جاسکتے تھے۔ ان دنوں بیت المقدس میں جمع ہوتے اور قبلۂ اولیٰ کی زیارت کو باعثِ عزت و تکریم جانتے تھے لیکن عبدالملک کے دور میں اس شہر کی عظمت و وقار میں مزید اضافہ ہوا اور وہ لوگ جو عبداللہ بن زبیرؓ اور خلیفہ عبدالملک کی باہمی جنگوں کے خوف سے حرمین شریفین کے حج کو نہ جاسکتے اسی طرف کا رُخ کرنے لگے۔

گو تاریخ نے ان برکات کا شمار نہیں کیا، جو اس شہر پہ نازل ہوتی رہیں اور نہ ہی ان عظمتوں کو سمیٹا ہے، جو اسلامی دور میں اسے حاصل ہوئیں۔ البتہ اتنا ضرور بتایا ہے کہ اسلامی دور میں بیت المقدس، امن و امان اور علم و عرفان کا گہوارہ تھا۔ اور جب خلافت امیہ کا آفتاب رُو بہ زوال ہو کر ڈوب گیا اور اس کی جگہ عباسی خلفاء نے لی۔ تو بیت المقدس بھی اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ عباسی خلفاء کی حاکمیت میں چلا گیا۔ عباسی خلفاء نے اس کی انتظامی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ یہ بدستور جندِ فلسطین میں شامل رہا۔ خلیفۃ المہدی اور خلیفہ المامون نے اس شہر کی زیارت کے لیے سفر کیا۔ مورخین اس پہ متفق ہیں کہ بیت المقدس پہ مسلمانوں کے تصرف کو عیسائی کبھی برداشت نہ کر سکے، بلکہ وہ ہمیشہ تلملاتے رہے اور اسی تلملاہٹ میں ایشیائے کوچک (روم) کی عیسائی سلطنت کے حکمرانوں نے بار بار اسلامی سرحدوں پہ حملے کئے۔ لیکن انہیں ہر بار منہ کی کھانی پڑی۔ عہدِ ہارون رشید میں جب نقفور نے ملکہ قسطنطنیہ ایرینی کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ تو اس نے خلیفہ ہارون کو جنگ کا چیلنج دیتے ہوئے نہایت گستاخانہ خط دربارِ خلافت میں لکھا جس کا جواب ہارون نے ان الفاظ میں دیا کہ :

"اس کا جواب وہ ہے جو تو آنکھوں سے دیکھے گا نہ کہ کانوں سے سنے گا"

اور بلاشبہ ہارون نے نقفور کو شکست دے کر باجگزار بنا لیا۔ اسلامی سلطنت کی اسی عظمت و سطوت سے متاثر ہو کر مغربی رومی ممالک کے سربراہ شارلیمان شاہ فرانس نے ہارون کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور سفارت بھیجی۔ ہارون نے دورانِ جنگ بھی قدس میں عیسائی زائرین کی آمد پہ کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ یہ سفراء بھی قدس گئے، اور انہوں نے وہاں خیرات بانٹی۔ ان کی واپسی پر خلیفہ نے ان کے ہاتھ شاہِ فرانس شارلیمان کو مزارِ مقدس (HOLY SEPULCHER) اور کیلوری کی چابیاں ——— بھیجیں۔ یہ ۸۰۰ء

کا واقعہ ہے۔

خلیفہ ماموں کے عہد میں رومی فوجوں نے ایک بار پھر اسلامی سرحدوں پر یلغار کر دی اور طرسوس اور مصیصہ پر قبضہ کر کے ۶۶۰۰ مسلمانوں کو شہید کر ڈالا۔ خلیفہ ماموں لشکر جرار کے ساتھ بڑھا اور رومیوں کو زبردست شکست دی۔ پھر ان کے تعاقب کا حکم اپنے بھائی معتصم کو دے کر خود بغداد لوٹ گیا۔

خلیفہ معتصم کے عہد میں ابو حرب برقع یمانی نے بغاوت کر کے جند فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس کی بغاوت کو رجا بن ایوب نے جلد ہی فرو کر دیا۔ ابو حرب کی بغاوت کا قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک ترکی سپاہی نے اس کے گھر میں ٹھہرنا چاہا۔ وہ اس وقت موجود نہ تھا۔ اس کی بیوی نے سپاہی کو اندر آنے سے روکا۔ اس نے اس عورت کو کوڑا مارا۔ جب ابو حرب گھر آیا تو بیوی نے اس سے کیفیت بیان کی۔ اور کوڑے کی مار کا نشان دکھایا۔ وہ اشتعال میں تلوار لے کر اس سپاہی کی طرف بڑھا اور اس کو قتل کر کے رُوپوش ہو گیا۔ پھر ایک عرصہ بعد ایک لشکر کے ساتھ ظاہر ہوا اور فلسطین پر قبضہ کر لیا۔

خلیفہ معتصم کے دور ہی میں قیصر روم توفیل نے اسلامی سرحدوں پر حملہ کیا اور زبطرہ پہنچ کر آگ لگا دی۔ اور ایک ہزار عورتوں کو گرفتار کر کے لے گیا۔ خلیفہ معتصم کو جب یہ خبر ملی تو وہ کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت نفیر عام کا حکم دیا اور ایک عظیم لشکر کے ساتھ روم پر حملہ آور ہوا۔ اور توفیل کے پیدائشی شہر عموریہ تک جا پہنچا۔ اور سخت جدال و قتال کیا۔ اس فتح کی خوشی میں معتصم نے واپسی پر سامرا میں جشن منایا۔

رومی خلیفہ معتصم کے بعد بھی اسلامی سرحدوں پر یلغار کرتے رہے۔ لیکن انھیں کبھی کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ معتصم کے جانشین موفق کے ساتھ ہی سلطنت عباسیہ روبہ زوال ہو گئی۔ چنانچہ خلیفہ معتمد کے عہد میں ہرات سے لے کر فارس تک صفاریہ، اور ماوراء النہر سے فارس تک بنی سامان خود مختار ہو گئے۔ اور مصر میں ۲۶۴ھ / ۸۶۸ء کو احمد بن طولون نے خود مختاری کا اعلان کر کے فلسطین کو بھی اپنے دائرہ حکومت میں شامل کر لیا۔ اور اس طرح بیت المقدس طولونیہ خاندان کی سلطنت کا حصہ بنا۔ احمد ابن طولون نے نہ صرف رومی حملوں کو رد کیا بلکہ ان کے ملک میں داخل ہو کر عیسائی شہروں کو تاخت و تاراج کیا۔ طولونیہ خاندان کو خلیفہ معتضد کے دور میں بڑا اقتدار حاصل ہوا۔ رومی خمارویہ بن احمد بن طولون کے ڈر سے اسلامی سرحد میں قدم نہ

رکھتے تھے۔ خلیفہ المکتفی کے دور میں خلافتِ عباسیہ کی روح بالکل ختم ہو گئی۔ اور امراء امت کی مصلحتوں سے بے خبر ہو کر ذاتی اغراض کے لیے لڑنے لگے۔ اُدھر شیبان بن احمد بن طولون کی موت کے ساتھ ہی دولتِ طولونیہ کمزور ہو گئی۔ اور اس کی جگہ دولتِ اخشیدیہ نے لی۔ جس نے بیت المقدس کو اپنے دائرۂ اختیار میں شامل کر لیا۔ خلیفہ مقتدر کے عہد میں رومیوں نے اسلامی سرحد کے مسلمانوں پر ظلم و تشدد ڈھانے شروع کر دیئے۔ لیکن خلیفہ کے غلام ثمل نے انہیں پسپا کر دیا اور آنگورہ و عموریہ تک پہنچ کر ان کو مارا۔

الراضی کے بعد خلافتِ عباسیہ کا رہا سہا وقار بھی ختم ہو گیا۔ ۳۵۸ھ میں مصر کی اخشیدی امارت کی جگہ فاطمیوں نے لے لی۔ خلیفہ مطیع (۳۳۴ھ تا ۳۶۳ھ) کے عہد میں اسلامی سرحدوں پر رومیوں کے حملوں میں زبردست اضافہ ہوا۔ اور رومیوں نے اسلامی علاقوں کے اندر گھس گھس کر مسلمانوں کو تہ تیغ کیا، مسجدیں جلا ڈالیں۔ عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا۔ مسلمان وزراء اور اُمراء یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے لیکن ان کا ضمیر مردہ اور غیرت خفتہ تھی۔ وہ ذاتی اغراض کے لیے باہمدگر برسرِ پیکار تھے۔ دشمن کی مدافعت کی طرف کوئی توجہ نہ کرتا تھا۔ بلکہ جب امام ابوبکر محمد بن اسمٰعیل بن قفال مروزی شافعی نے بیس ہزار مجاہدین کی جمعیت کے ساتھ رومیوں کا مقابلہ کرنا چاہا تو رکن الدولہ دیلمی نے ازراہِ عداوت انہیں آگے نہ بڑھنے دیا۔ اسی دوران میں (۹۷۰ء) فاطمی خلیفہ معز نے اخشیدیہ حکمران کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک بیت المقدس فاطمیوں کے قبضہ میں رہا۔ لیکن ۴۱۴ھ میں تین عرب رؤسا نے فاطمیوں کو شام سے نکال باہر کیا اور رام اللہ سے مصر تک حسان، امیرا اور بنی طے حکمران ہوئے۔ لیکن دوسرے ہی سال فاطمی پھر قابض ہو گئے۔ عرب اُمراء کے باہمی مناقشات اور عیسائی حملہ آوروں کے ظلم و تشدد کے باوجود بیت المقدس عیسائی زائرین کے لیے کھلا رہا، چنانچہ ۱۰۳۵ء میں رابرٹ شاہ نارمنڈی (فرانس)، ۱۰۵۴ء میں کیمبرائے فرانس کے شاہ للیتھبرٹ، ۱۰۶۵ء میں جرمنی کے بشپوں نے قدس کا حج کیا۔ اور عیسائی ان مراعات اور حکمران طبقہ کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے کہ اسی دور میں آل سلجوق نے زور پکڑا اور رومیوں کی خون ریزی کا بدلہ چکانے کے لیے ملک شاہ سلجوقی نے پہلے تو بیت المقدس کے دفاعی استحکامات مضبوط کیے۔ یہ ۴۶۷ھ بمطابق ۱۰۷۷ء کا واقعہ ہے۔ پھر انطاکیہ سے قسطنطنیہ تک رومیوں کو پسپا کرتا چلا گیا! ان کے

ملک میں مختلف مقامات پر تقریباً پچاس منبر قائم کئے۔ آخر قیصر روم نے ایک ہزار دینار سالانہ جزیہ پر صلح کی۔ ان تمام فتوحات میں دو ماہ سے زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ بلکہ شاہ کے عہد میں ہی بیت المقدس کی شان و شوکت بحال ہو گئی۔ لیکن ۹۴۰ء میں ترکمان سردار رائق بغاوت کر کے فلسطین پر قابض ہو گیا اور بیت المقدس بھی اس کے زیر اقتدار آگیا۔ مگر رائق کی بغاوت چند ہفتوں بعد دبا دی گئی۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ عباسی امراء کے اس باہمی مناقشات نے بیت المقدس کی شہری اور تمدنی زندگی پر کوئی ناخوش گوار اثر نہیں ڈالا۔ اصطخری اور ابن حوقل (دسویں صدی عیسوی) نے لکھا ہے کہ یہ جگہ سارے فلسطین میں سب سے زیادہ سرسبز ہے 'مقدسی' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' اسی شہر کا باشندہ تھا۔ اس نے فاطمی خلیفہ العزیز کے عہد ۹۸۵ء میں بیت المقدس کے حالات قلم بند کئے ہیں' وہ لکھتا ہے:

"بیت المقدس' الٰیا' اور البلاط کے نام سے بھی مشہور ہے' ولایات میں اس سے بڑا شہر کوئی نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض دارالملک بھی اس سے چھوٹے ہیں۔ یہاں گرمی یا سردی کی شدت نہیں ہوتی اور برف شاذو نادر ہی گرتی ہے۔ قاضی حرمین شریفین (مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ) کے فرزند قاضی ابوالقاسم نے مجھ سے ایک مرتبہ بیت المقدس کی آب و ہوا کا حال دریافت کیا میں نے جواب دیا۔

"وہ بَیْن بَیْن ہے' یعنی نہ بہت گرم نہ بہت سرد"۔ اس نے کہا "هٰذِہٖ صِفَةُ الْجَنَّةِ" بیت المقدس کی عمارتیں پتھر کی ہیں' اور اتنی مضبوط عمارات کہیں دیکھنے میں نہ آئیں گی۔ ایسے پاک و عفیف لوگ بھی آپ کو کہیں نہ ملیں گے۔ جیسے بیت المقدس کے ہوتے ہیں۔ یہاں اجناس خوردنی بہت عمدہ ہوتی ہیں' منڈیاں پاک صاف رہتی ہیں۔ یہاں کی مسجد سب سے بڑی ہے۔ اور اس سے زیادہ تعداد میں مقدس مقامات کہیں نہیں۔ انگور کی کثرت ہے اور بیت المقدس کی مثل یہ کہیں نہیں ہوتا۔ بیت المقدس میں حاذق اطبا اور حکماء کا اجتماع ہے' اس لیے ہر شخص اس کی طرف کھنچتا ہے۔ سال کے کسی زمانے میں بھی اس کے کوچہ و بازار پردیسیوں سے خالی نہیں رہتے۔ اس کے سب شہروں میں ممتاز و بہتر ہونے کی یہی دلیل کافی ہے' کہ اس شہر میں دنیا و آخرت کی خوبیاں جمع ہیں۔ ابنائے دنیا' جو آخرت کے بھی مشتاق ہیں' اس شہر میں اپنی اجناس کی منڈی پائیں گے۔ اور اسی طرح ارباب آخرت جنہیں اس دنیا کی

نعمت بھی مطلوب ہے ان کو دونوں باتیں یہاں میسر آئیں گی۔ رہا اس مقدس شہر کا اللہ کی نعمتوں سے سب شہروں میں زیادہ بہرہ ور ہونا، تو حق یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے اس شہر میں پست و بلند، میدان و کوہستان، غرض ہر طرح کی زمین کے اور بالکل متضاد قسم کے میوے جمع کر دیئے ہیں۔ مثلاً نارنگی اور بادام، کھجور اور جوز، انجیر اور موز وغیرہا، اس کے علاوہ دودھ، شہد اور شکر کی افراط ہے۔"

"بیت المقدس میں کوئی خرابی نہیں، شراب عام طور پر نہیں پی جاتی۔ نہ بدمستی و بدہوشی نظر آتی ہے۔ شہر میں خفیہ یا اعلانیہ قحبہ خانے نہیں ہیں۔ لوگ اپنے تقویٰ اور خلوص میں امتیاز رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب خبر ہوئی کہ والیٔ شہر نے شراب پی ہے تو لوگوں نے اس کے گھر کے گرد دیوار بنا دی کہ لوگ اس کی دعوتوں میں نہ جانے پائیں۔"

لیکن مقدسی شہر میں یہود و نصاریٰ کے غلبہ کی شکایت بھی کرتا ہے، اور لکھتا ہے کہ وہ "عام مقامات پر بیہودگیاں کرتے ہیں۔"

آگے چل کر مقدسی حوالیٔ شہر کی نسبت لکھتا ہے کہ "بیت المقدس کے گرد چالیس میل کے نصف قطر میں جتنا علاقہ ہے، وہ سب اس شہر کی حدود میں داخل ہے اور اس میں بہت سے گاؤں ہیں۔"

پھر لکھتا ہے "یہ زمین ہے، جسے اللہ تعالےٰ نے بابرکت بنایا ہے، یہاں کی پہاڑیوں پر، نیز میدانوں میں درختوں کی کثرت ہے، کسی آب رسانی یا نہری پانی کی ضرورت نہیں۔ گرمیوں میں جس وقت جنوبی ہوا چلتی ہے تو ہر شب کو اس شدت سے اوس پڑتی ہے کہ مسجدِ اقصےٰ کی موریوں میں پانی آجاتا ہے۔" مقدسی کے اس بیان کی تصدیق کننگ ہیم گے "ارض مقدس اور بائیبل" میں کرتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ "فلسطین میں صاف و روشن مطلع دن کی گرمی کو بہت جلد فضا میں منتشر کر دیتا ہے، جس کے باعث وہاں کی راتیں اتنی ہی سرد ہوتی ہیں جتنے کہ دن گرم ہوتے ہیں۔ ہوائے شب کی یہی برودت آب رسانی کا وہ کام کرتی ہے جس کے بغیر نباتات کی زندگی ناممکن ہے۔ ہواؤں کی تمام رطوبت ملک پر سے گزرتے وقت یہیں چھن جاتی ہے۔ اور فضا کی برودت اسے قطراتِ آب کی شکل میں بدل دیتی ہے جو کہ کا بارانِ رحمت بن کر ہر سوکھے پتے تک نمی پہنچاتے ہیں۔"

مقدسی کے بعد ایرانی سیاح ناصر خسرو ۵ مارچ ۱۰۴۷ء کو بیت المقدس میں وارد ہوا

وہ لکھتا ہے:۔

شام اور نواحی ملک کے باشندے بیت المقدس کو "القدس" کہتے ہیں اور اگر ان ولایات کے رہنے والے حج بیت اللہ کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو انہی مقررہ ایام میں بیت المقدس آتے اور شعائر مذہبی بجا لاتے ہیں۔ اسی جگہ حج کے دن قربانی کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض سنین میں ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں یہاں بیس ہزار تک اشخاص جمع ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ختنہ کی رسم ادا کرنے کے لیے وہ اپنے بچوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ نیز یونانیوں کے علاقے اور دوسرے ملکوں سے یہود و نصاریٰ بھی بڑی تعداد میں یروشلم آتے ہیں۔"

ناصر خسرو مزید لکھتا ہے: "بیت المقدس کے گرد کی اراضی اور مواضع پہاڑی ڈھلوانوں پر واقع ہیں۔ زمین اچھی مزروعہ ہے۔ گیہوں، زیتون اور انجیر کی کاشت ہوتی ہے اور بھی بہت قسم کے درخت پائے جاتے ہیں۔ آس پاس کوئی چشمہ نہیں جس سے آبپاشی کی جائے۔ مگر اس پر بھی پیداوار بہت زیادہ اور نرخ معتدل ہیں۔ اکثر ممتاز اشخاص کی زمینوں میں تعداد کثیر میں یعنی پچاس ہزار من (یعنی ساڑھے سولہ ہزار گیلن) روغن زیتون نکل آتا ہے۔۔

۔۔۔ لوگوں کا قول ہے کہ یروشلم میں قحط کبھی نہیں پڑتا۔۔۔۔۔"

"یروشلم بڑا شہر ہے اور میری سیاحت کے زمانے میں یہاں مردوں کا شمار بیس ہزار ہے۔"

بعض یورپی مؤرخین کا بیان ہے کہ ۹۸۶ء میں پوپ سلوسٹر بیت المقدس کی زیارت کو آیا۔ تو اس نے واپس جا کر شہر مقدس کے عیسائیوں پر ظلم و ستم کی فرضی داستانیں بیان کیں۔ جس کے نتیجے میں فرانس و اٹلی کے اسلحہ بند گروہ زیارت کے بہانے آتے۔ اور سواحل شام و مصر پر لوٹ مار کر کے لوٹ جاتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک شام و مصر میں آباد عیسائیوں پر سختی کی جانے لگی۔ فاطمی خلفاء نے انھیں اپنے مذہب کی پیروی سے روک دیا اور ان کے گرجا چھین لیے۔ لیکن اس کے باوجود بھی فرانس و اٹلی کے اسلحہ بند گروہوں اور مقامی عیسائیوں کی شرارتوں میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ تو ۱۰۰۸ء میں فاطمی خلیفہ الحاکم بامر اللہ کے حکم سے مرقد مسیح کو کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا اور دوسری زیارتیں بھی تباہ ہوئیں۔ تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، نہ زیارتیں ہوں گی اور نہ عیسائی ان کے بہانے ملک شام و مصر میں داخل ہو سکیں گے۔

یہی مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ اس حادثہ کو چالیس سال بیت گئے اور مصری خلفاء کو یقین دلایا گیا کہ اب عیسائی فساد نہ مچائیں گے تو الحاکم کے پوتے المستنصر باللہ نے ۱۰۴۸ء میں مرقد مسیح دوبارہ تعمیر کرا دیا، جو پہلے سے زیادہ خوبصورت اور عظیم تھا۔ ان میں سے بعض کی نظر میں خلیفہ المستنصر باللہ نے یہ اقدام اس لیے کیا کہ قسطنطنیہ کے یونانی عیسائی بادشاہ اور المستنصر کے درمیان معاہدہ دوستانہ طے پا یا۔ اور بعض یہ بھی لکھتے ہیں کہ خلیفہ کی ماں مارہ بہ خوش عقیدہ عیسائی تھی۔ وجہ خواہ کوئی ہو اتنا واضح ہے کہ کلیسائے مقدس کو تباہ کرنے کا اقدام مصر کے شیعہ خلفاء نے انتہائی مجبوری اور غم وغصہ کے عالم میں کیا تھا۔ اور جب انھیں یقین دلا دیا گیا کہ اب عیسائی پُرامن رہیں گے۔ انہوں نے نہ صرف عیسائیوں پر لگائی ہوئی پابندیاں ختم کر دیں بلکہ عیسائیوں کے تمام مقدس مقامات، سرکاری اخراجات پر بحال کیے۔ اور خود عیسائی مؤرخین معترف ہیں کہ اس کے بعد القدس آنے والے عیسائی زائرین کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بنو فاطمہ کمزور و مضمحل ہو گئے اور نہ کان آل سلجوق پر قدرت مہربان ہوئی۔ تو ۱۰۷۱ء میں سلجوقی سالار نسر خوارزمی نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے فاطمی خلیفہ کے بجائے عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ کا خطبہ پڑھایا۔ لیکن جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا ہے یہ دور انتشار و بدامنی کا دور تھا۔ عیسائی بار بار حملے کرتے اور پسپا ہو جاتے اور ان کے یہ حملے دراصل بیت المقدس پر قبضہ کرنے کی خواہش کا نتیجہ تھے۔

محاربات صلیبی اور صلاح الدین ایوّبی

تاریخ کا باب انوکھا اور المناک ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب عباسی خلافت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور سلجوقی ترکمان باہم الجھے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی مرکزیت انتشار کا شکار تھی۔ عیسائیوں کے مشرقی و مغربی کلیسا متحد ہو رہے تھے تاکہ بیت المقدس کو "ناپاک مسلمانوں سے نجات دلائی جائے" اور بالآخر وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔

عیسائی مؤرخین محاربات ہلال و صلیب کے آغاز کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ سلجوقیوں نے جب فلسطین پر قبضہ کیا۔ تو عیسائیوں کے لیے حج مشکل اور خطرناک ہو گیا۔ اسی دوران میں پطرس راہب (پیٹر دی ہرمٹ) زیارت کر آیا۔ جس نے جلتے ہی مسیحی دنیا میں ہلچل

مچادی۔ اس نے پوپ اربن ثانی سے حکمرانوں اور سرداروں کے نام خطوط لکھوائے اور خود ۱۰۹۵ء میں گدھے پر فرانس اور جرمنی کا دورہ کیا۔ وہ شہر شہر اور قریہ قریہ پھرا۔ لکڑی کی صلیب ایک علم کی طرح اس کے کندھے پر ہوتی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر روتا اور جہادِ مسیح کے نعرے لگاتا، جس کے نتیجے میں سارے یورپ میں تلاطم برپا ہوگیا اور وہ بپھر کر بیت المقدس پر ٹوٹا۔ اور بیت المقدس کو عربوں سے چھین لیا ــــ لیکن یہ عیسائی مؤرخین، آلِ سلجوق کے "مظالم" کا تذکرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرسکے کہ اس زمانے میں عیسائی اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوچکے تھے، ان کے معاشرے میں مجرموں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ پادری کلیسا کے منبر پر چڑھ کر دھاڑتے کہ جو بھی مجرم ہے، بیت المقدس جا کر گناہوں کی معافی مانگے تو اسے جنت مل سکتی ہے۔ عیسائی مؤرخین کا یہ اعتراف عرب مؤرخین کے اس مؤقف کی تائید کرتا ہے کہ عیسائی زائرین کے گروہ زیادہ تر مجرموں پر مشتمل ہوتے تھے، جن کی رگ رگ میں خباثت بھری ہوتی تھی۔ ایسے زائرین کی تعداد میں اضافہ ہوا، تو سلجوقی ترکمانوں نے ان کے بغیر اجازت آنے پر پابندی لگادی اور حکم دیا کہ زائرین ڈھول تماشے اور باجے گاجے ساتھ لے کر شور مچاتے ہوئے آنے کی بجائے عاجزی اور انکساری کا مجسمہ بن کر شہرِ مقدس کے اندر قدم رکھیں۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ راہب پیٹر دی ہرمٹ نیم پاگل تھا جو اپنی بیوی کے جھگڑالو پن سے تنگ آکر اس سے نجات پانے کے لیے راہب بنا تھا۔ اس نے پورے یورپ کو ارضِ مقدس پر حملے کے لیے اکسانے کا منصوبہ بنایا اور اس طرح اپنے لیے "ولی اللہ" کا مقام پیدا کرلیا۔

عرب مؤرخین کے نزدیک صلیبیوں نے سلجوقی خاندان کے مظالم کی جتنی داستانیں بھی بیان کی ہیں۔ وہ محض افسانے ہیں اور خود بعض مغربی مؤرخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ ... یہ ہے کہ آلِ سلجوق نے ایشیائے کوچک کی عیسائی سلطنت کے سرحدی حملوں سے تنگ آکر جوابی کارروائیاں کیں۔ اس نے عیسائیوں کے دلوں پر گہرے زخم لگائے تھے سلجوقی ترک جنگجو تھے۔ وسط ایشیا سے بگولہ بن کر اٹھے اور آندھی بن کر دوسرے ممالک پر چھاگئے سلطان الپ ارسلان اور اس کے بیٹے ملک شاہ نے ایشیائے کوچک سے رومیوں کا تسلط قریب قریب ختم کردیا تھا۔ اور رومی شہنشاہ ایلکسس اپنی ذلت و شکست کا بدلہ لینے کے لیے سوچ بچار کررہا تھا کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ملک شاہ کو مسلمانوں سے ہمیشہ کے

لیے چھین لیا۔ اور سلجوقی سلطنت ملک شاہ کے جانشینوں کی بدولت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ رومی شاہنشاہ نے موقع غنیمت جانا اور پطرس راہب کی زبانی یورپ کے جنگ بازوں کے نام پیغام بھیجا۔ اس نے پوپ کے سامنے فریاد کی۔ اور مذہب کے نام پر ارضِ مقدس اور آثارِ مسیح کی حفاظت کے لیے برانگیختہ کیا۔ اس نے مسلمانوں کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی کہ اُن کا مقصد عیسائی مذہب کو مٹانا ہے۔ پوپ نے پلا سینا اور کلیر مونٹ میں یکے بعد دیگرے دو اجلاس منعقد کیے، جن میں پیٹر بھی شامل تھا۔ اس کی پلپش گوئیوں اور ہرزہ سرائیوں سے متاثر ہو کر تمام حاضرین نے شانوں پر کپڑے کی بنی ہوئی صلیب لگوائی۔ اور "خدا کی مرضی یہی ہے، خدا کی مرضی یہی ہے" پکارتے ہوئے بیت المقدس کو "چھڑانے" کی قسم کھالی۔ فوج کی روانگی ۱۰۹۶ء میں اس دن قرار پائی، جس دن عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت مریمؑ آسمان پر تشریف لے گئی تھیں۔

اس کے بعد تمام یورپ میں صلیب کی گونج ایک سرے سے دوسرے سرے تک سنائی دینے لگی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عیسائی دنیا جنون میں مبتلا ہو گئی ہے۔ جنت کی خوش خبری، حصولِ مال کا لالچ، زرخیز زمینوں پر قبضہ کا تصور ـــــ ان محرکات نے عیسائیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غیظ و غضب بھر دیا۔ راہب اس موقع کو غنیمت جان رہے تھے، کیوں کہ انہیں سخت کلیش خانقاہی زندگی سے نجات مل رہی تھی۔ وہ بڑھ چڑھ کر مذہب کا نام لیتے اور لوگوں کو طرح طرح کا لالچ دیتے۔ کوئی شخص جب صلیب پہن لیتا تو وہ سب قرضوں اور ٹیکسوں سے بری کر دیا جاتا اور "عیسائیت کا محافظ" قرار پاتا ـــــ"

عیسائی مؤرخین معترف ہیں کہ محاربۂ صلیبی کا جنون صرف یورپ تک ہی محدود نہ رہا۔ بلکہ دور دراز کے جزیروں تک پہنچا۔ رابرٹس موناکس لکھتا ہے کہ "دیلز کے لوگ شکار چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈنمارک کے لوگوں نے شراب و کباب درمیان ہی میں چھوڑ دیئے ـــــ اہلِ ناروے ادھ پکی مچھلیوں کو چھوڑ کر جہادِ صلیبی کے لیے کمربستہ ہو گئے۔" اور ایک دوسرا مؤرخ رقمطراز ہے: "کون ان بچوں، کمزور اور بیمار لوگوں کا شمار کرے گا، جو یہ پکارتے ہوئے صلیبی محاربین میں مل گئے کہ

"اے نوجوان سپاہیو! تم تو اپنے نیزوں سے شکست دو گے۔ ہمیں اپنے دکھ درد کی وجہ سے فتح میں شریک ہونے کا موقعہ دو" ـــــ چنانچہ تیرہ لاکھ مخلوق فلسطین پر

قبضہ کرنے کے لیے روانہ ہوئی۔ اس جمّ غفیر کا سردار پطرس راہب (PETER THE HERMET) تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا یورپ ایشیا پر چڑھ دوڑا ہے۔ راستے میں ان "مقدس محاربین" نے ہنگری اور بلغاریہ میں وہ لوٹ مار مچائی کہ الامان! ___ قسطنطین کی بیٹی کے بقول "جو بچّہ بھی ان کے سامنے آتا یہ اس کی تکا بوٹی کر ڈالتے"۔ بالنتیجہ "مقامی باشندوں کے ساتھ لڑائیاں ہوئیں۔ بقیۃ السیف بھاگ کر قسطنطنیہ پہنچے۔ قیصر الیکسس نے انھیں ایشیائے کوچک میں دھکیل دیا۔ یہاں ان کی درندگی اور بڑھ گئی لیکن قلج ارسلان سلجوقی والیٔ قونیہ نے ان کی وحشت کا پورا انتقام لیا اور ان کی پوری فوج جانوروں کی طرح قتل ہو کر برباد ہو گئی۔

دریں اثناء ۱۵ اگست ۱۰۹۶ء کو یورپی حکومتوں کی باقاعدہ افواج ساحلِ ایشیا پر اتریں۔ ان میں فرانس، برطانیہ، اٹلی، سسلی اور جرمنی کی فوجیں شامل تھیں۔ ان کی قیادت یورپ کے جری، گاڈ فری رئیس بولون، ہیونغ اعظم، ریمنڈ کاؤنٹ ٹولوز، رابرٹ امیر نارمنڈی، ہیگو آف ورمینڈا جیسے سالار کر رہے تھے۔ افواج کی تعداد دس لاکھ سے کم نہ تھی۔ صلیبی محاربین نے قونیہ کا محاصرہ کر لیا۔ اور سلطان امیر ارسلان، ایک خوفناک معرکے کے بعد شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا، اس کے بعد صلیبی محاربین انطاکیہ کی طرف بڑھے اور ارمنی النسل امیر فیروز کی غداری نے انھیں انطاکیہ میں داخلے کا راستہ دے دیا۔ صلیبی فوجیں رات کو شہر میں داخل ہوئیں اور ساری مسلمان آبادی کو تہ تیغ کر کے ان کے مکانات مسمار کر دیئے۔ عیسائی مؤرخین کے بیان کے مطابق مسلمان مقتولین کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔

اس کے بعد عیسائی فوجیں معرۃ النعمان کی طرف بڑھیں اور اسے فتح کر کے تین دن تک قتلِ عام کرتی رہیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان قتل اور اسی قدر زندہ گرفتار کیے گئے۔ عین اسی مرحلہ میں فاطمی خلافتِ مصر نے ترکمانی کو کمزور پا کر ارضِ فلسطین پر قبضہ کرنے کی ٹھانی اور فاطمی خلیفہ مستعلی کے سپہ سالار افضل بن بدر جمالی نے القدس پر چڑھائی کر دی۔ چالیس روز کے محاصرہ کے بعد شعبان ۴۸۹ھ مطابق ۱۰۹۶ء کو شہر فاطمیوں کے قبضے میں آ گیا۔ اور افتخار الدولہ حاکم ہوا، لیکن تین سال بعد صلیبیوں نے قدس کا محاصرہ کر لیا۔ صلیبی چالیس ہزار اور مصری فوج صرف ایک ہزار تھی۔ اسے مصر سے کمک پہنچی نہ ہی عباسی خلیفہ المستظہر باللہ کوئی اعانت کر سکا۔ نتیجۃً "چالیس روز کے بعد ۲۳ شعبان ۴۹۲ھ ہجری

(۱۵ جولائی ۱۰۹۹ء) کو صلیبی کوہ صیہون کی طرف سے شہر میں داخل ہو گئے۔ مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لی لیکن عیسائیوں نے شہر میں قتل و غارت کے بعد مسجد کا رُخ کیا۔ اور بچوں، بوڑھوں، جوانوں سب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شہید کیا۔ ایک گروہ محراب داؤد میں جا پہنچا۔ لیکن جس وقت نصرانی بیت المقدس کی شمالی دیوار توڑ کر اندر آ گئے۔ تو ایک قیامت برپا ہو گئی۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کئے گئے۔ معصوم بچّوں کو اٹھا اٹھا کر فصیلوں پر پٹیکا گیا۔ علمائے کرام کو تیل اور نفط چھڑک کر جلایا گیا۔ مسجد اقصیٰ اور محراب داؤد میں شہداء کی تعداد سات ہزار سے زیادہ تھی۔ مشرقی و مغربی مؤرخین متفقہ طور پر مسلمان مقتولین کی مجموعی تعداد ستر ہزار بتاتے ہیں۔ قدس کے گلی کوچوں کے علاوہ ویرانوں اور کھنڈروں میں لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ مسجد اور اس کے صحن میں مقتولین کا خون گھوڑوں کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔ اس غارت گر فتح کے تیسرے روز بچے مسلمان قیدی بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ باقیوں کو مجبور کیا گیا۔ کہ وہ خود کو میناروں اور مکانوں کی چھتوں سے گرا کر ہلاک کر ڈالیں۔ مشہور یورپی مؤرخ سٹینلے لین پول لکھتا ہے کہ صلیبی بیت المقدس میں اس طرح گھسے جیسے کہ کوئی پرانی لکڑی میں کچھ ٹھونکے۔ ایک اور عیسائی مؤرخ رقمطراز ہے:

بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ پر صلیبیوں نے ایسا قتل عام کیا کہ ان صلیبیوں کے جو مسجد عمر میں سوار ہو کر گئے تھے۔ گھوڑوں کے گھٹنے خون کے چشمے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بچوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر دیواروں پر دے مارا گیا یا ان کو گھما کر فصیل سے پھینک دیا گیا۔ دوسرے دن ان لرزہ خیز مظالم کا وسیع پیمانے پر اور جان بوجھ کر اعادہ کیا گیا۔ ٹینکریڈ نے تین سو قیدیوں کو جان کی امان دی تھی۔ وہ چیختا رہا لیکن اس کی چیخ و پکار کسی نے نہ سنی اور سب کو قتل کر دیا گیا۔ پھر ایک زبردست قتل عام شروع ہوا، عورتوں، بچوں، بڑوں اور بوڑھوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔

شیخ سعدی شیرازی نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جو عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے، انھیں انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔ عینی شاہد ریمنڈ کے حوالے سے لیبان نے لکھا ہے:

"ہمارے لوگ (صلیبی) راستوں میں اور مکانوں کی چھتوں پر دوڑ رہے تھے اور اُس

شیرنی کی طرح جس کے بچے چھین لیے گئے ہوں، قتل عام کے مزے لے رہے تھے۔ یہ بچوں کے ٹکڑے کر رہے تھے اور کسی متنفس کو بھی نہ چھوڑتے تھے۔ جلد فراغت حاصل کرنے کی غرض سے ایک ہی رسی میں کئی کئی آدمیوں کو لٹکا دیتے تھے۔ ایک دوسرا عینی شاہد ریمانڈ واژیل پوئی کے میس بیان کرتا ہے کہ :

"بیت المقدس کے راستوں اور ہر جگہ پر سروں، ہاتھوں اور رانوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ اور لاشوں پر سے چلنا پڑتا تھا...... ہیکل سلیمانی (مسجد عمرؓ) میں اس قدر خون بھرا تھا کہ اس کے صحن میں لاشیں تیرتی پھرتی تھیں۔ کسی کا ہاتھ، کسی کا پیر، کسی کا دھڑ بے جوڑ اس طرح سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے کہ انھیں پہچاننا مشکل تھا۔ صلیبیوں نے اس قتل عام کو ناکافی سمجھ کر ایک محفل منعقد کی، جس میں قرار پایا کہ کل باشندگان بیت المقدس کو تہ تیغ کر دیا جائے۔ یہ قتل عام کا بازار باوجود حامیان دین عیسوی کی مستعدی کے آٹھ روز تک گرم رہا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے سب مارے گئے کوئی متنفس زندہ نہ رہا۔"

مسجد عمرؓ سے چاندی کی چالیس بڑی قندیلیں جن کا وزن ایک سو رطل شامی اور دو سو چھوٹی قندیلیں لوٹی گئیں۔ مسجد اقصیٰ کا مال غنیمت اس قدر تھا کہ چھ گاڑیاں بھی بھری جاتیں تو ختم نہ ہوتا۔

اس قتل عام کی اطلاع بغداد پہنچی تو گریہ کناں اہل بغداد سیاہ ماتمی لباس پہن کر گلیوں میں نکل آئے۔ وہ دہائی دے رہے تھے۔

"آہ! القدس میں قہر الٰہی نازل ہوئی۔"

خلیفہ المستظہر نے فوج بھیجی۔ جو لڑے بغیر علما ان سے پلٹ گئی۔ مصر نے الفضل بن امیر الجیوش کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا۔ لیکن وہ بھی شکست کھا گیا۔ یہ مصری لشکر ناتجربہ کار اور بازاری آدمیوں پر مشتمل تھا۔ دشمن نے جب حملہ کیا، تو وہ بے جان کھڑا رہا اور دشمن نے آسانی سے اسے قید کر لیا۔ صرف چند فوجی واپس جا سکے۔

بہرحال اس المناک واقعہ کے بعد عیسائیوں نے انطاکیہ، رہا، طرابلس اور بیت المقدس میں چار سلطنتیں قائم کر لیں۔ ان کا سردار اعلیٰ گاڈفری، بیت المقدس کا والی ہوا۔ اس نے اپنے لیے محافظ قبر مسیح کا لقب پسند کیا۔ اور تھوڑے دنوں بعد ۱۸ جولائی ۱۱۰۰ء کو مر

گیا۔ اس کا بھائی بالڈوین رہا سے آکر جانشین ہوا۔ اور اپنی جگہ اپنے بیٹے بالڈوین برگ کو چھوڑ آیا جسے عربی تواریخ میں بردویل لکھا جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے بیت المقدس پر قبضہ کر لینے کے بعد بھی عیسائیوں کے لشکر مسلسل چلے آتے تھے لیکن مسلمان صلیبیوں کے مقابلے میں کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر سکے۔ عباسی خلیفہ برائے نام تھا۔ سلجوق بے جان ہو چکے تھے۔ اور فاطمی خلافت بھی دم توڑ رہی تھی۔ سارے عرب میں بے شمار خود مختار مسلم ریاستیں قائم تھیں، جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق اور ربط نہ تھا۔ اگر تھا تو فقط اتنا کہ وہ اپنے اقتدار کو وسیع اور مستحکم کرنے کے لیے ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں نے جن جن علاقوں پر قبضہ کیا مسلمانوں سے خالی کرا لیا اور وہ پہاڑوں اور ریگ زاروں میں منتشر ہو گئے۔ لیکن ہیرلڈلیم کے الفاظ میں "مصائب کے اس اندھیرے میں بھی مسلمانوں کا ایمان و عقیدہ چٹان کی طرح مضبوط رہا، انھیں یقین تھا کہ موجوں کی طوفان انگیزی عارضی ہے اور وہ موجیں اپنے اصل مقام کی طرف ضرور لوٹ جائیں گی۔" پہلی شکست کے بعد مختلف عظماء اس عقیدے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں اتابک عمادالدین زنگی والی موصل کا نام سر فہرست ہے۔ انھوں نے ۱۱۴۴ء میں عیسائیوں کو شکست دے کر رہا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے سقوط کی صدائے بازگشت سارے یورپ میں سنائی دی۔ پاپائے روم نے دعاۃ بھیج کر تمام یورپ میں مسلمانوں کے خلاف اشتعال پیدا کیا اور عیسائی اقوام ایک بار پھر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں، چنانچہ فرانس کا بادشاہ لوئی سابع اور فرمانروائے المانیہ کنراڈ ثالث اپنی فوجوں کو ساتھ لے کر ارض مقدس کی طرف بڑھے۔ پہلے کنراڈ آیا، لیکن مسلمانوں نے شکست فاش دے کر بیشتر فوج کو قتل کر دیا۔ بقیۃ السیف بھاگے۔ راستے میں فرانسیسی لشکر آتا ہوا ملا۔ اس کے ساتھ ہو گئے لیکن اسے بھی مار پڑی اور بچے کھچے صلیبی طرح طرح کی سختیاں اور مصیبتیں سہتے بیت المقدس پہنچے (۱۱۴۷ء) وہاں سے دمشق پر جو مجیرالدین ابق کے قبضہ میں تھا، حملہ کیا، لیکن عمادالدین زنگی کے بیٹوں سیف الدین اور نورالدین محمود نے انھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ دوسری صلیبی جنگ تھی۔

اس جنگ میں ایک ممتاز ضعیف العمر عالم دین اور شیخ وقت حجۃ الدین یوسف مغربی بھی شریک تھے، مسلمان سالار نے ان سے درخواست کی کہ آپ تکلیف نہ کیجیے۔ ہم

اس فرض کی ادائیگی کے لیے موجود ہیں، لیکن شیخ نے فرمایا۔ میں خدا سے سودا کر چکا ہوں۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ ——— اور میدانِ جنگ میں لڑ کر شہادت حاصل کی۔

اس معرکۂ خونی میں عیسائیوں کو کس قدر نقصان ہوا۔ اس کا اندازہ ایک عینی شاہد کے اس بیان سے لگا لیجئے۔ کہ یورپ کے شہر اور قلعے خالی اور سنسان ہو گئے تھے، اس "مقدس آگ" کا ایندھن بلنے کے لیے اتنی کثیر تعداد یورپ سے روانہ ہوئی تھی۔ کہ پیچھے سات عورتوں کے مقابلے میں ایک مرد نظر آتا تھا جب یہ خبر یورپ پہنچی کہ ان مصیبت زدہ عورتوں کے باپ، شوہر بیٹے اور بھائی جو جنگ میں پھنس گئے تھے اب کبھی اپنے گھروں کو نہ لوٹ سکیں گے تو سارا یورپ نالہ و فریاد سے گونج اٹھا۔

یورپی مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسری صلیبی جنگ سے یورپ کا سر غرور ہی نیچا نہیں ہوا، بلکہ بیت المقدس کی لاطینی ریاست بھی کمزور ہو گئی اور اگر نورالدین کو موت مہلت دیتی تو بیت المقدس میں عیسائی سلطنت کا خواب منتشر ہو کر رہ جاتا۔

سلطان نورالدین محمود ایمان اور عمل کی دولت سے مالا مال تھا، ملکِ شام سے عیسائیوں کا اخراج اس کی زندگی کا مقصدِ اولین قرار پا چکا تھا، چنانچہ اس نے اپنی افواج کو منظم کیا، اور اکثر نواحی ریاستوں پر قبضہ کر لیا، تاکہ وہ دل جمعی سے فرنگیوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس نے فرنگی سازشوں اور حملوں کو ناکام بنا کر شام اور الجزیرہ کی متحدہ ریاست قائم کی اور مصر میں اثر و رسوخ حاصل کیا۔ اس کا یہی اقدام آگے چل کر مسلمانوں اور اسلام کے لیے خوش بختی کا باعث بنا۔ کہتے ہیں کہ اسے ہر وقت جہاد کا خیال رہتا۔ لیکن اس نے دشمن سے عیاری و مکاری کو کبھی روا نہ رکھا۔ جب حاکم یروشلم بالڈون مرض الموت میں مبتلا ہوا اور اس کی جانشینی پر عیسائیوں میں اختلاف رائے تھا تو بعض ساتھیوں نے موقعہ کو غنیمت جان کر سلطان کو حملہ پر اکسایا۔ لیکن سلطان نے یہ کہہ کر اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ کہ اس وقت جب دشمن مصیبت میں مبتلا ہے۔ اس پر حملہ جوانمردی نہیں"——

سُلطان صلاحُ الدّین

تاریخ کا یہ انوکھا باب ہے کہ نوجوان یوسف، جسے اپنے چچا کی اصولوں اور سلطان نورالدین کے حکم پر اپنی مرضی کے خلاف مصر جانا پڑا، آگے چل کر

نہ صرف یہ کہ مصر کا حاکم ہوا بلکہ سلطان صلاح الدّین ایوبی کے نام سے اپنا نقش تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ثبت کر گیا۔ اور اس کا مصر جانا مسلمانوں کے لیے رحمت ثابت ہوا ــــ سلطان صلاح الدین، نور الدین کی زندگی ہی میں مصر کی وزارتِ عظمیٰ اور پھر اقتدارِ اعلیٰ کا مالک بن چکا تھا، لیکن اس کے جوہر اصلی اپنے آقا کی موت کے بعد ہی کھلے ــــ قاضی ابن شداد سلطان صلاح الدین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق ان کے رگ و ریشہ میں سما اور ان کے قلب و دماغ پر چھا گیا تھا۔ یہی ان کا موضوع گفت گو تھا۔ ہمہ وقت اسی کا ساز و سامان تیار کرتے رہتے اس کے اسباب و وسائل پر غور کرتے، اسی مطلب کے آدمیوں کی ان کو تلاش رہتی۔ اسی کا ذکر کرنے والے اور اس کی ترغیب دینے والے کی طرف رُخ کرتے، اسی جہاد فی سبیل اللّٰہ کی خاطر انہوں نے اپنی اولاد اور اہلِ خاندان، وطن، مسکن اور تمام ملک کو خیر باد کہا۔ سب کی مفارقت گوارا کی اور ایک خیمہ کی زندگی پر قانع رہے، جس کو ہوائیں اڑا سکتی تھیں۔ کسی شخص کو اگر ان کا قرب حاصل کرنا ہوتا تو وہ ان کو جہاد کی ترغیب دیتا اور اس طرح ان کی نظر میں وقعت حاصل کر لیتا۔ قسم کھائی جا سکتی ہے کہ جہاد کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد انہوں نے ایک پیسہ بھی جہاد اور مجاہدین کی امداد و اعانت کے علاوہ کسی مصرف میں خرچ نہیں کیا" سلطان کی اس عاشقانہ کیفیت اور دردمندی کی تصویر قاضی ابن شداد نے یوں کھینچی ہے۔

"میدانِ جنگ میں سلطان کی کیفیت ایک ایسی غمزدہ ماں کی ہوتی تھی، جس نے اپنے اکلوتے بیٹے کا داغ اٹھایا ہو، وہ ایک صف سے دوسری صف تک گھوڑے پر دوڑتے پھرتے اور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے، خود ساری فوج میں گشت کرتے، اور پکارتے پھرتے "یا للاسلام" اسلام کی مدد کرو" آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے" ... شاہی طبیب نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ جمعہ سے اتوار تک سلطان نے صرف چند لقمے کھائے ان کی طبیعت میدانِ جنگ کے علاوہ کسی اور طرف متوجہ ہی نہیں تھی"

لین پول لکھتا ہے کہ اس نے اپنی تبلیغ کی تمام کوشش اس بات میں صرف کی کہ ایسی اسلامی سلطنت قائم کی جائے، جس میں کفار کو ملک سے خارج کرنے کی پوری قوت ہو۔

سلطان صلاح الدین نے ... میں مصر کی وزارت عظمیٰ ... اس کا ... میں ...

خلیفہ العاضد انتقال کر گیا۔ اس کی موت پر سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر کو عباسی خلافت کے تحت کر دیا۔ اور ساتھ ہی فلسطین کو عیسائیوں سے آزاد کرانے کی مہم کا آغاز۔ ۱۱۷۳ء میں سلطان نور الدین انتقال کر گیا۔ بعض شرپسندوں نے ملک میں فساد برپا کرنا چاہا، لیکن صلاح الدین کی دانش نے تمام سازشوں کو ناکام بنا دیا۔ شام و مصر متحد ہو گئے اور عیسائی سکندریہ میں شکست کھانے کے بعد صلح پر مجبور ہو ئے۔ نتیجتہً صلح کا بارہ سالہ معاہدہ عمل میں آیا۔ لیکن عیسائیوں نے معاہدہ سے انحراف کیا۔ اس کے باوجود سلطان نے کوئی انتقامی کارروائی نہ کی۔ البتہ مدافعتی جنگیں جاری رہیں۔ لیکن جب سلطان نے نواحی امارتوں پر تسلط پا لیا۔ تو عیسائیوں پر کاری ضرب لگانے کی تیاریاں شروع کر دیں ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان نے کبھی کسی معاہدہ کے خلاف نہیں کیا۔ اس کے برعکس عیسائی متواتر خلاف ورزیاں کرتے رہتے۔ چنانچہ اس معاہدۂ صلح کی خلاف ورزی کرتے ہوئے والئ کرک ارناط نے مکہ معظمہ اور مدینۃ النبی پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور روضۂ اطہر کے بارے میں اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے فوجیں ساحل حجاز پر اتار دیں۔ ہیرلڈلیم لکھتا ہے کہ اس حملے کا منصوبہ کافی دیر سے اس کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔ وہ اپنے سنگین قلعے میں بیٹھا جہاز تیار کرواتا رہا، جہازوں کے مختلف حصے قلعے میں بنا کر بحیرۂ روم کے شمال میں پہنچائے جاتے، سادہ لوح دوست پرور عرب اس پُراسرار سامان کو اونٹوں پر لاد کر مقررہ مقام پر پہنچا دیتے۔ اس نے متفرق حصوں کو جوڑ کر جہاز بنائے اور بحیرۂ قلزم پر مسلمانوں کی بندرگاہ ایلہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا۔ بحیرۂ قلزم میں جو گزشتہ پانچ سو سال سے اسلامی تسلط میں تھا۔ یہ عیسائیوں کی پہلی مداخلت تھی۔ "ریجنالڈ (ارناط) کے صلیبی ایک سال تک قتل و غارت میں مصروف رہے۔ یہ باکتر بند اور عبا پوش رہزن پُرامن حاجیوں کے جہازوں اور قافلوں کو لوٹنے کی تاک میں لگے رہتے" ایک عرب مؤرخ کے الفاظ میں:

"ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو"

ایک مرتبہ تو یہ مُن چلے مدینہ منورہ سے ایک دن کے فاصلے پر پہنچ گئے تھے اور اس مقدس شہر کی سلامتی خطرے میں تھی کہ سلطان کو خبر ملی وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے مسلمان بحری بیڑے کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ جس نے تیز رفتاری سے ارناط کے لشکر کو جا لیا اور شکست دے کر قتل یا قید کیا۔ البتہ ارناط زندہ بچ کر بھاگ نکلا۔

اس حادثہ اور عیسائیوں کی بار بار عہد شکنی سے سلطان کو ضبط کا یارا نہ رہا۔ اس نے کرک کی طرف کوچ کیا۔ ۳ر جولائی ۱۱۸۷ء کو حطین کے قریب خونریز جنگ ہوئی۔ جو ۴ر جولائی کی شام تک انجام کو پہنچ گئی۔ ہیرلڈلیم صلیبیوں کی تباہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے:

حطین کے میدان میں گندم کے ڈھیروں کی طرح ان کی لاشوں کے انبار لگے تھے۔ صلیب الصلبوت ان سے چھین گئی۔ قیدیوں میں ارناط اور شہنشاہ کی بھی شامل تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے ارناط کو اپنے ہاتھوں جہنم واصل کر کے اس گستاخ رسول سے شانِ رسالت میں گستاخی کا انتقام لیا۔

فتح بیت المقدس

اس فتح کے بعد سلطانی لشکر نے تیزی سے ساحلی علاقے فتح کئے اور ۲۰ر ستمبر کو بیت المقدس کا محاصرہ کر کے باب داؤد کے سامنے خیمے گاڑ دیئے۔ سلطان نے اہالیانِ شہر کو پیش کش کی کہ "اگر وہ ہتھیار ڈال دیں اور شہر خالی کر جائیں تو انھیں زراعت کے لیے زمین دی جائے گی" مگر بڑا پادری رضامند نہ ہوا۔ اس پر حاکم شہر باسیانِ شہر کو راہب کے سپرد کر کے نکل گیا۔ شہر میں ایک لاکھ عیسائی فوج موجود تھی۔ پیش کش کے مسترد ہو جانے پر سلطان نے پندرہ رجب کو محاصرہ کر لیا اور ۲۰ر رجب کی صبح کو القدس کے شمال میں واقع کلیسائے صیہون کے قریب سے شہر پر حملہ آور ہوا۔ محاصرین اور محصورین دونوں بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے۔ اگر کوئی امیر مارا جاتا تو جنگ کی آگ اور تیز ہو جاتی۔ مگر یہ تصادم ایک ہفتہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ محصورین نے جب کوئی راہِ نجات نہ پائی۔ تو صلح کے لیے سلسلہ جنبانی کیا۔ اول اول سلطان نے اصرار کیا کہ میں شہر بزورِ شمشیر فتح کرونگا۔ تاکہ ان مظالم کا بدلہ لیا جا سکے جو ۱۵ر جولائی ۱۰۹۹ء کو عیسائیوں نے شہر فتح کرتے وقت مسلمانوں پر ڈھائے تھے لیکن بار بار کی درخواستوں نے اسے نرم کر دیا اور وہ صلح پر رضامند ہو گیا۔

غازی سلطان نے شرط لگائی کہ چالیس دن کے اندر ہر مرد، دس دینار، ہر عورت پانچ دینار اور ہر بچہ ایک دینار بطور زرِ فدیہ ادا کر کے شہر سے نکل جائے، ورنہ چالیس دن بعد فدیہ نہ دینے والوں کو قیدی بنا لیا جائے گا۔ سلطان کو تیس لاکھ دینار فدیہ کے

طور پر وصول ہوتے۔ صلاح الدین نے بے شمار عیسائی باشندے زرِ فدیہ لیے بغیر چھوڑ دیئے۔ ایک عیسائی امیر کی دولت بیت المقدس میں رہ گئی تھی۔ اس کے بدلے از خود اٹھارہ ہزار آدمی رہا کر دیئے۔ اس کے بعد بھی سولہ ہزار آدمی رہ گئے۔ چنانچہ جن کے پاس زرِ فدیہ ادا کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ انھیں بغیر فدیہ لیے رہا کر دیا گیا۔ یروشلم کی ملکہ سبیلا شہر سے جاتے وقت سلطان سے ملنے آئی۔ تو اس کی بڑی عزت و تکریم کی گئی۔ ملکہ کے ساتھ بہت سی دیگر خواتین بھی تھیں، جنھوں نے روتے بلکتے بچے گودیوں میں اٹھا رکھے تھے۔ انھوں نے سلطان سے درخواست کی کہ ان ننھے بچوں کے والد رہا کر دیے جائیں۔ سلطان نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے بہت سے لوگوں کو آزادی دے دی۔ دس ہزار عیسائیوں کا زرِ فدیہ خود ادا کیا۔ اس کے بھائی سیف الدین اکرم نے بھی ہزاروں قیدی خرید کر آزاد کر دیے۔ پادریوں کے ساتھ عزت و تکریم سے پیش آیا۔ لاٹ پادری مسجدِ اقصےٰ، قبۃ الصخرا اور کلیسائے مقدس کا مال و منال لے کر نکلا۔ اس سے بھی تعرض نہ کیا۔ الغرض اس نے ایسا شریفانہ سلوک کیا کہ عیسائی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بقول لین پول، رحمدل سلطان نے صلیبیوں سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ کر کے "شریف نائٹ" کا لقب پایا۔

لین پول اور ولیم صوری لکھتے ہیں کہ یروشلم صلیبی دور میں عیاشی، فحاشی اور بدکاری کا مرکز بن گیا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے فتح کے بعد عیسائیوں کو امن و امان دیا اور ان ستر ہزار مسلمانوں کا انتقام نہ لیا، جو ایک صدی قبل بیت المقدس میں ذبح کر دیئے گئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جن لوگوں نے شہر سے نکلنا تھا۔ وہ نکل چکے تو سلطان' ہلالی پرچم لہراتا ہوا بروز جمعہ بتاریخ ۲۷ رجب ۵۸۲ھ بمطابق اکتوبر ۱۱۸۷ء بیت المقدس میں داخل ہوا۔ اور مسجدِ عمر اور دوسرے مقدس مقامات سے صلیبیوں کو نوچ کر ہلالی پرچم لہرا دیا۔

"وہ صبحِ جلیل
جب کفر کے عَلَم سرنگوں ہوئے

ظلمت ازلی میں رُوپوش ہوئے۔

وہ صبحِ اُمید
اسلام کی حیاتِ تازہ کی نوید
نُورِ ازلی کی درخشندہ دمید۔"

مغربی مؤرخین لکھتے ہیں کہ مصر میں سلطان صلاح الدین ایوبی کا اقتدار قائم ہوتے ہی فرنگیوں میں تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ اور انہوں نے اس سے مقابلہ کے لیے اندلس اور سسلی کی حکومت سے مدد طلب کی تھی۔ لیکن یہ امداد اس وقت پہنچی جب سلطان بیت المقدس پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس کے باوجود عیسائیوں نے اس کمک کے پہنچنے پر دمیاط پر حملہ کر دیا۔ لیکن شکست کھائی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی پیدائش سے سات سال قبل فلسطین و شام میں لاطینی ریاست اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ شام اور بالائی علاقہ، جزیرہ (میسوپوٹیمیا) ان کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ آئے دن دیار بکر کے علاقے مریدین و عامد سے لے کر العریش اور نہر المصر تک حملے کرتے رہتے۔

سلطان جب سریر آرائے سلطنت ہوا۔ فلسطین و شام کے امراء باہم متصادم تھے اور یہ مختصر علاقہ دمشق، حلب، مدینۃ الرہا اور موصل کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ لیکن ۱۱۸۳ء تک سلطان نے دجلہ سے لے کر دریائے نیل تک تمام سلطنت کو مفتوح یا باجگذار بنا کر متحد کر دیا۔ پھر فرنگیوں سے جنگ کا آغاز طبریہ کے میدان سے ہوا۔ اس جنگ میں فرنگیوں کا جو انجام ہوا۔ اس کا اندازہ ایک چشم دید گواہ کے بیان سے ہوتا ہے کہ "جو شخص میدانِ جنگ میں پڑی لاشوں پر نظر دوڑاتا، اسے یوں محسوس ہوتا کہ سارے فرنگی مارے گئے ہیں، اور جو قیدیوں کو دیکھتا، وہ سمجھتا۔ کہ سارے قید ہو گئے ہیں۔"

بعض مؤرخ اس جنگ کو حطین کا معرکہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد سلطان نے بیت المقدس کی طرف پیش قدمی کی۔ اور بیت المقدس پر قبضہ عیسائی ریاست کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔

فتحِ بیت المقدس کے بعد غازیٔ اسلام سلطان صلاح الدین نے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نجاستوں سے پاک کر کے ان کے فرش اور دیواریں گلاب و مشک سے دھلوائیں۔ ان مقدس مقامات میں صلیبیوں نے حضرت عیسیٰؑ و مریمؑ کی خیالی تصویریں بنا رکھی تھیں، انہیں صاف کرنے اور جمعہ پڑھنے کا حکم دیا۔ ۴ شعبان ۵۸۳ھ کو قاضی محی الدین محمد بن علی الشافعی نے خطبہ دیا۔ اور نماز پڑھائی۔ سلطان ۲۴ شعبان ۵۸۲ھ تک شہر میں رہا اور بعد نماز جمعہ صور کی طرف روانہ ہو گیا۔

صلاح الدین سے پہلے یعنی صلیبی عہد میں بیت المقدس اور فلسطین کی جو اخلاقی حالت تھی۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے ولیم آف ٹائر کا یہ فقرہ ہی کافی ہے کہ:
"سارے فلسطین میں ایک عورت بھی نہیں جسے باعصمت کہا جائے۔" صلیبیوں اور گرجا کے راہبوں کی زندگی میں جو تضاد تھا۔ اس سلسلے میں اس کا بیان ہے کہ" عام صلیبی محنت اور مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر گرجوں کی دولت میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا.... اسقفِ اعظم ہرقلیس کے صندوق سیم وزر سے لبریز تھے، وہ دولت کا پجاری تھا۔ اس کی زندگی حرص و ہوس کا افسانہ تھی۔"
ہیبر لڈلیم کے بیان کے مطابق وہ زمین جو کلیسا کی ملکیت نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ ہیکل کے محافظوں، صلیبی نیم مذہبی اور نیم فوجی جماعتوں کے تصرف میں چلی گئی تھی۔ سرزمینِ قدس کے یہ خادم اس کے حقیقی مالک بن بیٹھے تھے۔ یہ جماعتیں براہِ راست پاپائے روم کے ماتحت تھیں۔ قانون کے مجرم ان کے ہاں پناہ لے کر محفوظ ہو جاتے تھے۔ گائی ڈی لوسگنام بیت المقدس کا آخری حکمران تھا۔ اس سے قبل آٹھ شاہ حکومت کر چکے تھے۔
تاریخ بتاتی ہے کہ جب شکست خوردہ صلیبی بیت المقدس سے نکلے تو ان کا ایک گروہ مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ وہ ہر جگہ یہ پیغام دیتا جاتا۔
"افسوس اے عالمِ مسیحیت! ــــ صد افسوس! دشمن یروشلم پر قابض ہو گیا ہے ــــ مقدس صلیب کھو گئی اور ہماری فوج برباد ہو گئی ہے۔" پوری عیسائی دنیا میں آگ لگ گئی۔ پادری اور راہب تمام مسیحی دنیا کا دورہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے، انھوں نے "مقدس باپ کی دہائی دے دے کر لوگوں کو جنگ پر ابھارا۔ بیت المقدس کا اسقفِ اعظم جس سے سلطان نے انتہائی فیاضی کا سلوک کیا تھا، فرانس کے شہروں میں ایک تصویر لیے گھوما، جس میں جنابِ مسیح کو زخمی حالت میں اور ایک مسلمان کو حملہ کرتے دکھایا گیا تھا۔
آخر یہ آگ بھڑک اٹھی، شاہ جرمنی فریڈرک نے سلطان کو خط لکھا:
"اگر بیت المقدس عیسائیوں کے حوالے نہ کیا گیا تو میں اپنی ساری فوجیں لے کر تمہیں سزا دینے کے لیے پہنچ جاؤں گا۔" سلطان نے اس خط کا کوئی اثر نہ لیا۔ لیکن یورپ میں ایک خوفناک جنگ کے لیے تیاریاں زور شور سے جاری تھیں اور اس میں ہر عیسائی نے مقدور بھر حصہ لیا۔ حتیٰ کہ عورتیں تک سپاہی بن گئیں اور قیصر جرمنی فریڈرک، شاہ انگلستان رچرڈ اول

اور ڈیوک آف آسٹریا۔ اپنی فوجوں اور صلیبی رضا کاروں کے ساتھ سلطان صلاح الدین کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ تیسری صلیبی جنگ تھی۔

اس جنگ کی تیاری جس جوش و خروش سے کی گئی۔ اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ جنگ کے مصارف کے لیے انگلستان و فرانس وغیرہ میں عشرِ صلاح الدین کے نام سے ایک ٹیکس جاری کیا گیا۔ پادریوں نے فتویٰ دے دیا تھا۔ کہ جو شخص اس کارِ خیر میں شریک نہیں ہوگا۔ وہ مسیحیت سے خارج ہوگا۔ مشہور مؤرخ گبن نے لکھا ہے کہ:

"صلاح الدین نے یورپ سے اپنی عظمت کا جو خراج اس ٹیکس کی شکل میں لیا وہ آج تک کسی تاجدار کو نصیب نہیں ہو سکا۔" رچرڈ نے مصارفِ جنگ کے لیے اپنی جاگیر بیچ دی۔ بڑے بڑے عہدوں کو نیلام کیا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ کہ اگر کوئی خریدار ہو تو لندن تک بیچنے کے لیے تیار ہوں۔

جو لوگ خود کسی معذوری کی بنا پر شریک نہ ہو سکے۔ انھوں نے اپنی جانب سے اپنے خرچ پر آدمی بھیجے اور عورتوں نے اپنی اکلوتی اولادوں کو نذر کر دیا۔ بہرحال دو سال کی زبردست تیاری کے بعد یہ لشکر فلسطین کی طرف بڑھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ:

"یہ فوج نہیں بڑھ رہی تھی۔ ہتھیاروں اور سپاہیوں کا ایک سیلاب تھا۔ جو عربوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا دینے کے لیے امڈ آیا تھا۔"

اس لشکر کی تعداد بعض مؤرخین کے قول کے مطابق چھ لاکھ اور بعض کے نزدیک دس لاکھ تھی۔ جتنے یورپی و مسیحی سربراہ اس جنگ میں شامل تھے۔ کسی صلیبی محاربہ میں شریک نہیں ہوئے اور ان کی متحدہ قوت کا مقابلہ تنہا صلاح الدین کو کرنا تھا۔

رچرڈ شیر دل

قیصر جرمنی تو ایشیائے کوچک تک پہنچا تھا کہ دریائے سالس کو عبور کرتے ہوئے ڈوب مرا۔ اور اس کی فوج کا ایک حصہ واپس چلا گیا۔ البتہ فرانس اور برطانیہ کی افواج ساحل فلسطین پر اتریں اور انہوں نے عکہ کا محاصرہ کر لیا۔ چند ماہ بعد جرمن بھی آ ملے۔ محاصرین میں آسٹریلوی، اطالوی، برطانوی، البانوی، فرانسیسی، جرمن، مختصر یہ کہ یورپ کے ہر ملک اور ہر خطہ کے فوجی اور صلیبی رضا کار شریک تھے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ انتہائی نامساعد حالات کے باوجود

محصورین نے تین سال سے زیادہ عرصہ تک حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ اور آخر ۱۲ جولائی ۱۱۹۱ء کو مسلمانانِ عکہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور دو لاکھ دینار خراج ادا کرنے کے وعدے پر صلح کر لی کیونکہ محصورین کو باہر سے کسی کمک کی امید نہ رہی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان نے عرصۂ محاصرہ میں شہریوں کی مدد کرنے میں پوری کوشش کی۔ ایک مرتبہ محاصرہ کو توڑ کر ان تک سپلائی پہنچائی۔ لیکن ساتھیوں میں جذبے کے فقدان، فرنگیوں کے بحری بیڑے کی مضبوطی، موسموں کی بے ہنگمی، سلطانی افواج میں بیماری پھیل جانے کی وجہ اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر وہ عکہ کو فرنگیوں سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں اس وقت تک کوئی مؤثر کارروائی نہ کر سکے اور جب وہ دشمن پر آخری ضرب لگانے کی تیاری کر چکے تھے۔ تو شہریانِ عکہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ خبر سُن کر انہیں سخت رنج ہُوا ـــ لیکن ان کا یہ دکھ اس وقت تو اور بھی بڑھ گیا۔ جب انھیں معلوم ہُوا کہ رچرڈ "شیر دل" نے معاہدۂ صلح کی خلاف ورزی کرتے ہُوئے نہ صرف اسیرانِ جنگ کو بلکہ سُفراء اور امرائے یرغمال کو بھی شہید کر دیا ہے۔ رچرڈ کی اس بدعہدی پر تبصرہ کرتے ہوئے لین پول لکھتا ہے کہ:

"پیشتر اس کے کہ خدا عیسائیوں کو چھوڑتا۔ عیسائیوں نے خدا کا دامن چھوڑ دیا"

سلطان یہ خبر سن کر تلملا اٹھے۔ لیکن ہیرلڈلیم کے الفاظ میں:

"سلطان صلاح الدین پر صد آفرین کہ اس عالی حوصلہ انسان نے صرف اعلانیہ جنگ میں دشمن سے بدلہ لیا"

اور یہ خونی ڈرامہ کھیلنے کے بعد بھی، جب رچرڈ نے سلطان سے بازوں اور سامانِ خوراک کی درخواست کی تو اسے ٹھکرایا نہیں بلکہ "شریف دشمن" ہونے کا ثبوت دیا، اس پر بھی تہذیب کے علم بردار فرنگیوں کو حیا نہیں آئی۔

عکہ میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کرنے کے بعد صلیبی لشکر ۲۵ راگست ۱۱۹۱ء کو عسقلان کی طرف بڑھا، سلطان نے مقابلہ کے بجائے انوکھا راستہ اختیار کیا کہ شہر گرا کر ہموار کر دیا۔ جب مسیحی لشکر وہاں پہنچا تو کھنڈرات اور شکستہ عمارتیں اس کا استقبال کر رہی تھیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عیسائی لشکر اس سے بہت بددل ہو گیا اور خود رچرڈ بھی دل چھوڑ بیٹھا۔ تاہم اس نے بیت المقدس پر حملہ کیا، لیکن ناکامی نے احساسِ محرومی کو اور بھی شدید کر دیا اور رچرڈ نے جنگ سے نجات پانے کے لیے سلطان کو ایک تجویز لکھ بھیجی جس میں

اس نے اپنی بہن کی شادی، سلطان کے بھائی الملک العادل سے کرنے کی پیش کش کی اور کہا۔ کہ اس کے بدلے سلطان بیت المقدس الملک العادل کو دے دے۔ سلطان نے اسے منظور کر لیا۔ لیکن یورپ میں کہرام مچ گیا۔ دنیائے عیسائیت نے اسے مسیحیت سے خارج کرنے کی دھمکی دے دی۔ نتیجتہً وہ ایک بار پھر نبرد آزمائے جنگ ہوا۔ اور بیت المقدس کی طرف بڑھا، مگر اس کی دیوار سے ٹکرا کر ناکام و نامراد لوٹ گیا۔ جس سے فوج میں مزید اضطراب پھیل گیا۔ اور مسیحی باہم دست و گریبان ہو گئے۔ رچرڈ نے پھر صلح کا ڈول ڈالا، اور ۲ ستمبر ۱۱۹۲ء کو سلطان صلاح الدین کے بھائی الملک العادل اور رچرڈ نے معاہدۂ صلح پر دستخط کیے۔ اس کے تحت یافا، لد، مجدل، یایا، قیساریہ، ارسوف، حیفا اور عکہ کو رچرڈ کا مقبوضہ اور عسقلان کو آزاد علاقہ قرار دیا گیا۔ طے پایا۔ کہ تین سال تک تمام عیسائی زائرین محصول ادا کیے بغیر بیت المقدس کی زیارت کر سکیں گے اور یوں پانچ سال کی مسلسل خون ریز لڑائیوں کے بعد تیسری جنگ صلیبی کا خاتمہ ہوا۔ اس جنگ میں یورپ کے لاکھوں آدمی، سینکڑوں نامور امراء و عمائد اور متعدد بادشاہ کام آئے اور بے اندازہ دولت برباد ہوئی۔ مچاڈ کے الفاظ میں:

"یورپ کی تمام مسلح طاقتوں نے عکا کی فتح اور عسقلان کی بربادی سے زیادہ کچھ حاصل نہیں کیا۔"

عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ عکا کے سامنے چھ لاکھ کروسیڈ کام آئے اور مشکل سے ایک لاکھ سپاہی گھروں کو لوٹ سکے۔ لین پول رقمطراز ہے کہ:

"جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین نہ تھی۔ ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب صلح ہوئی تو صور سے لے کر یافا تک بجز ایک پتلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا اور فرنگیوں کو اپنی جانی و مالی قربانیوں کے مقابلے میں جو کچھ حاصل ہوا وہ نہایت حقیر تھا۔ مورخین کے بقول یورپ کے ہر قریہ اور ہر گھر میں نالہ و ماتم بپا ہو گیا۔"

ہیرلڈ لیم لکھتا ہے، کہ

"برسوں کی خونریزی کے بعد بھی انھیں اپنے مقامات مقدسہ میں سے کسی پر بھی قبضہ نصیب نہ ہوا۔"

تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان صلاح الدین نے یہ لڑائی انتہائی نامساعد حالات میں لڑی تھی۔ اس کی فوج خود سر ہو گئی تھی اور بدو ہنگام پیکار عرب خیموں میں گھس آتے اور لوٹ مار کر کے بھاگ جاتے۔ آخر میں سلطان نے جب اپنی فوج کے مفسدہ پردازوں کو نکال کر از سرِ نو منظم کر لیا تھا۔ تو رچرڈ نے صلح کی پیش کش کر دی۔ سلطان مکمل اور فیصلہ کن فتح کا خواہاں تھا۔ اس نے بہاؤ الدین سے کہا تھا۔

"میں صلح کرنے سے ڈرتا ہوں۔ نہ جانے میری موت کے بعد حالات کیا ہوں؟"

لیکن اس کی فوج جنگ سے بیزار ہو چکی تھی اور آخر حالات نے اسے صلح پہ مجبور کر دیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ سلطان میدانِ جنگ میں بھی اپنے دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا یا اس پر اوچھا وار کرنا جائز نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ جب رچرڈ نے بیت المقدس پر قبضہ کے لیے یورش کی۔ سلطان نے اس کے نحیف و نزار گھوڑے کو دیکھا، تو اسے خوبصورت عربی گھوڑے بھجوا دیئے تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ اس کا گھوڑا کمزور تھا۔ ہیرلڈ لیم کا بیان ہے کہ:

"ہنگام فتح بھی سلطان ایسا ہی فراخ دل اور بُردبار رہا۔ جیسا کہ وہ اسنیلائے جنگ سے پہلے تھا۔ جب رچرڈ نے سلطان کو لکھا چونکہ فرانسیسی فریق معاہدہ نہیں۔ اس لیے انھیں یروشلم کی زیارت کی اجازت نہ دی جائے"

تو سلطان نے جواب دیا کہ:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے سب عیسائیوں کو اجازت بخش دی ہے، انہیں کیسے محروم کر دوں؟"

بشپ آف سالسبری نے منہ مانگی مراد پائی اور سلطان نے دو لاطینی پادریوں کو مزارِ مقدس میں مستقل قیام کی اجازت دے دی۔

رچرڈ ساحلِ شام سے روانہ ہو گیا تو سلطان حرمِ مقدس میں آیا۔ اس نے امیروں کو جمع کیا اور باری باری رخصت کر دیا۔ وہ گزشتہ کئی سال سے روزے نہیں رکھ سکا تھا چنانچہ القدس کے دورانِ قیام اس نے مسلسل روزے رکھے۔ اس سے صحت بگڑ گئی۔ طبیبِ خاص نے انھیں مجاہدۂ نفس سے باز رکھنے کی سخت کوشش کی، مگر سلطان نے اس سے اتفاق نہ کرتے ہوئے فرمایا:

"معلوم نہیں کہ آئندہ کیا ہو"

چنانچہ وہ مسلسل روزے رکھتے رہے اور اپنی قضا کا پورا کفارہ کر دیا۔ اسی قیام میں شہر پناہ کی مرمت کروائی۔ خندق کھدوائی۔ نئے اوقاف قائم کیے اور پھر بیت المقدس کا نظام امیر عز الدین جرد یک کے سپرد کر کے دمشق روانہ ہو گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس سال سلطان نے اپنی کمزوری اور نقاہت کے باوجود دمشق سے باہر آ کر حج حرمین سے لوٹنے والوں کا گرم جوشی اور تپاک سے استقبال کیا۔ وہ اگلے سال خود بھی حج پر جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن تین مارچ ۱۱۹۳ء کو ملک الناصر سلطان صلاح الدین نے وفات پائی۔ اور بازاروں میں سناٹا چھا گیا۔ آج وہ عظیم انسان موت کی آغوش میں سو گیا تھا۔ جس نے بیس سال تک دنیائے اسلام کی نہایت ثابت قدمی اور عالی حوصلگی سے قیادت کی تھی۔

شیخ ضیاء الدین ابو القاسم عبد المالک نے غسل دیا اور قلعہ دمشق کے باغ کی بارہ دری میں عصر کے وقت اسی مقام پر دفن کر دیا۔ جہاں انھوں نے انتقال کیا تھا، جو تلوار جہادوں میں ان کے زیب کمر تھی۔ ان کے برابر رکھ دی گئی۔ اور اسے ——————————

—— "وہ جنت میں اپنے ساتھ لے گیا۔"

سلطان نے ہر چیز خرچ کر دی تھی۔ حتیٰ کہ کفن دفن کے لیے قرض اٹھانا پڑا۔ اور لکڑیاں تک جو قبر میں لگیں قرض پر منگوائی گئیں۔ لوگوں پر اس قدر ہجوم الم تھا کہ ان کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ دفن کے بعد ہر شخص گھر چلا گیا اور ماتم میں مکان کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہا۔ صرف خاموشی اور سنسان سڑکیں بتاتی تھیں کہ لوگوں پر کس قدر عظیم صدمہ گزر رہا ہے۔ طبیب عبد اللطیف لکھتا ہے کہ:-

"اس کے علم میں صرف اسی ایک سلطان کی نظیر ہے۔ جس کے لیے واقعی رعایا نے ماتم کیا۔"

تاریخ بتاتی ہے کہ رچرڈ شیر دل، عکہ سے اس عزم کے ساتھ انگلستان واپس ہوا تھا کہ دس سال بعد آ کر بیت المقدس کو مسلمانوں سے نجات دلائے گا۔ لیکن اپنے عہد کی تکمیل کے لیے کبھی ساحلِ فلسطین کی طرف نہ لوٹ سکا۔ البتہ دنیائے مسیحیت میں یروشلم کو نجات دلانے کے پُرجوش نعرے بدستور گونجتے رہے۔ پوپ انوسنٹ ثالث نے صلیبیوں کے "جذبۂ جہاد" کو زندہ رکھا۔ جنگ کی تیاری ہوتی رہی۔ اور عشر جمع کیا جاتا رہا۔ پاپائے رُوم انوسنٹ ثالث آتش بیان اور ایک آفرین مقرر تھا۔ وہ کہتا:

"یروشلم کی رہائی مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔"

اور مسیحیوں کو بھڑکاتا۔ کہ مسلمانوں نے یروشلم پر قبضہ کے بعد "مسیحیت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔" دوشیزائیں سرزمین قدس کو آزاد کرانے کا حلف دینے والے صلیبیوں کو صلیبیں پیش کرتی پھرتیں۔ چنانچہ ۱۱۹۸ء سے ۱۲۰۴ء تک کے درمیانی عرصہ میں ہنری ششم نے ساحل فلسطین پر کئی حملے کئے۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر ۱۲۰۳ء میں کاؤنٹ بالڈون کی قیادت میں جرمنی، فرانس، یوراگوے، انگلستان، روم بلکہ سارے یورپ کی متحدہ فوجیں وینس سے روانہ ہوئیں لیکن بیت المقدس کے بجائے قسطنطنیہ پہنچیں اور اس پر قبضہ کر لیا۔ دنیائے مسیحیت کے جنون کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسی دوران صلیبی بچے ایک فرانسیسی لڑکے اتینے کی قیادت میں یروشلم کو "کافروں سے چھڑانے کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کی تعداد نوے ہزار تھی۔ یہ لشکر بارہ بارہ اور چودہ چودہ سال کے لڑکے اور لڑکیوں پر مشتمل تھا اور جس شہر سے بھی گزرتا لوگ اس سے نیک فال لیتے اور کہتے:

"اب یروشلم آزاد ہو جائے گا۔"

مگر مارسیلز سے آگے اس لشکر کو ساحل فلسطین پر پہنچانے میں کسی نے مدد نہ کی۔ چنانچہ اس کا انجام بہت ہولناک ہوا۔ حضرت عیسٰیؑ کے پرستاروں نے ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ بچیوں کی عصمتیں لوٹیں اور لڑکوں کو غلام بنا کر بیچ دیا۔ باقی ماندہ لٹے پٹے واپس اٹلی کی طرف لوٹ گئے۔ انہی ایام میں ایک اور لڑکے نکولس (جرمنی) نے ایک لشکر تیار کیا اور براہ اٹلی مہم لے کر روانہ ہوا۔ گو ان کا حشر اتنا برا نہیں ہوا۔ لیکن کچھ تو راستے میں مر گئے۔ دو لشکر مفقود الخبر ہو گئے۔ بہت سے گھروں کو لوٹ گئے اور باقی ماندہ نے اطالوی شہروں اور قصبوں میں ملازمت اختیار کر لی۔

ان تباہیوں اور ناکامیوں کے باوجود یورپ کا صلیبی جنون سرد نہ ہوا تھا۔ سارے یورپ میں صلیبی جنگوں کی تبلیغ زور شور سے جاری تھی۔ ۱۲۱۵ء میں پاپائے روم کی دعوت پر دنیائے مسیحیت کی ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں نئی صلیبی جنگ کے لیے جون ۱۲۱۷ء کی تاریخ مقرر کی گئی اور اس کے لیے زور شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ چنانچہ ایک صلیبی لشکر شاہ ہنگری اینڈرو کی قیادت میں ساحل عکہ پر لنگر انداز ہوا۔ اور اس کے بعد بھی مسلسل صلیبی ... آتے رہے ان کا مقابلہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے بھائی

الملک العادل سے تھا۔ جو اس وقت حاکم مصر تھا۔ اس کی عمر ستر سال ہو چکی تھی۔ وہ اکثر بیمار رہتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے مقابلہ کیا اور انھیں ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ الملک العادل تنہا عیسائیوں کے مقابلے پر تھا۔ نواحی مسلمان حاکموں یا خلیفہ عباسی کی طرف سے اسے کوئی کمک نہ پہنچی، ابھی جنگ جاری تھی کہ الملک العادل کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کا بیٹا الملک الکامل جانشین ہوا — سلطان دمشق نے حرم مقدس اور محراب داؤد کی دیواروں کے علاوہ بیت المقدس کی تمام فصیلیں گرا دی تھیں۔ تاکہ دشمن شہر کو کھلا پا کر زیادہ نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن صلیبی القدس تک نہ پہنچ سکے، البتہ دمیاط پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا خون بہایا اور مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کر دیا! اس کے بعد پچاس ہزار سے زیادہ صلیبی قاہرہ پر حملہ آور ہونے کے لیے بڑھے۔ الملک الکامل نے گھبرا کر صلح کی پیش کش کی اور دمیاط کی واگزاری کے عوض یروشلم عیسائیوں کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر عیسائی مُصر ہوئے کہ کرک اور ماؤنٹ ریال بھی ان کے حوالے کر دیا جائے۔ اس پر فریقین میں منصورہ کے قریب زبردست رن پڑا جس میں عیسائیوں کو سخت شکست ہوئی اور وہ دمیاط خالی کر کے صلح پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ الملک الکامل نے یافا سے نابلس تک کے علاقہ پر شاہ فریڈرک ثانی کا قبضہ تسلیم کر لیا اور دس سال کے لیے معاہدۂ صلح طے پایا — مگر فریڈرک ثانی نے سسلی پہنچتے ہی پادریوں کے خوف سے شرائطِ صلح سے انحراف کیا اور واپس جانے کا اعلان کر دیا۔ ۱۲۲۳ء میں فرنیٹینو (سسلی) کے مقام پر ایک نئی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں فریڈرک نے ۱۲۲۵ء میں کروسیڈ پر جانے کا حلف دیا، لیکن کچھ عرصہ تک حیلہ سازی سے ٹالتا رہا۔ آخر ستمبر ۱۲۲۸ء میں ساحلِ فلسطین کی طرف روانہ ہوا اور راستے میں بیمار پڑ جانے سے واپس لوٹ رہا تھا کہ پاپائے رُوم گریگوری نے اس کے خلاف "کفر" کا فتویٰ جاری کر کے اٹلی میں "مذہبی رسومات" معطل کر دیں۔ جس پر فریڈرک واپس فلسطین کی طرف روانہ ہو گیا اور قبرص سے ہوتا ہُوا ۴۵ ہزار سپاہیوں کے ساتھ عکہ میں لنگر انداز ہُوا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ الملک العادل نے اپنے بیٹوں کو خانہ جنگی سے محفوظ رکھنے کے لیے سلطنت ان میں تقسیم کر دی تھی۔ دمشق، قدس، طبریہ، اردن اور کرک کے علاقے اپنے بیٹے معظم عیسیٰ کو دئیے تھے۔ باپ کی وفات کے چند سال بعد تک تو الملک الکامل کے چاروں بھائیوں نے اسے مربی و سرپرست جانا۔ لیکن بعد میں وہ متحد نہ رہ سکے اور معظم باغی ہو گیا۔

فریڈرک ثانی جب ساحلِ سمندر پر اُترا تو قدس معظم کے قبضہ میں تھا۔ اس نے فرنگیوں کو قدس کے قریب نہ پہنچنے دیا لیکن اس کی موت پر الملک الکامل قدس پر قابض ہو گیا۔ ملک کامل کے ذہن میں دمشق پر، جو معظم عیسےٰ کے بیٹے داؤد کے قبضہ میں تھا، تصرف حاصل کرنے کا خیال ایسا مسلط تھا کہ اس نے حسب ذیل شرائط پر بیت المقدس فریڈرک ثانی کے حوالے کر دیا۔ کہ

ا : فرنگی بیت المقدس کی شہر پناہ دوبارہ تعمیر نہیں کریں گے۔
ب : مسلمانوں کے مقاماتِ مقدس قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ سے کسی قسم کا تعرض نہیں کریں گے۔
ج : بیت المقدس سے ساحل تک عیسائیوں کو راستہ دیدیا جائے گا۔

مصنف خطط الشام کا بیان ہے کہ کامل نے صرف دس سال کے لیے عارضی قبضہ دیا تھا۔ بہرحال کچھ بھی تھا۔ دنیائے اسلام میں کامل کے اس اقدام سے اس کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا اور یہی چھٹی صلیبی جنگ کہلاتی ہے۔

باہمی مناقشات

یہ وہ دور تھا کہ جب تاتاری، چنگیز خاں کی قیادت میں سیلاب کی طرح دنیا پر چھائے چلے جا رہے تھے، اور چنگیز، خوارزمیوں کا تعاقب کرتے ہوئے سرزمین فلسطین تک آ پہنچا تھا۔ فریڈرک سے الملک الکامل کا معاہدہ دس سال کے لیے ہوا تھا، لیکن مسلمان اور عیسائی دونوں اس پر خوش نہ تھے۔ چنانچہ "تھیبالٹ آف شمپین" ناروے کا بادشاہ ساحلِ فلسطین پر پہنچا اور لوٹ مار کر کے لوٹ گیا۔ جواباً الملک الکامل کے جانشین الملک الناصر نے آگے بڑھ کر بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں زمانۂ صلح میں معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عیسائیوں نے قلعہ بنا لیا تھا۔ ایک خوفناک تصادم کے بعد مسلمانوں کو فتح ہوئی اور قلعہ اور برج داؤد منہدم کر دیا گیا۔

۱۲۴۰ء کے موسم بہار میں رچرڈ ڈیوک آف کارلائل ساحل عکہ پر لنگر انداز ہوا۔ اور فرانسیسی فوج کو ساتھ لے کر جو اس کے لشکر سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ یافا کی طرف بڑھا۔ اس وقت سلاطین مصر و دمشق میں ایک بار پھر ٹھن گئی تھی۔ حتیٰ کہ اہل دمشق نے صلیبیوں سے

مل کر مصر پر حملہ کرنے کا فیصلہ اور اس کے عوض صلیبیوں کو مقاماتِ مقدسہ دینے کا وعدہ کیا۔ رچرڈ نے ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور سلطانِ مصر نے طبریہ، عسقلان، سقیف اور بیت المقدس صلیبیوں کو دے کر صلح کر لی۔ لیکن اس مرتبہ بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ صرف دو سال رہا۔ اور خوارزمیوں نے بیت المقدس کو بحال کرا لیا۔

خوارزمی وہ لوگ تھے، جو چنگیز خاں کے خوف سے خوارزم سے مصر بھاگ آئے تھے۔ اور خانہ بدوشی کی حالت میں دربدر پھر رہے تھے۔ سلطانِ مصر الملک الصالح نے انھیں پیش کش کی کہ اگر وہ صلیبیوں اور شامیوں کے خلاف اسے مدد دیں تو وہ انھیں آباد ہونے میں مدد دے گا۔ چنانچہ جب تاتاری غول بلادِ فلسطین و شام سے لوٹ گئے تو خوارزمی ملکِ مصر کی فوجوں کے تعاون سے بیت المقدس پر قابض ہو گئے۔ اس سلسلے میں جو جنگ ہوئی۔ اس میں سلطانِ دمشق اسمٰعیل نے عیسائیوں کا ساتھ دیا۔ جو صلاح الدین کا پوتا تھا۔ لیکن غزہ کے میدان میں ملک المصر کے رسالار رکن الدین بیبرس کی قیادت میں رومی اور شامی فوجوں کو زبردست شکست ہوئی اور خوارزمی آگے بڑھ کر بیت المقدس پر قابض ہو گئے اور بیت المقدس سلطانِ مصر کے تابع ہو گیا۔ اس خبر سے ایک بار پھر یورپ میں کہرام برپا ہو گیا۔

انوسنٹ رابع، پاپائے روم نے فرانس پہنچ کر صلیبی جہاد کی تبلیغ شروع کر دی اور القدس کے نام پر یورپ کے مختلف ممالک میں عشر وصول کیا جانے لگا۔ چنانچہ ۱۲۴۹ء میں صلیبی لشکر شاہِ فرانس لوئیس کی زیر کمان ساحلِ عکہ پر اترا۔ مسلمان اس وقت باہمی جنگوں اور نفاق کا شکار تھے۔ اس کی آمد سے دمیاط کے مسلمان اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ انھوں نے لڑے بغیر شہر خالی کر دیا۔ شاہِ فرانس دمیاط پر قبضہ کرنے کے بعد آگے بڑھا۔ اور مصری افواج ابھی دریائے نیل کے کنارے صلیبی لشکر سے نبرد آزما تھیں کہ سلطان مصر کا انتقال ہو گیا۔ ملک الصالح کا بیٹا توران شاہ دار السلطنت سے باہر تھا لیکن ملک الصالح کی بیوی شجرۃ الدر نے دانائی سے کام لیتے ہوئے ملک الصالح کی موت کو مخفی رکھا۔ اہم عہدہ داروں کو اعتماد میں لیا اور ملک الصالح کے نام سے احکام جاری ہوتے رہے۔ سلطان ملک الصالح کے انتقال کو چند ہی دن ہوئے تھے کہ شجرۃ الدر کو دریائے نیل کے کنارے سلطانی افواج کے پسپا ہونے کی خبر ملی، اس نے ملک بیبرس کو ایک لشکر کے ساتھ میدان میں بھیجا

جس کے پہنچتے ہی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا، ڈیڑھ ہزار صلیبی گرفتار ہوئے، ہزاروں قتل ہو گئے۔ صرف گنتی کے چند نفوس جان بچا کر دمیاط پہنچ سکے۔ اس شکست نے عیسائیوں کی کمر توڑ دی۔ شاہ لوئیس مسلمانوں کے حسب منشا شرائط کے دس سالہ معاہدہ صلح پر دستخط کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ معاہدہ کے بعد وہ چار سال تک ساحل عکہ پر مقیم رہ کر یروشلم کو آزاد کرانے کے لیے تڑپتا رہا۔ لیکن آخر کار ۱۲۵۴ء میں نامراد واپس لوٹ گیا اور اس طرح ایک اور صلیبی لہر نیل کی موجوں میں دم توڑ گئی۔ اس جنگ میں تیس ہزار عیسائی مارے گئے۔ ان کے ۳۲ جہاز مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ خود لوئیس معہ اپنے بھائی اور امرائے فوج کے مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوا۔ اور دس ہزار زر سرخ ادا کر کے رہائی حاصل کی۔

تاتاری اور فرنگی اتحاد

محرم ۶۵۶ھ / ۱۲۵۷ء میں مشرق سے اٹھنے والا تاتاری سیلاب ہلاکو خاں کی سرکردگی میں بغداد پہنچا۔ اس نے آخری عباسی خلیفہ مستعصم کو قالینوں میں لپٹا کر مروا دیا اور بغداد کی عظمت کو لوٹ لیا۔ ہیرلڈ لیم لکھتا ہے:

"صلیبیوں نے مملوک مصر کے ہاتھوں جو شکست فاش کھائی تھی۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے شاہ آرمینیا ہیتھوں اور شاہ انطاکیہ بوہمنڈ ششم نے ہلاکو خاں سے رابطہ پیدا کر کے اسے فلسطین پر حملہ کے لیے اکسایا اور خود بھی اپنے لشکر کے ساتھ عکہ پہنچ گئے۔ ہلاکو خاں نے اسی معاہدہ دوستی کے تحت دمشق کی کئی مساجد عیسائیوں کے سپرد کر دیں۔ جنھیں انھوں نے گرجوں میں تبدیل کر لیا۔ اس کے بعد ہلاکو خاں نے پیش قدمی کی۔ لیکن ۱۲۵۹ء میں وہ سرحد فلسطین ہی تک پہنچ پایا تھا کہ منگو خاں خاقان اعظم کی موت کی خبر ملی اور وہ لوٹنے پر مجبور ہو گیا۔ البتہ جاتے ہوئے کتبغا کی نگرانی میں دس ہزار تاتاری فوج صلیبیوں کی مدد کے لیے چھوڑ گیا۔ کتبغا یروشلم سے ہوتا ہوا آگے بڑھا۔ مگر غزہ کے میدان میں الملک الظاہر بیبرس نے عیسائیوں اور تاتاریوں کے متحدہ لشکر کو زبردست شکست دی، اس کے بعد تاتاری بلاد فلسطین و شام سے نکل گئے۔ بیبرس آگے بڑھ کر دمشق پر قابض ہو گیا۔ اور اس کا ستارہ چمکنے لگا۔ یہ ۱۲۶۰ء کا

واقعہ ہے۔"

مملوک مصر

الملک الظاہر بیبرس الملک العادل کے پوتے الملک الصالح حاکمِ مصر کا مملوک تھا۔ ملک الصالح کا انتقال ہوا، تو صلیبی قاہرہ کے قریب منصورہ میں مصری فوجوں سے نبرد آزما تھے۔ اس نازک موقعہ پر ملک الصالح کی بیوی شجرۃ الدر نے صورتِ حال کو دانائی اور زیرکی سے سنبھالے رکھا۔ جب تک اُمراء سے ملک الصالح کے بیٹے توران شاہ کی بیعت نہ لے لی۔ ملک الصالح کی موت کو ظاہر نہ ہونے دیا، لیکن توران شاہ نے شجرۃ الدر سے بدسلوکی اور اپنی بحریہ کی تحقیر و تذلیل کی۔ تو اُمراء نے اسے قتل کر کے شجرۃ الدر کو تخت نشین کر دیا۔ جس نے اپنے سپہ سالار معزّ الدین سے شادی کر لی، لیکن معز الدین بھی ۶۵۵ھ میں قتل کر دیا گیا۔ اور اس کے بیٹے نور الدین کو تخت نشین کیا گیا۔ اس سارے عرصہ میں ملک الظاہر جو ایک جرنیل تھا۔ تمام حاکموں کی پوری اطاعت کی اور اپنی جنگی قابلیت کی بنا پر ان کا منظورِ نظر بنا رہا۔ لیکن جب نور الدین کے بعد سیف الدین قطز تخت نشین ہوا تو اس نے قطز کو معزول کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور ۱۲۶۳ء میں بامر اللہ کو خلیفہ قرار دے کر مصر میں عباسی خلافت کو زندہ کیا۔

غزہ کے میدان میں شکست (۱۲۶۰ء) کھانے کے بعد بھی صلیبیوں کے پاس انطاکیہ سے حصن الاکراد تک ساحلِ سمندر پر تیس قلعے بچ گئے تھے۔ ملک الظاہر اندرونی انتظامات و اصلاحات سے فارغ ہو چکا تو اس نے صلیبیوں پر کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ الملک الظاہر کو بھی سلطان صلاح الدین کی طرح ہر وقت جہاد کا شوق رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے پہلے ہی سال (۱۲۶۵ء میں) صلیبیوں سے قیصریہ، عثلیث، حیفہ اور ارسوف کے قلعے چھین لیے اور دوسرے سال یافہ، بلفورٹ انطاکیہ اور بعض دوسرے قلعوں پر قابض ہو گیا۔ یہ خبر جب یورپ پہنچی تو شاہ فرانس لوئیس نہم نے زبردست جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن جیسے ہی وہ ۱۲۷۰ء میں ساحلِ تیونس پر اُترا۔ اسے اور اس کی افواج کو طاعون نے گھیر لیا۔ شاہِ فرانس اسی مرض سے مر گیا۔ اس مہم میں شاہ انگلستان ایڈورڈ اول بھی شریک تھا۔ وہ عکہ پہنچ چکا تھا۔ کہ اسے شاہِ فرانس

کی موت کی خبر ملی جس سے وہ بددل ہو کر واپس لوٹ گیا۔

الملک الظاہر بیبرس نے ۱۲۷۱ء میں حصن الاکراد اور عکہ کے سامنے نائٹ فورٹ کے قلعے بھی فتح کر لیے اور عیسائی حملہ آوروں کے غرور کو توڑنے کے لیے آرمینیا اور ایشیائے کوچک کی طرف بڑھا۔ وہ ایشیائے کوچک میں مصروفِ جنگ تھا کہ ۱۲۷۵ء میں منگول پھر دریائے فرات کے اُس پار سے حملہ آور ہوئے، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اور ملک الظاہر کے ہاتھوں انھیں دوبارہ ہزیمت اٹھانا پڑی۔ ملک الظاہر اس جنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔ وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور ۱۲۷۷ء میں انتقال کر گیا۔ اس کا بیٹا تخت نشین ہوا لیکن سلطان قلاؤن نے اسے علیحدہ کر کے خود سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

ترکانِ عثمان

ملک الظاہر کی آخری جنگوں میں منگولوں کے خلاف ایشیائے کوچک کے ترکانِ عثمان نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا۔ نتیجۃً قدرت نے انھیں ایشیائے کوچک کی سلطنت بخش دی۔ دوسری طرف ایران میں ال خانی سردار اباقا خاں نے حکومت قائم کر لی۔ سلطان قلاؤن کے عہد میں ال خانی سردار اباقا خان نے یروشلم کی طرف پیش قدمی کی۔ اور عیسائیوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ نتیجۃً جارجیا اور آرمینیا کے تیس ہزار عیسائی اس کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ شامی عیسائی بھی رفیقِ سفر ہو گئے اور یہ لشکر ۱۲۸۱ء میں وادیٔ حما میں نمودار ہوا۔ حمص کے قریب سلطان قلاؤن کی فوجوں سے معرکہ آرائی ہوئی۔ لیکن ایک خوں ریز جنگ کے بعد اباقا خاں شکست کھا کر بھاگ گیا۔ سلطان قلاؤن کے الفاظ میں اگر

"فرشتے مدد نہ کرتے تو فتح ناممکن تھی ۔۔۔"

اباقا خاں کی واپسی کے بعد صلیبیوں کی شامت آ گئی۔ اور ۱۲۸۵ء میں سلطان نے المرقب اور طرابلس کے عیسائی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ عکہ کی طرف پیش قدمی جاری تھی کہ سلطان کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کا بیٹا الملک الجلیل جانشین ہوا۔ الملک الجلیل نے باپ کی مہم کو زور شور سے جاری رکھا اور وسط مئی ۱۲۸۵ء میں عکہ پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔ محصور صلیبیوں نے پہلے تو مقابلہ کیا، لیکن جب کامیابی کی کوئی امید نہ رہی تو جہازوں میں فرار ہونے لگے جن

میں سے کئی جہاز ساحل کے قریب ہی غرقاب ہو گئے۔ کئی مسلمانوں کے ہاتھ لگے اور عکہ فتح ہو گیا۔ اس جنگ میں تیس ہزار عیسائی مارے گئے۔ صلیبیوں سے عکہ کیا خالی ہوا کہ فلسطین عیسائیوں سے خالی ہونے لگا۔

مارچ ۱۲۹۱ء میں پوپ نکولس نے اطالوی بیڑا بھیجا اور قبرص سے شاہ ہنری ساحل فلسطین کی طرف بڑھا مگر دونوں ناکام لوٹے۔ اس مرتبہ صلیبیوں کو ال خان ارغون منگول کا تعاون حاصل تھا، لیکن اس کے انتقال کے ساتھ ہی عیسائیوں کے رہے سہے حوصلے پست ہو گئے اور وہ ساحل فلسطین پر عثلیث اور طرطوس کے قلعے بھی مسلمانوں کے حوالے کر کے لوٹنے پر مجبور ہو گئے۔

۱۲۹۹ء میں منگول تیسری مرتبہ ال خان غزن کی قیادت میں دریائے فرات کو عبور کر کے حملہ آور ہوئے اور مملوکوں کو شکست دے کر ۱۳۰۰ء میں دمشق پہنچ گئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ال خان غزن کو بھی صلیبیوں نے بلایا تھا۔ وہ غزہ سے حیدآتک قابض ہو گیا تھا۔ لیکن صلیبی نہ پہنچ سکے اور وہ مایوس ہو کر فروری ۱۳۰۱ء میں مفتوحہ علاقے خالی کر کے لوٹ گیا۔ ۱۳۰۴ء میں ال خان غزن مر گیا۔ اور اس کا جانشین مسلمان ہو گیا۔ یوں منگول خطرے سے بیت المقدس کو مستقل طور پر نجات مل گئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بار بار کی شکستوں سے صلیبیوں کے حوصلے بہت پست ہو چکے تھے۔ لیکن بیت المقدس کو "کافروں" سے نجات دلانے کی آرزو باقی تھی۔ چنانچہ ۱۲۹۱ء سے ۱۳۰۱ء کے درمیانی عرصہ میں مختلف ملکوں میں صلیبی "جہاد" کے نعرے گونجتے رہے۔ شاہِ انگلستان ایڈورڈ ثانی اور شاہِ فرانس فلپ دی فیئر نے صلیبی "جہاد" کے لیے عشر بھی وصول کیا۔ اور نئے منصوبے بھی بنائے۔ مگر وہ جنگ پر نہ جا سکے۔ دریں اثنا ترکوں نے دریائے والگا سے ایشیائے کوچک تک اور دریائے فرات سے دریائے نیل تک اپنی دفاعی حیثیت مضبوط کر لی۔ ہیڑلیم انتہائی مایوسی کے عالم میں لکھتا ہے:

> "ہم یروشلم کی صلیبی ریاست کو بحال نہ کر سکے، جس کے لیے صدیوں تک ہمارے آباؤ اجداد برسرپیکار رہے، اور آج بھی وہ مزارِ مسیح کے سائے تلے محوِ خواب ہیں۔"

۶۷-۱۳۶۵ء پیٹر آف سائپرس، وارنا، نائیکوپولس وغیرہ مجاہد بن کر مصر و شام

میں لڑتے رہے، لیکن کامیاب نہ ہوئے، اس کے بعد بھی بہت سے پوپوں نے مذہبی جنگ کی تبلیغ کی۔ مگر یورپ میں کہیں کوئی حرارت پیدا نہ ہوئی۔ البتہ ۱۴۵۳ء میں جب محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا، تو پیو ثانی نے قسطنطنیہ واپس لینے کے لیے اپنی جنگ کو مذہبی رنگ دے دیا۔ نتیجتہً یورپ کے صلیبی اس سے آملے۔ لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوسکا اور یوں تین سو سال تک ہلالی پرچم کو سرنگوں کرنے کی صلیبی جدوجہد دم توڑ گئی اور سلیمان اعظم اول نے تو ان کے سارے زعم کو ختم کر دیا۔

۱۵۱۶ء میں ایشیائے کوچک کے ترکان عثمانی نے مصر و فلسطین پر قبضہ کیا تو بیت المقدس بھی ترکی کے زیر اقتدار چلا گیا۔ اس وقت سلطان سلیم اول ترکمان عثمانی کا فائد تھا۔ پھر ایک مختصر سے عرصہ کے علاوہ، جس میں نپولین بونا پورٹ نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ مقدس شہر پہلی جنگ عظیم تک ترک سلطنت کے زیر انصرام رہا۔ ترک دورِ حکومت میں بیت المقدس اپنی شان و عظمت کے لحاظ سے عروج پر پہنچ گیا تھا۔

۱۵۳۶ء میں سلطان سلیمان اعظم نے شہر کی موجودہ فصیل کی تعمیر شروع کرائی، جو سات سال کے عرصہ میں مکمل ہوئی، یہ فصیل چھوٹی اینٹوں سے بنائی گئی، اور کہا جاتا ہے کہ فصیل کی تعمیر کی نگرانی دو بھائیوں کے سپرد تھی، جنہوں نے باب الخلیل (یافہ گیٹ) سے مختلف سمتوں کی طرف تعمیر کے کام کا آغاز کر دیا۔ اور اس کی تکمیل پر سات سال بعد اُن کی ملاقات سینٹ سٹیفن گیٹ پر ہوئی، فصیل کا گھیر اڑھائی میل ہے اور پیمائش وقتی کے لحاظ سے ۱۲۳۵۰ فٹ لمبی تھی۔

جولائی ۱۸۱۷ء میں ترکی نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ (HOLY SEPULCHER) مزارِ مقدس شاہِ فرانس کی تحویل میں دے دیا۔ ۱۸۰۸ء میں اس گرجا میں آتشزنی کی واردات ہوئی۔ جو بعض وقائع نویسوں کے مطابق یہودیوں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ ۱۸۳۱ء میں برطانوی وزیر اعظم لارڈ ڈسرائیلی بیت المقدس آیا۔ اور اس کے اسی دورہ مشرق وسطیٰ کے بعد اس علاقے میں وہ فتنے جنم لینے لگے۔ جو بعد میں خلافت عثمانیہ کی موت کا باعث ہوئے۔

۲۰ دسمبر ۱۸۳۲ء کو خدیو مصر محمد علی پاشا کے بیٹے ابراہیم نے قونیہ میں ترک فوجوں کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ مگر مئی ۱۸۳۳ء کو ایک صلحنامہ کے ذریعہ محمد علی پاشا نے شام و فلسطین اور مصر کی گورنری کے عوض سلاطین ترکی کو خراج ادا کرنا

منظور کیا۔ ۱۸۳۹ء میں پہلا برطانوی قونصل بیت المقدس آیا۔ اس سے ایک سال بعد فرانس کی شہ پر محمد علی نے خلافتِ عثمانی سے بغاوت کر دی، لیکن شکست کھا کر شام و فلسطین سے ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ البتہ فرانس نے مقامی عیسائیوں کے تنازعات کا تصفیہ کرنے کا حق حاصل کر لیا۔ مگر چند ہی سال بعد لاطینی اور یونانی عیسائیوں میں شدید لڑائی ہوئی۔ فرانس نے لاطینیوں کی اور روس نے یونانیوں کی حمایت کی، بعض مؤرخین اسی حادثہ کو جنگِ کریمیا کا سبب قرار دیتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں روس کو سلطنتِ عثمانیہ میں مقیم عیسائی رعایا کا محافظ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لیکن بالآخر ۱۸۵۲ء کو سلطانِ ترکی نے اپنی غیر مسلم رعایا کی حفاظت کا ذمہ اپنے سر لے لیا اور اپریل ۱۸۵۶ء میں ہتی ہمائیوں یعنی فرمانِ شاہی کے ذریعہ مسلم و غیر مسلم رعایا کے حقوق برابر قرار دیئے گئے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو حرم شریف میں آنے کی اجازت دے دی، لیکن وہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

یہودی نوآبادیاں

تاریخ بتاتی ہے کہ اس اجازت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہودیوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کرنا شروع کر دیں اور یہی دور ہے کہ جب عالمی صیہونیت نے اپنی سازشوں کا آغاز کیا۔ المیہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ اقتدار میں عیسائیوں اور یہودیوں سے ہمیشہ فراخدلانہ سلوک کیا ہے، لیکن ان اقوام نے اس حسنِ سلوک کے بدلے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کی ہیں۔ فلسطین بھی ان کی سازشوں سے محفوظ نہ رہا اُن کا ذکر اگلے باب میں کیا گیا ہے۔

۱۸۵۹ء میں سلطان محمود ثانی نے فلسطین کا دورہ کیا تو وہ بیت المقدس بھی آئے انھوں نے مقدس مقامات کی زیارت کی اور یہودیوں کی ان شکایات کا جائزہ لیا جو وہ اکثر سلطانی عمال کے بارے میں کرتے رہتے تھے۔ لیکن تمام شکایات بے بنیاد اور غلط ثابت ہوئیں۔

۱۸۶۲ء میں ایڈورڈ ہفتم زیارت کے لیے آیا۔ ۱۸۹۶ء میں بیت المقدس میں امریکی مشن نے اندھوں کا سکول جاری کیا اور یہ پہلا غیر ملکی ادارہ تھا۔ اسی دور میں یہودیوں

نے سلطان عبدالحمید کو پیش کش کی کہ فلسطین میں یہودیوں کو اراضی خریدنے کی اجازت دے دی جائے۔ تو وہ نہ صرف ترکی کے تمام قرضے ادا کر دیں گے بلکہ آئندہ بھی اسے ضرورت کے مطابق مالی امداد دیں گے۔ لیکن غیور و جسور سلطان عبدالحمید نے صیہونی رہنما ہرزل کو کہلوا بھیجا کہ وہ اس خیال کو ذہن سے نکال دے۔" جب تک عثمانی سلطنت کا ایک غیور فرد بھی زندہ ہے، اس کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔ یہودی اگر ساری دولت بھی دیں، تو میں اس کے عوض فلسطین کی ایک انچ زمین بھی، جو کسی مسلمان کے تصرف میں ہے، دینے کے لیے تیار نہیں ۔" اس جواب کے بعد صیہونیوں نے اپنی تمام توجہ سلطان مرحوم کے ذاتی دوست قیصر جرمنی ولیم پر مرکوز کر دی۔ اور اسے زبردست مالی و سیاسی امداد کی پیشکش کے عوض سلطان کو اس امر پر رضامند کرنے کے لیے کہا۔ قیصر ولیم ثانی نے اپنے دورۂ ترکی کے دوران اس کی کوشش بھی کی۔ مگر سلطان اپنے موقف سے نہ ہٹے۔

آخری صلیبی جنگ

تاریخ بتاتی ہے کہ ہرزل کے پیامبر نے سلطان کا مسکت جواب سنا، تو اس نے مسلمانوں کو" بُرے انجام" کی دھمکی دی تھی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۰۹ء میں وہ لمحہ آ پہنچا جب انجمن اتحاد و ترقی نے سلطان کو معزول کر کے محمد ارشاد کو خلیفہ بنایا ۔ اس کے دور میں خلافتِ ترکی نے نیا آئین دے کر شام و فلسطین کی خود مختاری تسلیم کر لی۔ لیکن دریں اثنا برطانیہ، ترکوں کے زیر اقتدار عرب علاقوں میں لارنس آف عریبیہ کے ذریعے اپنا اثر و رسوخ قائم کر چکا تھا۔ اور اس نے یہودیوں کو بھی گانٹھ لیا تھا، اس کے نتیجہ میں عربوں نے ہر جگہ ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور پہلی جنگِ عظیم کے دوران اس صورتِ حال سے پریشان ہو کر ۸ اور ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کی درمیانی رات ترکوں نے بیت المقدس خالی کر دیا۔ ۱۰ دسمبر کی صبح جنرل شیا (SHEA) افسر کمانڈنگ نمبر ۶۰ ڈویژن بیت المقدس پہنچا۔ ترکوں نے دوپہر کے وقت شہر کی چابیاں اس کے حوالے کر دیں، ۱۱ دسمبر کو جنرل ایلن بی مصری اور فلسطینی افواج کے ساتھ یافہ گیٹ سے بیت المقدس میں داخل ہوا اور صلاح الدین ایوبی کا شہر مقدس ایک بار پھر عیسائیوں کے قدموں تلے آ گیا اور اس مرتبہ مصری اور فلسطینی ان کی مدد کر رہے تھے (انا للہ وانا الیہ راجعون) برطانوی ذمہ داران سلطنت نے اسے آخری صلیبی

محاربہ قرار دیا ہے۔ اسے تیرھویں صلیبی جنگ کہا جا سکتا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹینکا میں ہے کہ ایلن بائی کے داخلۂ یروشلم سے پہلے ۴۰۲۵ برس تک یروشلم نے کبھی کسی عیسائی فاتح یا برطانوی سپاہی کو نہیں دیکھا تھا۔ برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل نے اپنی تاریخ "عظیم جنگ" (THE GREAT WAR) میں لکھا ہے۔ کہ

"۸ ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو ترک بیت المقدس سے دست بردار ہو گئے۔

ان کے چار سو سالہ منحوس دور کے بعد برطانوی کمانڈر انچیف باشندگان بیت المقدس کے واہ واہ اور مرحبا کے نعروں کی گونج میں شہر میں داخل ہوا"

مسٹر نلسن تاریخ جنگ جلد ۲۳ کے صفحات ۱۳۵-۱۳۶ پر فرطِ انبساط میں یوں رقمطراز ہے۔ کہ :

"آخری صلیبی جنگ اب اپنے عروج پر تھی اور اگر سینٹ لوئیس اور رچرڈ شاہِ انگلستان اس حیرت افزا افواج کو دیکھتے تو اُن کی روحیں متحیر ہو جاتیں، کیونکہ اس کا بہت ہی قلیل حصہ مغربی اقوام (یورپین) پر مشتمل تھا۔ الجیری اور ہندی مسلمان، عرب قبائل، ہندوستان کے ہزارہا فرقوں کے ماننے والے افریقی حبشی اور یہودی افواج ان لوگوں میں شامل تھیں۔ جنھوں نے نصاریٰ کے مقدس شہر کو آزاد کرایا۔"

وائے حسرت! وہ مسلمان، جنھیں بیت المقدس کی حفاظت کرنا تھی، نصاریٰ و یہود سے مل گئے تھے۔ اعداد و شمار کے مطابق جنگِ عظیم اول میں شام و عراق اور فلسطین وغیرہ میں مسلمان سپاہی برطانوی فوج کی کل تعداد کا ۵/۲ تھے۔

مسٹر جارج ٹاؤن سنڈ وارنر اپنی کتاب "گراؤنڈ ورک آف برٹش ہسٹری" کے صفحہ ۷۵۱ پر لکھتا ہے۔ کہ :

"بیت المقدس ۱۱۸۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ایک عیسائی ملک کے قبضہ و تصرف میں آیا۔ جنرل ایلن بائی بڑے دن (کرسمس) سے ایک پندرھواڑہ قبل باضابطہ طور پر بیت المقدس میں داخل ہوا"

یہی مصنف صفحہ ۷۵ پر بتاتا ہے کہ :-

"قریب قریب اسی وقت جنرل ایلن بائی نے فلسطین میں شاندار

پیش قدمی کی، اور پیش قدمی کے انصرام کا سہرا خاص طور پہ ہندوستانی افواج کے سر ہے۔"

مسٹر لیول ٹامسن اپنی کتاب "عرب میں لارنس کے ہمراہ" کے صفحہ ۸۰ پر احسان جتاتے ہیں کہ:

"ایلن بائی نے فلسطین کو آزاد کرایا۔ جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس سرزمین ہے۔ لارنس نے عرب کو آزادی دلوائی۔ جو لکھو کھا مسلمانوں کی متبرک سرزمین ہے۔"

برطانوی وزیر اعظم لائیڈ جارج پارلیمنٹ میں چیخے:

"آج ہم نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لے لیا ہے۔"

بیت المقدس کی فتح کے بعد جنرل ایلن بی کو حکومتِ برطانیہ نے علاوہ دیگر اعزازات کے پچاس ہزار پونڈ انعام دیا۔ اور جارج پنجم نے ان کی "خدمات" کا بطور خاص اعتراف کیا۔

ایک مستند راوی جس کا حوالہ جلال الدین سیوطیؒ نے دیا ہے، کہتا ہے کہ بیت المقدس حضرت عمرؓ کی فتح سے ۴۹۱ھ تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ اس سال عیسائیوں نے اسے فتح کیا۔ اور مسلسل سات یوم تک مسلمانوں کی بڑی تعداد کو بے دریغ تہ تیغ کر کے جامِ شہادت پلایا۔ انھوں نے مسجد اقصیٰ میں ستّر ہزار مسلمانوں کو شہید کیا۔ اور صخرہ سے سونے چاندی کے برتن اور بے شمار مال و دولت جو محفوظ صندوقوں میں بند تھا، نکال کر لے گئے لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی کو خدائے تعالیٰ نے بیت المقدس کی مکمل آزادی کے لیے مامور کیا۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ شیر دل اور دہکتی ہوئی آگ کا پتلا تھا ـــــ مگر آہ! بیت المقدس پھر غلام ہو گیا۔ اور اس کا سقوط ترکی کے زوال میں معاون ہوا۔

تاریخ اس بات پر شاہد عادل ہے کہ ترکوں کے عہد میں اس شہر نے زبردست ترقی کی اور اس مقدس شہر میں مکروہات پہ مکمل پابندی عائد رہی۔ "مقدس یروشلم" کا امریکی مصنف ایڈورن ایس ولیس جو انیسویں صدی کے آخری سالوں میں یروشلم میں امریکی کونسلیٹ کے طور پہ رہ چکا ہے ـــ اس دور کے بیت المقدس کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"قدیم شہر ۲۰۹ ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے، جس میں مسجد بھی شامل ہے

شہر کا محلِ وقوع ہیرود اور اس کے جانشینوں کے دور سے مختلف ہے۔ گلیاں تنگ اور عمارتیں قریب قریب واقع ہیں۔ بعض مقامات پر قدیم محراب اور عمارتیں اب تک قائم ہیں۔ لیکن انسان ان کے قریب سے بے خطر گزر جاتا ہے۔ وہ اہم شاہراہیں، جن کا تذکرہ ضروری ہے۔ ان میں سے ایک واڈ سٹریٹ، یافہ گیٹ سے مشرق کی طرف چلتی ہوئی، شہر کے دوسری طرف واقع سینٹ سٹیفن گیٹ سے جا ملی ہے۔ کرسچین سٹریٹ واڈ سٹریٹ سے کلیسائے تشور تک جاتی ہے۔ اور ایک تیسری گلی شمال کے باب دمشق کو جنوب کے صیہون گیٹ سے ملاتی ہے۔ قدیم شہر میں بہت کم جگہ خالی نظر آئے گی۔ گو یہ شہر ۲۰۹ ۱/۲ ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے لیکن ۳۵۔ ایکڑ رقبہ تو مسجد اقصیٰ نے گھیر رکھا ہے۔ اتنی ہی جگہ فوجی بیرکوں سے گھری ہوئی ہے اور اس سے دگنی جگہ مختلف مذاہب کے اوقاف، مساجد، گرجا گھروں اور دوسری عمارتوں نے گھیری ہوئی ہے۔ اور یہ بطور رہائش گاہ کے استعمال نہیں ہوتی۔ اس لیے بلا جھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۵۵ ہزار آدمی ایک سو ایکڑ میں آباد ہیں۔ اس کے بازاروں میں ہر رنگ و نسل اور ہر زبان و مذہب کے لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

اس شہر کا دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ جدھر نگاہ اٹھاؤ مینار ہی مینار نظر آتے ہیں۔ کوئی محلہ یا گلی ایسی نہیں، جہاں مسجد یا گرجا نہ ہو، مسجد اقصیٰ کے علاوہ شہر میں ۳۷۔ مساجد اور ہیں اور چھوٹے بڑے گرجوں اور راہب خانوں کی تعداد ۴۰ کے لگ بھگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر گھنٹہ بعد شہر کی فضاء عبادت کے لیے بلاتی ہوئی گھنٹیوں سے گونج اٹھتی ہے۔ اس کے علاوہ مساجد کے بلند میناروں سے دن میں پانچ مرتبہ اذان کی صدا، مسلمانوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتی سنائی پڑتی ہے۔

شہر کے انتظام کے لیے سلطان ترکی نے پاشا کو مقرر کر رکھا ہے، جس کی انتظامی کونسل ۹ مسلم، ایک یہودی اور ایک عیسائی رکن پر مشتمل ہے۔ ہر بڑی مملکت کے کونسلیٹ شہر میں موجود ہیں۔ ایسے تمام امور میں جن میں فریقین غیر ملکی ہوں، مقدمہ کی سماعت

مسئول الیہ کے ملک کا کونسلیٹ کرتا ہے لیکن اگر ایک فریقِ مقدمہ ترک ہو تو مقدمہ کی سماعت مقامی عدالت کرتی ہے۔

شہر میں کسی نمائش کے لیے جگہ نہیں نہ کوئی اوپیرا ہوتا ہے۔ نہ کھیل یا کنسرٹ کی اجازت ملتی ہے۔ بازار غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی بند ہو جاتے ہیں۔ مقامی لوگ جلدی سونے اور طلوعِ آفتاب سے قبل جاگ اٹھنے کے عادی ہیں۔ دورِ جدید کی تہذیبی ترقی نے شہر پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ سرِ شام ہی شہر کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔"

اس کے بعد مصنف نئے یروشلم کا ذکر کرتا ہے۔ جو فصیلوں کے باہر آباد ہو رہا تھا۔ لکھتا ہے کہ قدیم شہر کی دیواروں سے باہر شمال اور مغرب میں گزشتہ چند سالوں سے ایک نیا شہر جنم لے رہا ہے۔ اس جدید نئے شہر نے مختصر عرصہ میں زبردست ترقی کی ہے۔ اور یہ گزشتہ پچیس برس میں آباد ہوا ہے۔ نئے شہر میں یہودیوں کی کئی کالونیاں ہیں۔ اور ان میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ گو فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری پر پابندی ہے۔ اس کے باوجود وہ مسلسل آ رہے ہیں۔

۱۸۳۸ء میں ڈاکٹر رابن سن کے مطابق شہر کی آبادی ۱۱ ہزار تھی۔ جن میں سے تین ہزار یہودی تھے۔ ۱۸۴۹ء میں ڈاکٹر شلٹ اور جارج ولیم کے دعوے کے مطابق یہ ۱۲۰۰۰ ہو گئی۔ بعد کے ۴۵ سال میں ان کی آبادی میں دس گنا اضافہ ہوا ہے۔ اور وہ اپنے آبائی شہر کو پھر سے یہودی شہر بنانے کی فکر میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔"

برطانوی انتداب

ولیس کی یہ کتاب ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی اور اس میں واضح طور پہ یہودیوں کے عزائم سامنے آ چکے تھے۔ اس کے باوجود عربوں نے حالات کے رُخ کو نہ پہچانا اور اپنی سادہ لوحی میں لارنس کا شکار ہو گئے۔ تاریخ بتاتی ہے برطانیہ نے کو اس جنگ میں دجل و فریب سے اپنے ساتھ ملایا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد ان پر ان کی مرضی کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی۔ لیکن ۱۹۲۰ء کی صلح کانفرنس میں فلسطین کو برطانیہ کے زیرِ انتداب علاقہ قرار دے دیا گیا۔ اور سر رابرٹ سیموئیل پہلا ہائی کمشنر مقرر ہو کر بیت المقدس پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی صیہونی عزائم تکمیل پانے لگے۔ ایسے

شواہد موجود ہیں کہ سر رابرٹ سموئیل جو خود یہودی تھا نے کھل کر صیہونیت کا ساتھ دیا۔ اس کی اس روش پر تنقید کرتے ہوئے برطانیہ کے ایک منصف مزاج مصنف نے لکھا تھا:

"اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ دنیا سر رابرٹ سیموئیل کو برطانوی ہائی کمشنر کے طور پر بیت المقدس بھیجنے کے پس منظر میں کارفرما سازشوں سے بے خبر ہے، تو یہ اُس کی حماقت ہے، حقیقت یہ ہے کہ سیموئیل کی تقرری نے برطانیہ کی حیثیت کو نازک بنا دیا ہے"۔۔۔

بہرحال اس کی آمد کے ساتھ ہی فلسطین میں یہودیوں کے داخلہ کی رفتار تیز تر ہو گئی، اور وہ برطانیہ کی شہ پر خوب کھل کھیلے۔ آخر ۱۹۳۶ء کے موسم بہار میں عرب ہائی کمیٹی قائم ہوئی۔ جس کی اپیل پر برطانیہ کے مسلم کش رویہ اور یہودی داخلہ کے خلاف چھ ماہ تک یادگار زنانہ ہڑتال رہی۔ اس کمیٹی کے صدر یروشلم کے مفتئ اعظم الحاج امین الحسینی آفندی تھے۔ حکومتِ برطانیہ نے مفتی اعظم کی گرفتاری کے لیے وارنٹ جاری کر دیئے۔ آپ مسجدِ اقصیٰ میں معتکف ہو گئے۔ برطانوی سپاہیوں نے مسجد کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن مفتئ اعظم بھیس بدل کر اس محاصرہ سے نکلے اور شام سے ہوتے ہوئے لبنان جا پہنچے۔ اسی سال یہودیوں نے صیہونی ایجنسی قائم کر کے حکومتِ برطانیہ کے تعاون سے اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ یہودی فلسطین کو صیہونی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ نتیجتہً ملک گیر فسادات شروع ہو گئے۔ نتیجتہً بیت المقدس کی گلیاں متعدد بار انسانی خون سے لالہ زار ہوئیں اور برطانیہ کی حمایت سے یہودی دن بدن زور پکڑتے گئے۔

۱۹۲۸ء میں الحاج محمد الیاس برنی، اپنے سفر نامہ صراط الحمید میں لکھتے ہیں۔ کہ قدس میں یہودیوں کے نئے نئے محلے بن رہے ہیں۔ جبل زیتون پر یہودیوں کی یونیورسٹی زیرِ تعمیر ہے۔ انگریزوں نے عربی کے پہلو بہ پہلو عبرانی کو سرکاری زبان قرار دیا ہے اور ریلوے ٹائم ٹیبل بھی عبرانی میں شائع ہونے لگے ہیں۔

مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی نے "زیارۃ القدس و شام" (۱۳۲۹ھ) میں بتایا کہ

"قدس کی آبادی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اندرونِ شہر فصیل سے محصور ہے، جس کے سات دروازے ہیں۔ غربی دروازہ باب الخلیل کہلاتا ہے، جنوب میں دو دروازے ہیں باب داؤد اور باب المغاربہ، مشرق

میں باب الاسباط اور شمال میں تین دروازے باب الساھرہ، باب النصر (باب العمود) اور باب الجدید ہیں۔ فصیل سے باہر نیا شہر آباد ہے۔ مسجد اقصیٰ اور مسجد عمر کے علاوہ شہر میں شیخ محمد اباصیری، شیخ قرمی، شیخ محمد الثبت شیخ بایزید لبسطامی، شیخ جلال الدین رومی، شیخ فرید، شیخ حسن کے مزارات زیارت گاہِ عوام ہیں۔ مسجدِ اقصیٰ کی شرقی دیوار کے بالمقابل سیدنا شداد رضہ بن اوبس انصاری اور عبادۃؓ بن صامت کے مزارات ہیں۔ کوہِ طور الزیت کے دامن میں سید محمد علمی کا مزار۔ اس سے متصل قبۃ شھداء، غربی جانب حضرت رابعہ عدویہ اور مشرقی جانب حضرت سلمان فارسی رضہ مدفون ہیں۔ شہر کے شمالی جانب سیدنا عکاشہ، سیدنا قیم اور مسجد کی شمالی فصیل کے قریب غار میں سیدنا سلطان ابراہیم ادھم رح اور شیخ حسن راعی کے مزارات ہیں۔"

مولانا حفظ الرحمٰن نے "راہِ وفا" (۱۹۳۸ء) میں لکھا ہے

"کہ ترکوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے زمینوں کے ٹکڑے وقف کر دیئے تھے۔ جن پر ان ملکوں کے آنے والے زائرین کے قیام و رہائش کے لیے مسافر خانے تعمیر ہوئے۔ جو اب تک قائم ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر ہندوستان کے لیے مخصوص قطعہ اراضی پر خواجہ ناظر حسن انصاری نے "زاویۂ ہندی" کے نام سے مسافر خانہ تعمیر کیا۔ قبرستانِ شھداء میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے شہید سپاہی دفن ہیں۔ صحنِ حرم میں مولانا محمد علی جوہر مدفون ہیں۔ اقتصادی، انفرادی، سیاسی اور مذہبی شعبوں پر حکومتِ برطانیہ کا اثر ہے۔ جس کی وجہ سے اس سرزمینِ قدس پر ہنگامۂ دار و گیر برپا ہے اور مسلمانوں کے حقوق، ان کی معبدگاہیں، جائدادیں اور جان و مال خطرے میں ہیں۔ جس وقت سے برطانیہ کا قبضہ ہوا یہودیوں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور حکومتِ برطانیہ نے چاروں طرف سے یہودیوں کو لا لا کر یہاں آباد کیا۔ مسلمانوں کی زرخیز زمینیں اور آباد محلے آج یہودیوں کے قبضے میں ہیں حالانکہ آج سے سنتیس

قبل الخلیل (حبرون) کو جاتے ہوئے قدس سے باہر یہودیوں کی ایک چھوٹی سی آبادی ہے ماہ شورم (یعنی سوگھر) تھی۔ قدیم شہر میں بلیس نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ اور شہر میں مسجد اقصٰے کے علاوہ ۳۸ مساجد ہیں

مسلمانوں کا قتل عام

۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ نے بیت المقدس اور اس کے مضافاتی علاقوں کو عالمی اہمیت کا علاقہ قرار دیتے ہوئے تقسیم فلسطین کے منصوبہ میں بیت المقدس کو بین الاقوامی تولیت میں دینے کا فیصلہ کیا۔ تو یہودیوں نے اس کا استقبال کیا، لیکن عربوں نے اس ناانصافی کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف یہودیوں نے تقسیم فلسطین کا اعلان ہوتے ہی عربوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔ مفتیٔ اعظم فلسطین کی مختصر سی فوج آزادی لاکھوں یہودیوں سے نبرد آزما ہو گئی۔ یہودیوں کو عالمی صیہونی ایجنسی اور بعض ممالک (چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ، رومانیہ) اسلحہ فراہم کر رہے تھے۔ برطانوی حکومت نے بھی انھیں سینچورین ٹینکوں سمیت جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کیا۔ انھیں عرب علاقوں پر قبضہ کرنے میں مدد دی اور عرب آبادی کو "محفوظ مقامات" پر پہنچانے کے بہانے شہروں کے شہر خالی کرا لیے، چنانچہ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو جب برطانیہ رخصت ہوا۔ دیریاسین، طبریہ، حیفا، سمخ سلامہ، بیسان، بیت المقدس (نیا شہر)، صفد اور یافا ایسے شہر عرب آبادی سے بالکل خالی ہو چکے تھے۔

جنگ ۱۹۴۸ء

یہودیوں کی برطانیہ سے ملی بھگت کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ برطانیہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ فلسطین ۱۴ مئی کو خالی کر دے گا۔ البتہ حیفا کی بندرگاہ سے افواج اگست میں ہٹائے گا، مگر اس کے برعکس اس نے حیفہ بھی ۱۴ مئی کو خالی کر دیا۔ اور ۱۵ مئی کو اسلحہ اور گولے بارود سے لدے ہوئے جہاز حیفہ کی بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں کی ایک زبردست فوج نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ اخوان مجاہدین گزشتہ چار ماہ سے پرانے شہر میں یہودیوں سے نبرد آزما تھے، ان کے پاس ہتھیار بہت تھوڑے اور

وہ بھی پرانی قسم کے تھے، لیکن اپنے جوشِ ایمان، خلوصِ نیت، شوقِ شہادت اور توکل علی اللہ کی [illegible] وہ لڑتے رہے۔ اس وقت مقامی آبادی کے علاوہ گرد و پیش کے بیس ہزار مسلمان [illegible] المقدس میں پناہ گزین تھے۔ چند ہفتے پہلے یہودی دیر یاسین میں قتل عام کر چکے تھے۔ [illegible] المقدس کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ یہاں بھی دیر یاسین کی وحشت ناک کہانی دہرائی جائے گی۔ اخوان کے پاس گولہ بارود کا آخری ذخیرہ ختم ہو رہا تھا؛ انہوں نے عرب لیجن سے مدد مانگی لیکن جنرل گلب پاشا نے بعض سیاسی اور مذہبی وجوہ کی بنا پر ایک فوجی بنیاد کی آڑ میں شہر کو خالی کرنے کا مشورہ دیا۔ جسے اخوان نے مسترد کر دیا۔ اخوان دستوں کے قائد نے کہا۔

"یہودی ہماری لاشوں سے گزر کر ہی بیت المقدس میں داخل ہوں گے"۔

عرب لیجن کی طرف سے مایوس ہو کر بیت المقدس کی پوری مسلمان آبادی گھروں سے نکل آئی رات بھر شدید جنگ ہوتی رہی، اور صبح کے وقت یہودی پسپا ہونے لگے۔ اردنی فوج کے ایک ذمہ دار افسر کو اس صورتِ حال کی خبر ملی تو جنرل گلب پاشا کی مخالفت کے باوجود یہودیوں کی تازہ دم فوج پہنچنے سے پہلے پچھلے پہر اردنی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اخوان کے ثبات و استقلال اور سرفروشی نے بیت المقدس کو مسلمانوں کے لیے محفوظ کر لیا۔ ۸ جولائی کو یہودیوں نے دوبارہ حملہ کیا لیکن شدید جنگ اور زبردست جانی نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہو گئے۔ اس مرحلہ پر اقوامِ متحدہ یہودیوں کی مدد کو آگے بڑھی لیکن اقوامِ متحدہ کی قرارداد کے احترام میں عربوں نے ابھی ہتھیار رکھے ہی تھے کہ ۱۵ جولائی کو اسرائیل نے ایک زبردست حملہ کر کے بیت المقدس کے چوراسی فیصد رقبہ پر قبضہ کر لیا۔ اور مسلمان صرف قدیم شہر تک محدود ہو کر رہ گئے۔ ۲۹ اگست ۴۸ء کو اقوامِ متحدہ نے بیت المقدس کو غیر مسلح قرار دینے کی قرارداد منظور کی۔ جسے اسرائیل نے مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ بیت المقدس کی حالیہ پوزیشن کو برقرار رکھا جائے۔ پھر چند یوم بعد اقوامِ متحدہ پر الزام لگایا کہ وہ اپنی قراردادوں پر عمل کرانے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ بیت المقدس سے متعلق اقوامِ متحدہ کی تمام قراردادوں کو ماننے سے بالکل انکار کر دیا۔ اور بیت المقدس کو اسرائیلی دارالسلطنت بنانے کی باتیں شروع کر دیں۔

اقوامِ متحدہ نے ایک اور قرارداد کے ذریعے یہودیوں پر واضح کر دیا کہ وہ بیت المقدس

کو دارالسلطنت نہیں بنا سکتے۔ لیکن اسرائیل نے اسے بھی نظر انداز کر دیا اور پارلیمنٹ کی منظوری سے بیت المقدس[1] کو اسرائیل کا مستقل دارالسلطنت قرار دے کر وزارت خارجہ کے سوا اکثر دفاتر بیت المقدس منتقل کر دیئے اور جون ۲ ۵ء میں وزارت خارجہ بھی بیت المقدس منتقل ہو گئی۔ ۹ جولائی ۵۲ء کو امریکہ نے بھی برطانیہ، مشرقی جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، جاپان، ترکی، کینیڈا، آسٹریلیا، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ کی طرح اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے بیت المقدس منتقل کر دینے سے انکار کر دیا، لیکن اکثر ممالک کے سفارتی مشن بیت[2] المقدس آ گئے۔

اسرائیل میں انضمام

۷ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ اور ۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو اقوام متحدہ نے قرارداد نمبر ۲۲۵۳-ای-ایس-وی کے ذریعے بیت المقدس کو اسرائیل میں مدغم کرنے کے اقدام کو غیر قانونی قرار دیا۔ اس قرارداد کے حق میں ۹۹ ووٹ آئے کسی نے مخالفت نہیں کی۔ البتہ امریکہ اور اسرائیل غیر حاضر رہے۔ ۱۴ جولائی کو جنرل اسمبلی نے اس قرارداد کی توثیق کی۔ ۲۱ مئی ۶۸ء کو سلامتی کونسل نے اسرائیل کے رویے کی مذمت کی اور ۴ اور ۴ جولائی کو قراردادوں پر اصرار کرتے ہوئے اسرائیلی اقدام کو بین الاقوامی قانون اور رائے عامہ کے منافی قرار دیا۔ مگر اسرائیل نے اقوام متحدہ کی ہر قرارداد اس کے منہ پر دے ماری — اور آج بیت المقدس اسرائیلی ظلم و استبداد کا شکار اپنے ایوبی رح کا منتظر ہے۔

---

[1] جون ۶۷ء کی جنگ تک ذیلی دارالسلطنت تل ابیب تھا۔ [2] یہاں بیت المقدس سے بیرونی فصیل مراد ہے اور مغربی سمت نیا شہر آباد ہے۔

باب سوم

"پلیٹھ دے کر اُلٹے نہ پھرو ورنہ نقصان میں پڑ جاؤ گے" قرآن

شہر پناہ اور دروازے

کتابِ مقدس میں اس شہر کے در و دیوار کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔ کہ آنے والی نسلیں اس پر فخر کریں گی اور اس کی شہر پناہ کو دیکھ کر ششدر رہ جائیں گی — لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتابِ مقدس کے عہد کا وہ شہر آج ناپید ہے اور اس کی جگہ جو شہر کھڑا ہے۔ اس کے متعلق ماہرینِ آثارِ قدیمہ اور مورخین متفق ہیں کہ یہ عین اس مقام پر نہیں یہاں شہر داؤد و سلیمان تھا۔ بلکہ اس کی جگہ اور مقام کسی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں۔ "یروشلم — مقدس" کا امریکی مصنف ایڈون۔ایس ویلیس کہتا ہے۔ کہ یہ شہر اس جگہ نہیں، جہاں ہیرود اور اس کے جانشینوں کے عہد میں واقع تھا۔ بلکہ اُس دور کا شہر موجودہ شہر سے تین گنا بڑا تھا اور مکانات بھی آج کل سے زیادہ قریب اور تنگ تھے۔ البتہ وُہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا۔ کہ شہر کی موجودہ عمارات قدیم کھنڈرات کے ملبے سے تعمیر ہوئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر عمارتوں پر عہدِ ہیرود کے باقیات ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

اس شہر کی معلوم تاریخ میں یہ کئی بار اجڑا اور از سرِ نو آباد ہُوا اور اس دوران اس کی شہر پناہ بھی کئی مرتبہ تعمیر ہوئی۔ پہلی شہر پناہ عہدِ داؤد میں تعمیر ہوئی اور حضرت سلیمانؑ نے اس کی مرمت کروائی۔ کتاب سلاطین ۱۱ : ۲۶ میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے باپ داؤد کے شہر کے گرد فصیل تعمیر کرائی۔ تو یربعام افرائیمی نے مخالفت کی۔ اس پر حضرت سلیمانؑ نے اسے بنی یوسف پر حاکم بنا کر شہر سے باہر بھیج دیا۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کے چار سو سال بعد یہ شہر پناہ شاہِ بابل بخت نصر کے ہاتھوں تباہ ہو گئی، جس نے فصیل شہر کو گرا کر ہل چلوا دیئے۔

دوسری فصیل کی تعمیر کا کام بابل کی قید سے واپسی کے بعد ۴۴۵ ق م کے لگ بھگ

شروع ہوا۔ کتاب، نحمیاہ کے باب ۳ میں اس تعمیر کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ یہ شہر پناہ یہود کے قبائل نے آپس میں تقسیم کار کے اصول پہ بنائی۔ اور اس کی تعمیر میں مقامی لوگوں کے علاوہ اہلِ فارس، رومیوں، شامیوں اور مصریوں نے مداخلت کی۔ مگر نحمیاہ کی قیادت میں تعمیر فصیل کا کام برابر جاری رہا اور اسے مکمل کیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ شہر پناہ پہلی فصیل کے کھنڈرات پہ ہی اٹھائی گئی تھی۔ اس لیے شہر کے محل وقوع میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔ ڈاکٹر رابن سن کے اندازہ کے مطابق اس شہر پناہ کی تعمیر شہر کے شمالی حصے سے شروع ہوئی۔ اس کی مغربی انتہا موجودہ باب دمشق کی جگہ تھی۔ یہاں سے یہ جنوب کو مڑ گئی۔ لیکن یہ شہر پناہ بھی حملہ آوروں کی ستمرانیوں کا شکار ہو گئی۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ شہر پناہ کی تیسری تعمیر ہیرود کے جانشین ہیرود اغریپا نے حضرت عیسےٰ کے صعود کے بارہ سال بعد شروع کی۔ ہیرود اغریپا کا تعمیراتی کام اتنا عظیم اور شاندار تھا۔ کہ شام کے رومی حکمران کے ذہن میں شک پیدا ہو گیا۔ کہ یہ سب کچھ ایک نئی بغاوت کی تیاری ہے۔ چنانچہ اس نے کلاڈیس سیزر کے نام اپنے ایک خط میں اپنے ان شکوک کا اظہار کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں کلاڈیس نے اغریپا کو مزید تعمیر سے روک دیا۔ مگر بعد میں یہودیوں نے اپنے روایتی حربوں سے کام لیتے ہوئے اس کی جزوی تکمیل کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ جوسیفس اس شہر پناہ کی بہت تعریف کرتا ہے اس کی دیواروں میں ۲۰ ہاتھ لمبے اور دس ہاتھ چوڑے پتھر لگائے گئے تھے، جن کا اٹھانا اور بلند کرنا انسانی طاقت سے بالاتر نظر آتا ہے۔ یہ فصیل ۷۱ء میں طیطس رومی کے حملہ کا شکار ہو گئی۔ اور ۱۳۴ء کے بعد تو قطعاً ملبے کا ڈھیر نظر آتی تھی۔

موجودہ فصیل ترکانِ عثمان کے دوسرے حکمران سلیمان اعظم نے تعمیر کرائی۔ سلیمان اعظم کے والد سلطان سلیم نے ۱۵۱۷ء میں اس شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ سلیمان اعظم نے تعمیر کی نگرانی دو بھائیوں کو سونپی۔ جنہوں نے ۱۵۳۶ء میں یافہ گیٹ سے مخالف سمتوں میں کام کا آغاز کیا اور وہ اس کی تکمیل تک ایک دوسرے کو نہ مل سکے۔ سات سال بعد ۱۵۴۲ء میں موجودہ سینٹ سٹیفن گیٹ پہ ان کی ملاقات ہوئی۔ اس خوشی کی یاد میں انہوں نے اس دروازے پہ چار شیر بنائے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ شہر پناہ کی تعمیر کے ساتھ اس کے دروازوں کی تکمیل

میں کچھ نہ کچھ ردّ و بدل ہوتا رہا۔ بیشتر عرب جغرافیہ نویسوں نے ان دروازوں کا ذکر ضمناً کیا ہے اور صرف دو عرب مصنف ان کا تفصیلی حال بیان کرتے ہیں۔ یعنی مقدسی ۹۸۵ء میں اور مجیر الدین ۱۴۹۶ء میں، ان تاریخوں کے درمیان یہ مقدس شہر قریباً ایک صدی تک صلیبیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مقدسی اور مجیر الدین کے بیان کردہ نام مختلف ہیں۔ البتہ مجیر الدین نے جن دروازوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ آج تک کھلے ہوئے اور زیر استعمال ہیں۔

مقدسی نے بالاحصار کے آٹھ دروازے بتائے ہیں۔ اور ان کے نام یہ ہیں:

باب صیہون، باب التیہہ (دشت)، باب البلاط (محل یا دربار)۔ باب جبّ ارمیہ (حضرت ارمیہ کا گڑھا)، باب سلوان یا صلوان، باب اریحا، باب العمود (ستون) باب محراب داؤد۔

باب محراب داؤد آجکل یافہ گیٹ کہلاتا ہے، مقامی لوگ اسے باب الخلیل یا باب حبرون کہتے ہیں۔ کیونکہ خلیل اللہ کے شہر حبرون کو جانے والے زائر اسی راستے سے جاتے ہیں۔ مقدسی نے اس سلسلے میں بالاحصار کا ذکر کیا ہے وہ اس دروازے سے ذرا اوپر کے رُخ اب تک موجود ہے۔ اور اس میں وہ محراب بھی سلامت ہے جس سے یہ دروازہ منسوب کیا جاتا تھا۔

مقدسی کا باب صیہون، جنوبی دیوار میں باب حبرون کے بعد دوسرا دروازہ ہے جسے آجکل باب النبی داؤد کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مجیر الدین اسے باب حارۃ الیہود کہتا ہے، قریب ہی حضرت داؤد کا مزار ہے۔

باب اریحا، وہ ہے، جسے چودھویں صدی سے سینٹ سٹیفن گیٹ کا نام دے دیا گیا ہے۔ یہ دروازہ دسویں صدی عیسوی میں جریکو گیٹ کہلاتا تھا۔ اسے باب الاسباط یا مریم کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔ برکتہ اسرائیل، اسی دروازے کے باہر ہے، جو نہایت قدیم تالاب ہے۔

باب جبّ ارمیہ، شمال کا چھوٹا دروازہ باب الساھرہ ہے اور قدیم زمانے میں ہیرود گیٹ کہلاتا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ میدان ہے۔ یہاں بعض روایات کے مطابق روز محشر ساری مخلوق جمع ہوگی اور ایک خندق بھی ہے، جس کے بارے میں عام روایت ہے کہ اسے سلطان صلاح الدین نے کھدوایا تھا۔ لیکن مقدسی اس دروازے کو گڑھا کا دروازہ کہتا ہے جس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خندق قدیم دور سے ہے۔ البتہ اتنا ضرور ممکن ہے

کہ سلطان صلاح الدین نے اسے مزید استوار اور مستحکم کیا ہو۔

مقدسی کا باب عمود آج بھی اسی نام سے شمالی دیوار کے وسط میں واقع ہے، اسے باب دمشق بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہیں سے ایک سڑک نابلس اور دمشق کو جاتی ہے۔ عیسائی روایات کے مطابق قبولِ مسیحیت کے بعد سینٹ پال اسی راستے سے شہرِ مقدس میں داخل ہوئے۔ محارباتِ صلیب کے وقت یہ دروازہ سینٹ سٹیفن سے منسوب تھا کیونکہ وہ جگہ جہاں یہود نے سینٹ سٹیفن کو سنگسار کیا۔ اسی دروازے کے باہر چند قدم کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس مقام پر تھیوڈوسیس ثانی کی ملکہ اودوسیا نے ۴۵۵ء میں ایک گرجا بنا دیا تھا۔ ملکہ اسی گرجا میں مدفون ہے۔ اس گرجا سے کچھ فاصلے پر "بادشاہوں کے مقبرے" ہیں۔ جو مشرقی میسوپوتیمیا کی ملکہ ہیلینا کے لیے تعمیر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ دینِ موسوی کو قبول کرنے کے بعد ملکہ اپنے بیٹے ازیتیس کے ہمراہ ۴۵ میں شہر قدس میں آئی اور ازتیس کے بیس بیٹے اسی شہر میں آباد ہو گئے۔ ملکہ اور ازتیس ان قبروں میں مدفون ہیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر مسلمانوں کا قبرستان اور حضرت سلیمان ؑ کی بھٹیاں ہیں۔

مقدسی کا باب التیہ اور باب صلوان آجکل معدوم ہے، لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ باب التیہ مجیر الدین کا باب السرب (چور دروازہ) ہے، جو کبھی باب صیہون اور باب جبرون کے درمیان ارمنی خانقاہ کے قریب کھلتا تھا۔ لیکن آجکل بند ہے۔

باب صلوان، مشرقی دیوار میں آج کا باب المغاربہ ہے، جسے فرنگیوں نے کوڑی دروازہ کا نام دیا تھا۔ باب البلاط، غالباً مجیر الدین کے باب الرمیہ (میدان) کا قدیم نام تھا۔ جو کبھی باب جبرون کے شمال میں شہر پناہ کے مذہبی پہلو پر تھا۔ لیکن پچھلی صدی میں اسے بند کر دیا گیا۔ ادریسی ۱۱۵۴ء میں باب الرحمہ کا ذکر کرتا ہے۔ جسے مسیحی گولڈن گیٹ کہتے تھے۔ ادریسی لکھتا ہے:

"یہ دروازہ شہر کے مشرقی پہلو پر ہے، مگر عام طور پر بند رہتا ہے۔ اور صرف شاخ زیتون کے میلے کے دن کھولا جاتا ہے۔"

او۔ ایچ پیری اپنی کتاب "زیاراتِ یروشلم" مطبوعہ ۱۱۹۲ء میں اس دروازے کا ذکر

کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"یہ معبد سلیمانی کے مشرقی دروازے کی جگہ قائم ہے، حضرت عیسیٰ پام سنڈے کو اسی دروازے سے ہیکل میں داخل ہوئے۔ یہ دروازہ ۶۲۹ میں مقدس صلیب ملنے کی یادگار کے طور پر ہرکولیس نے تعمیر کرایا تھا۔ عہد صلیبی میں یہ دروازہ دو مرتبہ کھلتا تھا۔ ایک مرتبہ پام سنڈے کے جشن کے لیے اور دوسری مرتبہ ۱۴ ستمبر کو مقدس صلیب ملنے کے روز ۔۔۔ ترکوں نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ لیکن کبھی استعمال نہیں ہوا"

اس سے باہر ایک محراب بنی ہوئی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت مہدی آخر الزمان کی بعثت کے بعد اس جگہ تشریف لائیں گے۔" پیری مزید لکھتا ہے کہ اس دیوار کا جو حصہ مسجد اقصیٰ سے ملحق ہے، اس جگہ واقع ایک مینار سے سینٹ جیمز کو گرا کر ہلاک کیا گیا تھا۔" مجیر الدین کے باب اللہ اعیبہ (موری دروازہ) کی آجکل صحیح نشان دہی ممکن نہیں ہے۔ البتہ قیاس کہتا ہے کہ یہ باب ہیرود سے کسی قدر مغرب میں ہوگا۔

او۔ایچ پیری شمالی دیوار کے مغربی کونے میں قصر جلوہ (گولائیتھ کا محل) سے منفصل باب الجمید کا ذکر کرتا ہے، جو ۱۸۰۸ء میں تعمیر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ نیا یروشلم اسی دروازہ سے باہر ہے۔ پیری مزید بتاتا ہے کہ عہد ہیرود میں تھیٹر، سرکس اور جمناسٹک کے مقابلے مغربی دیوار سے باہر کے میدان میں ہوتے تھے۔ اس کے مطابق مغربی دیوار میں قدیم نکولیس گیٹ کی جگہ آجکل باب السلسلہ ہے۔ مجیر الدین نے خانقاہ شیخ ابن عبداللہ کے قریب باب الزاویہ اور شہر کے شمال مشرقی گوشہ پر باب حارہ طور کا ہونا بیان کیا ہے، لیکن آجکل اُن کا کوئی نشان نہیں ملتا ۔۔۔

وادیاں

بیت المقدس کو بجا طور پر وادیوں اور پہاڑیوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ اس کے تین اطراف پھیلی ہوئی وادیوں نے اسے ایک عظیم اور منفرد شہر بنانے میں اہم کردار کیا ہے۔ اور بالخصوص ہنوم اور کیدرون کی وادیاں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر ان وادیوں کا رُخ کسی اور سمت ہوتا تو بیت المقدس کبھی اس جگہ آباد نہ ہو سکتا۔ کیونکہ موریا اور زیتون

کی پہاڑیوں اور کیدرون، ہنوم اور ان کی درمیانی وادی کے بغیر اس شہر کا تصور ہی ممکن نہ تھا۔

وادی ہنوم کتاب مقدس کے مطابق اپنے پہلے معلوم مالک ہیگ گائی (نحمیاہ ۱۱:۳۰) یا گائی بن ہنوم (یشوع ۸:۱۵) سے منسوب ہے۔ سٹینلے کے الفاظ میں قدیم تاریخ کے ہیرو ابن ہنوم نے اس جگہ اپنے ڈیرے ڈالے اور یہیں سے آگے بڑھ کر شہر پر قابض ہو گیا۔ یہ وادی شہر پناہ کے شمال مغربی کونے سے شمال میں نصف میل کے فاصلے پر شروع ہوتی ہے۔ پہلے جنوب مغربی سمت اور پھر جنوب کا رُخ کرتی ہے۔ اس جگہ یہ وادی "مقابلۃً" ہموار ہے۔ وہاں مسلمانوں کا قبرستان ہے۔ جس کے وسط میں جلیہون کا بالائی تالاب (جسے اب برکت المیلا کہا جاتا ہے) واقع ہے۔ اس تالاب سے قدرے جنوب میں اُترائی تیز ہو جاتی ہے۔ اور تقریباً چوتھائی میل کے فاصلے پر جیہون کا زیریں تالاب یعنی برکۃ السلطان واقع ہے۔

وادی میں دائیں سمت اونچی اور ڈھلوان چٹانیں ہیں، جن میں پتھر تراش کر مزارات بنائے گئے تھے۔ جنہیں بادشاہوں کے مقبرے کہا جاتا تھا۔ آجکل ان عمارتوں کو ملازمین رہائش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ جگہ باب دمشق سے قریباً ایک تہائی میل کے فاصلے پر ہے۔ اس جگہ سے آگے وادی پہاڑی راستے پر بلند ہو کر (HILL OF EVIL COUNCILS) تک چلی گئی ہے۔ بائیں طرف صلیہون کی ڈھلوانیں ہیں۔

یہ وادی، یہاں قدرے تنگ ہے، وہاں زیتون کے درخت ہیں، اس کے بعد اچانک مشرق کی طرف مُڑتی اور وسیع ہو کر ایک مستطیل شکل میں بدل جاتی ہے۔ وادی کے اس حصے کو پہلے توفت (TOPHET) کہا جاتا تھا اور حضرت سلیمانؑ کے باغوں میں ایک باغ اسی جگہ تھا۔ بعد ازاں اس میں جھوٹے خداؤں کے بُت نصب کر دیئے گئے۔ اور ان کے سامنے قربانیاں دی جانے لگیں۔ لیکن آحز اور منسیٰ کے جانشین متقی و پاک باز جوسیاہ نے یہ روایت ختم کر دی۔ اسے وادی الملس بھی کہا جاتا ہے۔ یہودی ربیوں کے مطابق یہ وادی جہنم کے دروازے پر ہے۔ اس وادی میں ہمیشہ بے تحاشا خون بہا ہے، کنعانی یہودی، فارسی، شامی، رومی، فرانسیسی اور مسلمان خون ـــــ ذرا آگے بڑھیں یعنی صرف پانچ سو گز، تو ہم وادی کیدرون اور وادی ہنوم کے نقطۂ اتصال پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور یہاں تلیس ایکڑ تک کا رقبہ ہموار اور مسطح ہے۔ یہ جگہ کوہ موریا پر مسجد اقصیٰ کے فرش سے ساڑھے تین سو فٹ

نیچی ہے۔ اسی مسطح ٹکڑے کے جنوبی کونے میں بیئر ایوبؑ ہے۔ جس کے بارے میں واضح طور پر کہنا ممکن نہیں کہ کب سے ہے۔ اسلامی قبضہ کے فوراً بعد اس کا موجود ہونا، کتابوں سے ثابت ہے اور مسلمانوں ہی نے اسے بیئر ایوب کا نام دیا۔ صلیبیوں نے اسے نحمیاہ سے منسوب کیا۔ کیدرون اور ہنوم کے ملنے سے جو وادی بنتی ہے۔ اسے وادیٔ النار کہا جاتا ہے۔

شہر کے مشرق میں وادیٔ کیدرون ہے۔ کیدرون بائیبل کا دیا ہُوا نام ہے۔ عام طور پر اسے چوتھی صدی عیسوی سے جیھوشیفٹ کی وادی کہا جاتا رہا ہے۔ مقامی لوگ اسے مریم سیتی کی وادی کہتے ہیں۔ یہ وادی شمالی فصیل سے ایک میل تک چلی گئی ہے، آدھے راستے تک اس کا رُخ جنوبی ہے، اور خوب کاٹنت ہوتی ہے، وادی کے سرے پر پتھروں کو کاٹ کر بنائے گئے مکانات کی کثرت ہے، جو کبھی مزارات تھے۔ مگر آجکل کسانوں کی رہائش گاہیں بنے ہوئے ہیں۔ جنوبی رُخ کے بعد قدرے جھکاؤ کے ساتھ چوتھائی میل تک مشرق کی طرف چلی جاتی ہے۔ پھر جنوب کا رُخ کرتی ہے۔ حتیٰ کہ بحیرۂ مُردار میں جا گم ہوتی ہے۔

اس وادی کے آخری موڑ پر شمعون کا مزار ہے۔ اس کے علاوہ فصیل شہر سے متصل اسی وادی میں مسلمانوں کے مزارات، ابی سلوم کی لاٹ، سینٹ جیمز اور زکریا کے مزارات اور ان سے ذرا ہٹ کر جیسں مین کا باغ واقعہ ہے۔ بائیں ہاتھ حضرت مریم کا گرجا ہے۔ یہاں روایات کے مطابق حضرت مریمؑ، ان کے خاوند جوزف اور والدین مدفون ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سینٹ میری کا گرجا ملکہ ہیلینا نے تلاش کیا تھا۔

اس کے قریب مسلمانوں کی ایک مسجد بھی ہے۔ یہاں سیّاحین حضرت مریم کے مقبرہ کی زیارت کے بعد نوافل ادا کرتے ہیں، قاضی مجیر الدین نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ جب سینٹ میری کے گرجا کے قریب سے گزرے تو انہوں نے دو رکعت نفل ادا کیئے۔ اور اس جگہ بعد میں مسجد تعمیر کر دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ محاربات صلیب کے دَور میں صلیبیوں نے اس مسجد کو شہید کر دیا تھا۔

جیسں مین کے باغ سے دو سو گز کے فاصلے پر چار مزارات ہیں۔ جن کی اصل حیثیت مشکوک ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ یہ ابی سلوم بن سلیمانؑ، زکریاؑ، جیھوشیفٹ اور سینٹ جیمز کے مقابر ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔ ان مزارات کے قریب ہی پتھر ملے ستون ... ایک

پُل بنا ہُوا ہے، جس کی تعمیری تاریخ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔ اس سے پانچسو گز کے فاصلے پر "کنواری کا چشمہ" ہے۔ چشمہ ایک غار میں وادی کی سطح سے کم سے کم بیس فٹ نیچے ہے اور اس تک سیڑھیاں اُتر کر پہنچا جاتا ہے، مقامی لوگ اسے "عین الدراج" کہتے ہیں۔ قریب ہی حزقیاہ کا تعمیر کردہ تالاب ہے۔ اس چشمے سے نیچے وادی ایک وسیع منظر پیش کرتی ہوئی وادی الوعد (WADI-EL-WAD) میں جا ملتی ہے۔ وادی الوعد کی سطح وادی کیدرون سے تیس فٹ اونچی ہے۔

وادی کیدرون کے بارے میں مسلمانوں، عیسائیوں اور یہود میں عام تاثر یہ ہے کہ میدانِ حشر یہی ہوگا۔

وادیٔ الوعد جسے جوسیفس "چیز مونگرز کی وادی اور (TYROPEAN) کا نام دیتا ہے، شہر کو تقسیم کرتی ہوئی باب دمشق سے سلوم کے تالاب تک چلی گئی ہے کوہِ زیتون اس کے مغرب میں اور کوہ موریا مشرق میں ہے۔ سلوم کا تالاب شمالی دیوار کے چھوٹے دروازہ کے قریب ۵۰ فٹ لمبا، دس فٹ چوڑا اور بارہ فٹ گہرا چشمہ ہے جسے صلاح الدین ایوبی نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔

پہاڑیاں

یہ مقدس شہر موریہ اور صیہون کی پہاڑیوں پر واقع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو پہاڑیاں قرار دینا مبالغہ ہے، کیونکہ صیہون بحیرۂ روم سے صرف ۲۶۰۰ فٹ اور موریہ ۲۴۰۰ فٹ بلند ہے۔ ان کی اہمیت محض اس لیے ہے کہ انھیں اس شہر کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا۔ بعض جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ شہر کے لیے موجودہ مقام کا تعیّن اس کی دفاعی پوزیشن کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ شہر، موجودہ مقام سے جنوب مغرب کی طرف ایک میل کے فاصلے پر ریفائیم کے میدان یا شمال کی وسیع سطح مرتفع میں تعمیر ہوتا۔

شہر، موریہ اور صیہون کی پہاڑی پر واقع ہے۔ اور ان دونوں پہاڑیوں کو وادیٔ الوعد (TYROPEAN) الگ کرتی ہے۔ مشرقی پہاڑی پر پانچ ٹیلے نمایاں ہیں۔ ان میں جو انتہائی شمال میں ہے۔ آجکل شہر سے باہر ہے۔ اس ٹیلے اور شہر کو ایک مصنوعی کھائی کے ذریعے الگ کیا گیا ہے۔ اور مسجد صخرہ بھی اس پہاڑی ہی کے ایک ٹیلے پر واقع ہے اور موریہ

کی پہاڑی ہے۔ مغربی پہاڑی یعنی صیہون کی چڑھائی بتدریج اور مسلسل ہے اور اس پہاڑی کے جنوبی حصہ پر رومن دور میں بالائی شہر آباد تھا۔ آجکل ارمنی محلہ ہے۔ کلیسائے نشوو اسی پہاڑی کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔

ان پہاڑیوں کے علاوہ شہر کے نواح میں کچھ اور پہاڑیاں بھی ہیں۔ جن میں سے زیتون (OLIVE) جو بالا حصار سے باہر شہر کے مشرق میں واقع ہے۔ ان دونوں پہاڑیوں کے برابر کی اہم ہے۔ جب تک کوئی فرد اس پہاڑی کی انتہائی بلندی تک نہیں پہنچتا ہے۔ بیت المقدس سے مشرق کا منظر، جو وادی اردن اور وسطی پہاڑی علاقے کے درمیان کھلتا ہے۔ اس پر بند رہتا ہے۔ یہ منظر انتہائی معنی خیز اور خیال آفرین ہے۔ سامنے پھیلے ہوئے صحرا میں سال میں صرف دو ماہ کے لیے ہریالی نظر آتی ہے۔ یا پھر کہیں کسی چشمہ کے کنارے سبزہ نظر آجاتا ہے۔ عام طور پر سخت سردیوں اور سخت گرمیوں میں اس صحرا کے ابھرے ہوئے مخروطی ٹیلوں میں لکڑبھگڑ اور دوسرے وحشی جانور بسیرا کر لیتے ہیں۔ وادی اردن، جسے غور بھی کہا جاتا ہے، سے پرے موآب کی زرد پہاڑیاں اس طرح نظر آتی ہیں، جیسے آسمان کے سامنے دیوار تنی ہو۔

شہر کے قریب پہاڑ کی تین چوٹیوں میں سے بڑی چوٹی کو لاطینیوں اور یونانیوں نے مقدس عمارات کے لیے منتخب کیا اور ان عمارتوں کی بدولت اس کی زرخیزی ختم ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی چوٹی سے حضرت عیسیٰ نے شہر کو دیکھا اور اس پر روئے۔ اسی جگہ وہ اپنے حواریوں کو نئی شریعت کا سبق دیتے رہے اور بعض روایات کے مطابق اسی پہاڑی سے ایک بادل میں گم ہو کر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کے صعود کی جگہ جو گرجا تعمیر ہے، اس میں ایک پتھر پر قدم کے نشان کو حضرت عیسیٰ کے زمین پر آخری نقش پا [illegible]ت حاصل ہے۔

کہتے ہیں کہ یہود نے [illegible] میں اس پہاڑی سے تین ہزار انبیاء کو گرا کر شہید کیا اور تین ہزار انبیاء بھوک [illegible] ہوئے۔ اسی پہاڑی پر حضرت عیسیٰ کو انجیل دی گئی۔ قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر میں وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ وَطُورِ سِينِينَ وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ــــــ بعض مفسرین یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چار مبارک پہاڑوں کی قسم کھائی ہے۔ تین دمشق کی ایک پہاڑی ہے، جہاں حضرت داؤد کو زبور ملی۔ زیتون

سے یہی پہاڑی مراد ہے، طور سینین (طور سینا) صحرائے سینا میں ہے۔ یہاں حضرت موسیٰ کو تورات عطا ہوئی۔ اور بلد امین سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ جو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے اور جہاں قرآن کا ایک حصہ نازل ہوا۔

اس پہاڑی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں روایت ہے کہ عہد قدیم میں یہاں زیتون کے جھنڈ تھے۔ جو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے ناپید ہو گئے۔ البتہ انجیر کے درخت آج بھی موجود ہیں۔ جدید یروشلم کے جنوب میں "جرم کی پہاڑی" (MOUNT OF OFFENCE) ہے، جسے جبل ہارون، طورِ ہارون اور کوہ ھور بھی کہا جاتا ہے، مقدسی لکھتا ہے۔ کہ یہ بلند اور مقدس پہاڑ یروشلم کے جنوب میں واقع ہے، ہارون اس پر اپنے بھائی موسیٰ کے ساتھ چڑھے تھے۔ مگر واپس نہ آئے۔ تب یہود نے حضرت موسیٰ پر تہمت لگائی کہ بھائی کو مار ڈالا۔ تو آنحضرت نے پہاڑ کی سطح چوٹی پر وہ جنازہ لوگوں کو دکھا دیا۔ جس میں ہارون کا جنازہ تھا" ——— لیکن مؤرخ مسعودی اس واقعہ کو جبل مآب سے منسوب کرتا ہے اور یہی صحیح ہے۔

جنوب مغرب میں (HILL OF EVIL COUNCIL) ہے۔ جسے ہنوم کی گہری وادی صیہون سے الگ کرتی ہے۔ صلیبی محاربات میں یہ پہاڑی انسانی حملوں کی زد میں تھی۔ اور اس پر بار بار خون کے دریا بہے۔ اس پہاڑی پر کھدائی سے دو منزلہ چیمبر دریافت ہوئے ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس جگہ قبرستان تھا۔ ان ایوانوں کے نچلے حصے میں مُردہ کی نعش رکھ دی جاتی اور بالائی منزل میں اس کے لواحقین رہتے۔

اس پہاڑی پر باب یافہ سے مغرب میں ایک جگہ ایک یونانی مقبرہ دریافت ہوا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہیرود کی ہمونی شہزادی مریم مدفون ہے، جسے ہیرود نے ہلاک کر دیا تھا۔

انتظامی حیثیت

تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی دورِ حکومت سے قبل بالعموم اور حضرت داؤد و سلیمان کے عہد میں بالخصوص یروشلم اپنی سلطنت کا صدر مقام تھا۔ لیکن عہد اسلامی میں اس کی یہ حیثیت ختم کر دی گئی اور حضرت عمرؓ نے جب شام کی انتظامی تقسیم کی، تو بیت المقدس جند فلسطین کا حصہ بنا۔ فلسطین شام کا ایک صوبہ تھا، لیکن اہل شام "جند" کو فوجی اضلاع کے معنی

میں استعمال کرتے ہیں۔ عہد فاروقی میں جند فلسطین میں میدانِ عکہ کے جنوب میں واقع خلیج اردن اور بحر لوط تک کا سارا علاقہ شامل تھا۔ اس جند کی مغربی سرحد پر سمندر۔ جنوب میں دشتِ تیہ اور مصر کا راستہ حد بندی کرتا تھا۔ اموی دورِ خلافت میں جند فلسطین کی حدود میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ عہدِ سلیمان بن عبدالملک میں اس کا دارالحکومت رہا سے رملہ منتقل کر دیا گیا۔ رملہ سلیمان ہی نے بسایا تھا۔ عہدِ عباسیہ میں بھی کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ مگر جب صلیبی قابض ہو گئے۔ تو یروشلم ایک بار پھر سیاسی اہمیت حاصل کر گیا۔ اور اسے یروشلم کی ریاست کا دارالحکومت بنایا گیا۔

فرنگیوں کا تسلط ختم ہونے کے بعد، چودھویں صدی میں ابوالفداء نے جند فلسطین کے ماتحت اضلاع کا ذکر کرتے ہوئے الجفار اور تیہ کے اضلاع کو بھی اس کے ماتحت اضلاع بیان کیا ہے۔ یعقوبی نویں صدی عیسوی میں بیان کرتا ہے کہ فلسطین میں ولایت شام کا مغربی حصہ شامل ہے۔ رفح سے اسلجون تک اس کی لمبائی ایک سوار دو روز میں طے کرتا ہے اور اس کی چوڑائی یافہ سے اریحا تک، طے کرنے کے لیے بھی اتنا ہی عرصہ درکار ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ:۔

"جند فلسطین میں زغر اور دیار قوم لوط، الجبال اور الشراہ تک کا علاقہ شامل ہے۔ اصطخری کے مطابق ولایاتِ شام میں فلسطین سب سے زرخیز ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں یاقوت نے یروشلم کو ولایت فلسطین کا دارالحکومت لکھا ہے۔ سیوطی کا بیان ہے۔ کہ فلسطین کا صدر مقام ایلیا (بیت المقدس) رام اللہ سے اٹھارہ میل پر واقع ہے۔

ترکمان عثمانی کے دور میں ولایت فلسطین کے پاشا (لیفٹیننٹ گورنر) کے اکثر دفاتر یہیں تھے۔ اور جب اسے برطانیہ کا انتدابی علاقہ قرار دیا گیا۔ تو برطانیہ نے اس کے انتظام کے لیے کمشنر جنرل مقرر کیا۔

۱۹۴۸ء کی جنگ کے بعد یہ شہر اور فلسطین کے بعض دوسرے علاقے مملکتِ ہاشمیہ اردن کا حصہ بنے۔

بیتُ المقدس کی شرعی حیثیت

قرآن مجید میں بیت المقدس یا یروشلم وغیرہ الفاظ کے ساتھ تو کہیں ذکر نہیں

البتہ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ہ

پاک ہے وہ رب جو لے گیا اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف کہ جس کے گرداگرد ہم نے برکت نازل کی ہے تاکہ ہم اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ تحقیق وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔

مسجد الحرام سے خانہ کعبہ اور اس کے آس پاس کی جگہ یعنی صحن اور مسجد اقصیٰ سے بیت المقدس مراد ہے اور مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ وہ وہی واقعۂ معراج ہے جس سے ہر مسلمان واقف ہے۔ یہ محققین کے نزدیک ہجرت سے ایک سال پیشتر رجب کی ستائیسویں کو رُونما ہُوا۔ مسجد اقصیٰ حضرت سرورِ کائنات صلعم اور مسلمانوں کا پہلا قبلہ بھی رہ چکی ہے۔ اس کے گردوپیش اللہ تعالےٰ نے برکتیں نازل فرمائیں۔ وُہ دینی بھی ہیں اور دنیاوی بھی۔ جیسے کہ صاحب روح البیان نے اس آیت کی تصریح کرتے ہُوئے لکھا:

"بیت المقدس کے گرداگرد دین و دنیا کی برکتیں نازل کی ہیں۔ کہ وُہ وحی اور فرشتوں کے اُترنے کا مقام اور انبیاء کرام کے رہنے کی جگہ اور حضرت موسیٰؑ کے زمانے سے انبیاء کی عبادت گاہ اور انبیاء علیہم السلام کا قبلہ ہے۔ —————— اور قیامت کو مخلوق اسی زمین میں محشور ہوگی۔ اور ہر طرف سے نہریں اور باغ اسے گھیرے ہوئے ہیں۔"

اسی کے نواح میں خدا کا منظہرِ تجلّی جبل طُور اور اسی میں مقدس وادی طوٰی ہے۔ جن کا آیاتِ ذیل میں خاص عزت و احترام کے ساتھ ذکر ہے۔

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا قَالَ لِاَهْلِهِ امْکُثُوْا اِنِّیْ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْ اٰتِیْکُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّکُمْ تَصْطَلُوْنَ ہ

جب موسیٰؑ نے مدّت پوری کر لی اور اپنی اہلیہ کو لے کر چلے۔ طور کی جانب ایک آگ دیکھی۔ اپنی اہلیہ سے فرمایا۔ کہ ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے، شاید میں اس کے پاس سے کوئی خبر یا چنگاری لے

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

آؤں تاکہ تم تاپ لو۔ پھر جب آگ کے پاس گئے تو برکت والی زمین میں وادی ایمن کے کنارے درخت کی طرف سے آواز آئی۔ کہ اے موسیٰ! بے شک میں ہوں۔ اللہ رب سارے جہانوں کا

یہ وادئ طویٰ وہی مقدس وادی ہے۔ جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتیاں اتارنے کا حکم دیا گیا تھا۔

"جبکہ موسیٰؑ نے آگ دیکھی تو اپنی اہلیہ سے کہا تھا۔ بلاشبہ میں نے آگ دیکھی ہے، شاید کہ میں تمہارے پاس اس میں انگارا لے آؤں یا آگ پر کوئی راہ بتانے والا مل جائے۔ پھر جب آگ کے قریب آئے تو پکارے گئے۔ اے موسیٰ میں ہوں تمہارا پروردگار! پس اتار دو دونوں جوتیاں اپنی، بے شک تم مقدس وادئ طویٰ میں ہو۔"

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جس وادئ طویٰ کا ذکر ہے، یہ فلسطین کی وادی ہے جو یکے بعد دیگرے دو مرتبہ پاک و مقدس کی گئی" (درمنثور)

حضرت موسیٰؑ کو جوتیاں اتارنے کا حکم اس لیے دیا گیا۔ کہ ان کے تلوے اس پاک مقدس زمین سے مس کرکے برکت حاصل کریں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ مزید ارشاد فرماتے ہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ

اور جب کہا ہم نے داخل ہو تم اس گاؤں میں۔ پس کھاؤ اس سے جہاں سے چاہو۔ تم بافراغت۔ اور داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہو بخشش مانگتے ہیں ہم۔

البیضاوی لکھتے ہیں کہ یہ گاؤں جس میں حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کے ساتھ داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ بیت المقدس (یروشلم یا اریحا) تھا۔

قرآن کہتا ہے:

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ

یا مانند اس شخص کے کہ گزرا اوپر ایک گاؤں

خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوشِهَا قَالَ اَنّٰى يُحْيِيْ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ط

کے اور وہ گرا ہوا تھا اور چھتوں اپنی کے کیونکر زندہ کرے گا اس کو اللہ پیچھے موت اس کی کے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت الیاسؑ یا حضرت خضرؑ نے بیت المقدس کو تباہی کے بعد دیکھا جسے بخت نصر نے تباہ کیا۔ اور یہ آیت اسی ضمن میں ہے:

قرآن مقدس میں یہ بھی ہے۔ کہ:

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ه

اے قوم ارض مقدس میں جو تمہارے لیے اللہ پاک نے لکھ دی ہے داخل ہو جاؤ اور پیٹھ دے کر اُلٹے نہ پھرو ورنہ خسران میں پڑ جاؤ گے۔

یہ ارضِ مقدس فلسطین کا علاقہ ہے۔ اس پاک سرزمین کے ساتھ مسلمانوں کی دائمی وابستگی احادیث سے ثابت ہے۔ جیساکہ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:

"سوائے تین مسجدوں کے اور کسی (مسجد) کے لیے طویل سفر نہ کیا جائے مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور یہ میری مسجد (یعنی مسجد نبوی)" (مشکوٰۃ)

اس سے ثابت ہے کہ مسجد حرام یعنی کعبۃ اللہ، مسجد نبوی اور مسجدِ اقصیٰ ایک ہی لڑی کے انمول موتی ہیں۔ اسی سلسلے میں آپ نے فرمایا۔ کہ:

" آدمی کی اپنے گھر میں نماز تو ایک نماز ہے اور محلہ مسجد کی نماز پچیس نمازوں کے برابر ہے اور جامع مسجد کی نماز پانچ سو نمازوں کے برابر ہے۔ اور مسجد اقصیٰ میں ایک نماز پچیس ہزار (اور بعض روایات کے مطابق پچاس ہزار) نمازوں کے برابر ہے اور میری مسجد میں ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔"

(مشکوٰۃ، ابنِ ماجہ)

صحیح مسلم میں ہے کہ:-

"نماز فرض ہونے کے بعد سولہ ماہ تک نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی جاتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ کعبے کی طرف

منہ پھیر لیں اور اس رُخ نماز پڑھا کریں۔"

رسولِ اکرمؐ نے معراج سے واپسی پر سفرِ اسراء و معراج کا تذکرہ سناتے ہوئے فرمایا۔ کہ :

"معراج کی رات میرے پاس بُراق لایا گیا۔ بُراق ایک چار پایہ ہے سفید رنگ کا گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا۔ اس کا قدم حدِ نظر تک پڑتا تھا۔ میں، براق پر سوار ہوا اور بیت المقدس میں آیا۔ براق کو میں نے اس زنجیر سے باندھا، جس سے انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے، پھر میں مسجد میں گیا اور دو رکعت نماز مسجد میں پڑھی۔ پھر میں مسجد سے باہر آیا اور جبریل میرے پاس ایک برتن شراب کا اور ایک دودھ کا لے کر آیا۔ میں نے دودھ لے لیا۔ جبریلؑ نے کہا۔ آپ نے فطرت کو اختیار کیا ہے (مسلم شریف)

اسی طرح احادیث و روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ مسجدِ اقصیٰ میں انبیاؑ سابق نے آپ کی متابعت میں نماز ادا کی، اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فتحِ بیت المقدس کے بعد کہا تھا :۔

" اس شہر کے ہم مالک ہیں۔ اور ہم عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کے یہودیوں اور عیسائیوں سے بہتر وارث ہیں۔"

علاوہ بریں قیامت تک کے تعلق کا یوں پتہ چلتا ہے کہ قربِ قیامت کی ایک علامت یہ ہو گی کہ :

"مؤذن قریب سے اذان دے گا (یعنی اس جگہ سے جہاں سے سب سُن سکیں)، حسین رضؓ کہتے ہیں کہ اس مقامِ قریب سے بیت المقدس مراد ہے۔"

بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے بارے میں علاّمہ جلال الدین سیوطی نے بھی تفسیر جلالین میں نہایت قدر و منزلت ظاہر کی ہے اور لکھا ہے : کہ یہ اعلیٰ عبادت گاہ اور زیارت گاہ ہے۔ یہی وہ اعلیٰ و برتر مقام تھا۔ جہاں خدا تعالیٰ نے اپنے فرشتے حضرت جبریلؑ کو حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجا تھا۔ یوحنا اور زکریاؑ کو بشارت دی تھی۔ حضرت داؤدؑ کو مسجدِ اقصیٰ کا نقشہ دکھایا تھا۔ روئے زمین کے کل چرند و پرند کو آپؑ کے تابع بنایا تھا۔ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں پیغمبروں نے قربانیاں ذبح کیں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اور اپنے پنگوڑے میں گفتگو فرمائی اور یہاں سے آسمانوں پر اٹھائے گئے

یاجوج ماجوج روئے زمین پر استیلاء حاصل کریں گے، سوائے بیت المقدس کے۔ یہی وہ مقام ہو گا جہاں خدائے قادر ان کو نیست و نابود کر دے گا۔ یہی وہ متبرک مقام ہے جہاں حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت مریمؑ دفن ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یوم حشر میں تمام بنی آدم دوبارہ زندہ ہو کر فیصلہ کے لیے اکٹھے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے ساتھ مسجد اقصیٰ میں جلوہ گر ہو گا اور انصاف کرے گا۔ مختصر یہ کہ یہ مقام صدہا انبیاء و مرسلین کا مولد، مسکن اور مدفن ہے۔ اس لیے مسلمان ہی اس کے مالک ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہی بلا تخصیص تمام انبیاء و مرسلین پر ایمان کو جزو ایمان اور برحق مانتے ہیں۔

جہاں تک یہودیوں کے اسے ارض موعود قرار دینے اور اس دعوے کا تعلق ہے کہ یہ ان کے باپ دادا کی میراث ہے، جو خدا نے ان کو عطا کی ہے۔ اس کی حقیقت دوسرے باب میں دی گئی تفصیلات سے واضح ہو جاتی ہے۔ تاریخی تحقیقات اور آثار قدیمہ کی اکتشافات کی رو سے یہ بات محتاج دلیل نہیں ہے کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے تقریباً تین ہزار سال پہلے فلسطین کے علاقوں میں کنعانی یا کنعنی قبائل آباد تھے۔ یہ قبائل جزیرۃ العرب سے ہجرت کر کے فلسطین پہنچے تھے اور خود فلسطین کا قدیم نام بھی کنعان تھا۔ بارہ سو برس قبل مسیح جب بنی اسرائیل (جنھیں اہل فلسطین عبرانی کہتے تھے) فلسطین میں داخل ہوئے تو عرب قبائل نے ان کی شدید مزاحمت کی اور آخر دو ڈھائی سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد ہی وہ فلسطین اور بیت المقدس پر قابض ہو سکے۔

(۱۰۴۹ ق م) یہودی بیرونی قوم تھے اور انہیں اس وجہ سے عبرانی کہا جاتا تھا کہ وہ نسل کشی کے مرتکب ہو کر فلسطین پر قابض ہوئے تھے۔ شمالی فلسطین میں وہ صرف پانچ سو برس تک آباد رہے اور جنوبی فلسطین میں ان کے قیام کی مدت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو سو برس رہی اور عرب فلسطین میں یہودیوں کے داخلے سے پہلے بھی دو ہزار برس سے آباد تھے اور یہودیوں کے ۱۳۵ء میں مٹ جانے کے بعد بھی وہ شمالی فلسطین میں ڈھائی ہزار سال سے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ اس لیے یہ سرزمین عربوں کی ہے نہ کہ یہودیوں کی۔

باب چہارم
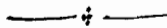
مسجد اقصےٰ

"صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے (حصولِ ثواب کی خاطر) رختِ سفر باندھنا چاہیئے۔ مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ نبوی"۔

(ارشادِ رسولِ مبارک صلعم)

وہ مقدس مقامات جن کی بدولت یہ مقدس شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کی عقیدتوں کا مرکز ہے، اکثر و بیشتر شہر کی مشرقی پہاڑی (موریہ) پر ایک احاطہ میں ہیں، جسے اہلِ اسلام حرم شریف کے نام سے پکارتے ہیں اور جو بیت المقدس کا مقدس ترین حصہ ہے۔ ڈاکٹر برکلے کے بیان کے مطابق حرم شریف ۳۶ ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔ مسجد الاقصیٰ اور قبۃ الصخرہ بھی، جو صدیوں سے شہر کی عظمت و تقدس کا نشان ہیں، اسی حرم میں ہیں۔ حرم میں جگہ جگہ بلند مقامات ہیں۔ جنھیں مسلمان "محراب" کہتے، مقدس سمجھتے اور ان کے سامنے نوافل ادا کرتے ہیں۔

قدیم مؤرخین نے حرم شریف میں بنے ہوئے محرابوں اور گنبدوں کا جس انداز میں ذکر کیا ہے۔ وہ موجودہ حالات سے قطعاً مختلف ہے۔ آج ان میں کئی ناپید یا مشکوک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلیبیوں نے اپنے نوّے سالہ دَور میں حرمِ مقدس میں بعض غیر معمولی تبدیلیاں کیں اور تین نسلیں گزرنے کے بعد جب صلاح الدین رحؒ نے اسے بحال کرایا، تو اکثر مقامات غائب اور روایات محو ہو چکی تھیں۔

حرم شریف ابن الفقیہ ۹۰۳ء میں لکھتا ہے کہ "حرم شریف کا طول ایک ہزار

ورع اور عرض سات سو ورع ہے۔ اس کی عمارتوں میں چار ہزار چوبی شہتیر، سات سو سنگی ستون اور پانچ سو پیتل کی زنجیریں ہیں۔ ہر رات ایک ہزار چھ سو فانوس روشن ہوتے اور ان کے لیے ایک سو چالیس غلام مامور ہیں۔ ہر ماہ سو قسط (فی قسط سوا تین سیر) روغن زیتون خرچ ہوتا ہے۔ حرم شریف کے اندر سولہ بڑے صندوق قرآن مجید کے مجلدات کے ہیں۔ وضو کے لیے چار حوض اور واعظین کے لیے پانچ منبر ہیں۔ مسجد اور گنبدوں کی چھتوں پر مٹی کے بجائے جست کی ۴۵ ہزار چادریں چڑھائی گئی ہیں۔ مسجد کے اندر ستر ورع (گز) لمبے مستورات کے لیے تین مقصورے ہیں۔ حرم شریف کے اندرونی و بیرونی دروازوں کی تعداد پچاس ہے۔" جبکہ ابن عبد ربہ اس کے دس سال بعد یہ کہتا ہے۔ کہ:

"حرم شریف کی مبارک عمارتوں میں ڈیڑھ ہزار فانوس روشن کیے جاتے ہیں۔ دروازے پچاس اور ستون ۶۸۴ ہیں۔ سخرہ کے اندر تئیس اور باہر اٹھارہ ستون ہیں۔ اس گنبد پر جست کی ۳۳۹۲ چادریں ہیں۔ جن پر صیقل پیتل کی ۱۰۲۱۰ تختیاں جڑی ہیں۔ اس قبہ میں روشنی کے لیے ۴۶۴ فانوس روشن کیے جاتے ہیں۔ جو تانبے کی زنجیروں اور کنڈوں میں لٹکے رہتے ہیں۔ ہر زنجیر ۱۸ ورع لمبی ہے۔ بڑی تقطیع کے چھ قرآن مجید، جن کا ہر صفحہ کھال کے پورے قطعہ کا ہے۔ رحلوں پر دھرے رہتے ہیں۔ حرم محترم میں دس محرابیں، پندرہ گنبد، چوبیس چوبچے (حوض) اور چار مینار اذان کے لیے ہیں۔ مسجد، گنبد اور میناروں سب کی چھتوں پر ملمع شدہ چادریں ہیں خدمت کے لیے ۲۳۰ مملوک ہیں۔ جنھیں سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے، روغن زیتون کی ماہانہ سات سو قسط ابراہیمی (فی قسط = نو پونڈ) مقرر ہیں، ایک جدید ترین سفر نامہ کے مطابق حرم مقدس کی لمبائی ۱۲۰۰ گز اور چوڑائی ۶۶۰ گز ہے۔ حرم میں جا بجا زیتون، سرو اور نارنج کے درخت ہیں۔ اور اس کے دروازے چودہ ہیں۔ جن میں اکثر بند رہتے ہیں۔

مساحت

فٹ

دسویں صدی عیسوی میں مقدسی اور ابن الفقیہہ اس کا طول x عرض ۱۵۰۰ x ۱۰۵۰

ناصر خسرو اور ادریسی ۱۲۰۰ x ۱۰۸۰ فٹ بتاتے ہیں۔ سلطان صلاح الدینؒ کی فتح کے

ایک عرصہ بعد ۱۳۵۵ء میں ابنِ بطوطہ نے ۷۵۲ × ۴۳۵ ذرع مالکیہ، صاحب مثیر الغرام نے ۱۳۵۱ء میں ۶۳۸ × ۴۳۸ ذرع لکھا ہے۔ جبکہ ۱۴۹۶ء میں مجیر الدین ۴۸۵ × ۹۱۳½ فٹ بیان کرتا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ زمانۂ قدیم سے دورِ جدید تک احاطۂ حرم کی حدود میں کچھ زیادہ ردوبدل نہیں ہوا۔ البتہ ۱۹۶۷ء میں مولانا شیر علی نے اس کا طول و عرض ۱۲۰۰ گز × ۶۶۰ گز بتایا ہے۔ اور یہ اضافہ شاہ حسین کے عہد میں حرم کی تزئین نو کے دوران میں ہوا ہے۔

حرم شریف کے دروازے

مختلف ادوار کے مؤرخین و زائرین نے دروازوں کے ناموں اور تعداد میں فرق کیا ہے۔ اس سلسلے میں سر سی ولسن کی مدد سے جو نقشہ مختلف ادوار کے دروازوں میں مطابقت و شناخت کا ترتیب دیا جا سکا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے:

ابن الفقیہ ۹۰۳ء	ابن عبدربہ ۹۱۳ء	مقدسی ۹۸۵ء	ناصر خسرو ۱۰۴۷ء	مجیر الدین ۱۴۹۶ء	لی سٹرینج ۱۸۹۰ء	۱۹۶۷ء
باب داؤد	باب داؤد	باب داؤد	باب داؤد	باب السلسلہ	باب السلسلہ	باب السلاسل
باب حطہ	باب حطہ	باب حطہ	باب حطہ	باب النبی	باب النبی یا باب البراق	باب النبی و (باب المغاربہ کے نیچے)
باب النبی	باب محمد	باب النبی	باب النبی	باب الاقصی القدیم	(پرانا دہرا دروازہ جسے تیغا کر کے بند کر دیا گیا ہے)	
..	..	ابواب مریم	باب عین الصلوان — صلاح الدین ایوبی نے تیغا کرا دیا			
باب الرحمہ و باب التوبہ	باب الرحمہ و باب التوبہ	ابواب الرحمہ (دو عدد)	باب الرحمہ و باب التوبہ	باب الرحمہ و باب التوبہ	باب الرحمہ و باب التوبہ	باب الرحمہ و باب التوبہ
باب الاسباط ..	ابواب الاسباط (چھ عدد)	باب برکۃ بنی اسرائیل	باب الابواب (۵ عدد)	باب الحطہ ..	باب الحطہ ..	باب الحطہ ..
..	باب ہاشمی	ابواب ہاشمیہ	باب زاویہ صوفیہ	باب الدویداریہ	باب العتم و باب شرف الانبیاء	باب العتم و باب شرف الانبیاء
..	–	–	–	..		

؞	باب الولید	باب الولید	؞	باب الغوانمہ	باب الغوانمہ / باب الغوانم
باب ام خالد	؞	باب ام خالد	باب الحدید یا	باب الحدید یا	باب الحدید یا
؞	؞	؞	؞	باب القطانین	باب القطانین یا باب المتوضی
؞	؞	باب السکینہ	باب السکینہ	باب السلام	باب السلام

باب الواوی ـــــ وادیٔ جہنم کی طرف کھلتا تھا۔ اور باب التوبہ کے قریب تیغا کیا ہوا آج بھی موجود ہے

سرسی ولسن کے بیان کے مُطابق ان اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ حرم شریف کی اطرافُ جوانب میں مختلف زمانوں میں بہت کچھ ردّوبدل ہُوا۔ مثلاً محاربینِ صلیبی کی حکومت کے زمانے میں یا مسلمانوں کی دوبارہ تسخیر کے وقت یا اس وقت جب کہ سلطان سلیمان نے سولھویں صدی میں چاردیواری کو از سرِ نو تعمیر کرایا۔ ان کے نام بدل گئے۔

مقدسی، ناصر خسرو، ابنِ فقیہہ اور ابن عبد ربّہٗ کے باب حطہ کا نام آجکل "باب البراق" یا "باب النبی محمدؐ" ہے۔ جس کا آدھا حصہ زمین کے اندر ہے۔ ناصر خسرو نے اس کے بارے میں یہ روایت لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اسی دروازہ سے حرم شریف میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا۔ جبکہ مقدسی کے باب النبیؐ، ابن الفقیہہ اور ناصر خسرو کے باب النبی اور ابن عبد ربہ کے باب محمدؐ، کو تیغا کر کے بند کر دیا گیا ہے۔ ناصر خسرو نے اس دروازہ کے بارے میں لوگوں کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ: "یہ سلیمانؑ کے زمانے کی تعمیر ہے۔ اور نبی کریمؐ شب معراج اسی راستے سے گزر کر مسجدِ اقصیٰ میں تشریف لائے۔ یہ راستہ مکہ معظمہ کی جانب کھلتا ہے۔ حرم شریف کے اس زمین دوز راستہ کی ڈیوڑھی میں دوہرے پٹ کے دروازے ہیں۔ اس کو زمین دوز بنانے کی وجہ یہ ہے کہ مضافات میں زنِ چھپےرُخ جو لوگ دور رہتے ہیں وہ شہر کے دوسرے محلوں کا چکر لگائے بغیر اندر ہی اندر حرم شریف میں آسکیں۔" لیکن اس مقام پر زمین دوز حجرے آج بھی نظر آتے ہیں جو مجیر الدین کے عہد میں "الاقصی القدیمہ" کہلاتے تھے۔ اور ان حجروں کے سرے پر ایک دوہرا پرانا دروازہ موجود ہے۔

مقدسی کے" ابواب مریم" اور ناصر خسرو کا" باب العین صلوان" محراب مریم کے قریب واقع تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو مغرب و شمال کی سمت کے سوا حرم میں آنے جانے والے تمام راستے بند کر دیئے اور اسی سلسلے میں ان دروازوں پر بھی تیغا کرا دیا گیا۔ ابن الفقیہہ کا باب الوادی، حرم شریف کے مشرقی جانب " وادی جہنم " کی طرف کھلتا اور قبۃ الصخرہ کے چبوترے کی درج البراق" (براق کا زینہ) کے مقابل واقع تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم شب معراج اسی دروازے سے حرم میں داخل ہوئے۔ یہ" باب البراق" اور" باب الجنائز" بھی کہلایا۔ اور" باب الذہب" سے ذرا مغرب میں ہٹ کر حرم کی دیوار کے اس حصے میں اب بھی تیغا کیا ہوا موجود ہے۔

ابن الفقیہہ اور ابن عبد ربہ کا باب الرحمۃ اور مقدسی کے بابین رحمہ ناصر خسرو کے باب التوبہ اور باب الرحمہ مشرقی دیوار کے وہ بند پھاٹک ہیں جنھیں فرنگی گولڈن گیٹ (باب الذہب) کے نام سے یاد کرتے ہیں، مگر مسلمان آج بھی انھیں باب الرحمہ اور باب التوبہ پکارتے ہیں۔ باب التوبہ کے بارے میں ناصر خسرو لکھتا ہے کہ یہی وہ دروازہ ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی تھی۔ ناصر کے عہد میں اس کے قریب ایک مسجد بنی ہوئی تھی اور آجکل اس مسجد کی جگہ کرسئ سلیمان ہے۔ سیوطی نے باب الرحمہ کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ مسجد اقصےٰ کے مشرق کی طرف اس دیوار میں واقع ہے۔ جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں ذکر فرمایا ہے

" فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِن قِبَلِهِ الْعَذَابُ (سورۃ الحدید۔ ع۲) اس کے سامنے کی وادی کو" وادیٔ جہنم" کہتے ہیں۔ خود یہ دروازہ (باب الرحمۃ) حرم شریف کی چار دیواری میں اندر کے رخ ہے۔ آیۂ مذکور میں جس دروازے کی طرف اشارہ ہے۔ اسے بند کرا دیا گیا ہے۔ رہا باب التوبہ تو یہ باب الرحمہ سے مل کر ایک ہی دروازہ بن جاتا ہے لیکن دونوں میں سے آجکل کسی میں بھی آمد و رفت نہیں ہو سکتی، باب التوبہ کے قریب اور باب الرحمہ اور باب الاسباط کے درمیان حضرت خضرؑ و الیاسؑ کا مسکن ہے۔" یہ دروازہ چھٹی صدی عیسوی میں تعمیر ہوا۔ اور صلیبیوں نے اسے" گولڈن گیٹ" (باب الذہب) کا نام دیا۔

مقدسی کا باب بہ کۂ بنی اسرائیل، اور ناصر خسرو کا" باب الابواب" محاربات صلیبیہ کے

بعد سے باب الاسباط کے نام سے مشہور رہے، اور حرم شریف کی شمالی دیوار کے مشرقی سرے اور "مسکن خضر و الیاس" کے قریب ہی واقع ہے۔

مقدسی، ابن الفقیہہ، ابن عبد ربہ کا باب الاسباط اور ناصر خسرو کا باب الابواب حرم کے مغرب میں شمالی دیوار کو لے جانے والا دروازہ ہے جو محاربات صلیبیہ سے اب تک باب الحطہ کے نام سے موسوم ہے۔ سیوطی لکھتا ہے۔ کہ اللہ تعالٰے نے بنی اسرائیل کو اسی دروازے سے حرم شریف میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا۔

مقدسی کے ابواب ہاشمیہ، ابن عبد ربہ کا باب الہاشمی، ناصر خسرو کا باب زوایا صوفیہ اور مجیر الدین کا باب الدویداریہ، آج کل باب صوفیہ یا باب شرف الانبیاء کہلاتا ہے سیوطی کے الفاظ میں "یہ حرم کے شمالی رُخ سے کھلتا ہے"

مقدسی اور ابن عبد ربہ کا باب الولید، اس زمانے کا باب الغوانمہ ہے جو مغربی دیوار کے شمالی سرے پر واقع ہے، سیوطی اسے "باب الخلیل" بھی کہتا ہے لیکن مقدسی کے بیان کے مطابق باب الخلیل یا باب ابراہیم باب الولید سے آگے جنوب کا دروازہ تھا۔ جیسے ناصر خسرو نے باب السقر لکھا ہے اور فی زمانہ باب الناظرہ کہلاتا ہے، سیوطی لکھتا ہے باب الناظر کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کبھی نہیں کھلا۔ پہلے زمانے میں اسے "باب میکائیل" کہتے تھے، اور ایک خبر کے بموجب حضرت جبرئیل نے شب معراج براق کو اسی دروازے پر باندھا تھا"

باب الحدید، سلطان صلاح الدین نے حرم شریف کی موجودہ مغربی دیوار میں، باب الناظر کے جنوب میں بنایا تھا۔ کسی زمانے میں اسے باب ارغون الکاملی بھی کہا جاتا تھا۔ مقدسی اور ابن الفقیہہ کا باب اُمّ خالد موجودہ باب القطانین (پنبہ فروشاں) ہے۔ باب القطانین اُن دروازوں میں ہے جنہیں از سر نو بنایا گیا ہے۔ سب سے پہلے اسے الملک الناصر بن قلاودون نے تعمیر کیا تھا۔ لیکن بعد میں گر کر بیکار ہو گیا اور تنکیز الہاشمی الناصری والی شام نے سلطان محمد ابن قلاودون کے حکم سے دوبارہ بنوایا۔ اس کے جنوب میں مڑتے ہی باب المتوضٰی (طہارت) یا باب المطارہ (بارکش) ہے۔ موجودہ ڈیوڑھی مرحوم علاؤ الدین بصیر نے بنائی تھی مقدسی اور ناصر خسرو کا باب داؤد موجودہ باب السلسلہ ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت داؤد اسی راستے حرم میں تشریف لاتے، باب السلام یا باب سکینہ اسی دروازے کے

قریب بنا ہوا ہے۔ موجودہ دور[1] میں حرم کے چودہ دروازے ہیں۔ ان میں سے اکثر مقفل ہیں۔ صرف جانب شمال دو دروازے کھلے رہتے ہیں۔ اردن کی فوجی چھاؤنی اسی طرف دیوارِ حرم کے ساتھ تھی۔

دالان

حرم شریف کے اندر چار دیواری کے ساتھ ساتھ جو دالان بنے ہوئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے ابتدائی عہد میں بھی اسی حالت میں اسی جگہ موجود تھے۔ یہ دالان مغربی اور شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ ہیں۔ جبکہ وادیٔ جہنم کے رُخ حرم شریف کی جو مشرقی دیوار ہیں، جس میں باب الرحمہ بنا ہوا ہے کوئی دالان نہیں۔ نہ ہی جنوبی حصے میں کوئی دالان ہے۔ مجیر الدین لکھتا ہے کہ:

> "چار دیواری کے اندر مغربی جانب کے تمام دالان الملک الناصر محمد ابن قلادون کے عہد (۱۳۱۰ء تا ۱۳۴۱ء) کی تعمیر ہیں۔ باب مغاربہ موجودہ باب النبیؐ کے قریب سے باب سلسلہ تک کا دالان ۷۱۳ھ (۱۳۱۴ء) میں باب سلسلہ کے قریبی مینار سے باب الناظر کا دالان ۷۳۷ھ (۱۳۳۶ء) میں اور باب الناظر سے باب الغوانمہ تک ۷۰۷ھ (۱۳۰۷ء) میں بنایا گیا۔ شمالی دیوار سے ملحقہ دالان ان عمارتوں کے ساتھ تعمیر ہوئے۔ جو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ بنی ہوئی ہے"

اس کے بعد ان کی وقتاً فوقتاً مرمت ضرور ہوتی رہی۔ لیکن یہ مجموعی طور پر بعینہٖ اسی حالت میں ہیں۔ جیسے ۱۴۹۶ء میں تھے۔

---
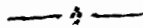
[1] یہ کیفیت ۱۹۶۷ء تک تھی۔ تازہ ترین حالات اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

مسجدِ اقصےٰ

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی

مسجد الاقصےٰ جس کی بدولت اس شہر کو مکہ اور مدینہ کے بعد مسلمانوں کے تیسرے مقدس ترین شہر کی حیثیت حاصل ہے، کی وجہ تسمیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شب معراج کی روایت ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی۔ (سورۃ بنی اسرائیل)

اقصیٰ کے معنے دُور کے ہیں اور اس لحاظ سے المسجد الاقصیٰ کا مطلب دُور کی مسجد ہوا۔ مسجد سے یہاں مراد بیت المقدس کے حرمِ مقدس کا پورا رقبہ ہے نہ کہ مسجد کی خاص عمارت کہ وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور واقعہ معراج کے وقت موجود نہ تھی۔

شبِ معراج کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک پَردار اسپ براق (بجلی) پر سوار اور حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے جلو میں تھے۔ آپ مکۃ المکرمہ سے طورِ سینا گئے۔ وہاں سے بیت لحم پہنچے اور پھر بیت المقدس تشریف لائے۔

ارشادِ رسول ؐ ہے کہ:۔

"جس وقت ہم بیت المقدس کے دروازے پر پہنچے (یعنی حرم کے احاطے پہ) تو جبریل ؑ نے مجھ کو اتارا اور براق کو ایک کنڈی سے باندھ دیا جس سے انبیائے سابق نے بھی اپنے گھوڑے باندھے تھے۔"

حرم شریف میں آپ اس دروازے سے جو بعد میں بابِ محمدؐ کے نام سے مشرف ہوا، داخل ہو کر اس چٹان پر چڑھے، جسے قبۃ الصخرہ کہا جاتا ہے اور جو

روایات کے مطابق ہیکل سلیمانی کے وسط میں تھی لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں مذبح تھا۔ (تفصیل آگے آتی ہے) اسی کے قریب انبیاء علیہم السلام کی جماعت سے آپؐ کی ملاقات ہوئی اور حضورؐ نے حضرت ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور دوسرے انبیائے سابق کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس مقدس چٹان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جبریلؑ کی معیت میں ایک نور کے زینے سے آسمان پر چڑھے اور جنت الفردوس اور اس کی نعمتوں کو دیکھا پھر ہفت افلاک طے کر کے باری تعالیٰ جل شانہ کے حضور پہنچے اور وہاں احکام صلوٰۃ ملے۔ اس کے بعد آپ دوبارہ زمین پر تشریف لائے اور اسی نور کے زینہ سے اتر کر صخرۂ مقدسہ پر قیام فرمایا۔ پھر جس طرح تشریف لائے تھے اسی طرح براق پر مراجعت فرمائی۔ اور رات ختم ہونے سے قبل مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ یہ شب معراج کی روایت کا خلاصہ ہے اور اسی روایت نے اہل اسلام کی نظر میں اس چٹان اور حرم کے رقبے کو متبرک و مبارک بنا دیا ہے۔

یہودی روایات

آج یہاں مسجد اقصیٰ واقعہ ہے۔ یہودی روایات کے مطابق اس جگہ کبھی ہیکل سلیمانی قائم تھا۔ اس ہیکل کو بخت نصر شاہ بابل نے چھٹی صدی ق م میں مسمار کر دیا۔ بابل سے واپسی پر یشوع اور زر و بابل نے ہیکل دوبارہ تعمیر کیا۔ لیکن یہ عمارت بھی رومی حملہ آوروں سے محفوظ نہ رہی، اور شہر کے ساتھ ہی تباہ و برباد ہو گئی اور یہودیوں کو شہر سے نکال دیا گیا۔ اس کے ایک عرصہ بعد یہودی پھر شہر میں آباد ہوئے اور شاہ ہیرود اعظم کے عہد میں شہر نے زبردست ترقی کی۔ کئی نئی عمارتیں تعمیر کی گئیں اور اس نے یہودیوں کو خوش کرنے کے لیے ہیکل از سر نو تعمیر کرایا۔ لیکن جیسا کہ اثری انکشافات سے پتہ چلتا ہے۔ یہ معبد بھی ۷۰ء میں رومی حکمران طیطس نے یروشلم کے ساتھ ہی پیوند زمین کر دیا۔ اکثر ماہرین آثار قدیمہ کی رائے میں موجودہ دیوار گریہ، حضرت سلیمانؑ کے ہیکل کی دیوار نہیں۔ بلکہ یہ اس عمارت کے باقی ماندہ آثار ہیں۔ جسے ہیرود نے تعمیر کرایا۔ اور جسے بعد میں رومیوں نے غارت کر دیا تھا۔

بلند کیا۔ مگر وہ بُری طرح ناکام ہوئے اور رومیوں نے سختی کے ساتھ اس بغاوت کو کچل دیا۔ شہنشاہ ہادریان نے یہودیوں کو جبراً ارضِ فلسطین سے نکال دیا اور بیت المقدس کا نام ایلیا رکھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمان جب بیت المقدس میں داخل ہوئے تو اس کا نام ایلیا تھا۔ اور صلح نامہ میں بھی یہی نام درج ہوا۔ مسلمان "القدس" کے نام سے پکارنے لگے۔

تعمیر

پروفیسر کریسویل لکھتا ہے کہ ہیرود نے ہیکل سلیمانی کی جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک عمارت تعمیر کی تھی۔ جو مشہور یہودی مؤرخ جوسیفس کے بیان کے مطابق تین دالانوں پر مشتمل تھی۔ اغل بغل کے دونوں دالان ۳۰ فٹ چوڑے پچاس فٹ اونچے تھے درمیانی دالان پندرہ فٹ چوڑا اور ایک سو فٹ بلند تھا۔ پوری عمارت چار قطاروں کے ۱۶۲ ستونوں پر قائم تھی اور اس کا رُخ شمالاً جنوباً تھا۔ داخلے کے دروازے بھی شمال رویہ تھے اور اس عمارت کے سامنے وسیع صحن تھا۔ اس عمارت کے مسمار ہونے پر عیسائیوں نے اس کی بنیادوں پر ایک گرجا تعمیر کر لیا۔۔۔۔ لیکن دوسرے فرنگی مؤرخین اور ماہرینِ آثارِ قدیمہ اس کی تائید نہیں کرتے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ہیرود کی عمارت تباہ ہو جانے کے بعد صدیوں اس جگہ ملبے اور غلاظت کے ڈھیر پڑے رہے، اور عیسائی یہود سے نفرت کی بنا پر تمام کوڑا کرکٹ بھی اسی جگہ پھینکا کرتے تھے۔۔۔

بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ ۱۴ھ مطابق ۶۳۸ء جب خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضؓ شہر میں داخل ہوئے۔ یہ شہر صدیوں تک پہلے رومی اور بعد ازاں بازنطینی تصرف میں رہ چکا تھا۔ ٹھیک پانچ سو سال قبل ہادریان نے شہر سے یہودی زندگی کے آخری آثار تک ختم کر دیئے تھے۔ اس نے قدیم شہر کو مکمل طور پر تباہ کر کے اس پر ہل چلوا دیئے اور اس کی جگہ ایک رومن آبادی "ایلیا کیپی تولینا" کے نام سے اُبھری اور جہاں کبھی ہیکل تھا اس جگہ جیوپیٹر کی قربان گاہ بنائی گئی۔ یہودیوں کے شہر میں داخل ہونے پر پابندی لگا دی گئی اور اگر کوئی داخل ہوتا تو اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ البتہ جب کنسٹنٹائن نے عیسائیت کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ تو اس کے ذوق اور اس کی والدہ کے شوق کی

بدولت شہر میں کئی عیسائی یادگاریں تعمیر ہوئیں، جن میں کلیسائے نشور بھی شامل ہے۔ کنسٹنٹائن کی والدہ ہیلنا کے حکم سے شہر کو رومی کافروں کی تمام یادگاروں سے پاک کر دیا گیا۔ اور ہیکل کی جگہ کسی نئی عمارت کی تعمیر بالکل ممنوع قرار دے دی گئی۔ میتھیو ۲۴ : ۲ میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ہیکل سے رخصت ہوتے وقت اپنے حواریوں سے کہا تھا کہ

"میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کا ایک پتھر دوسرے پتھر کے اوپر نہیں رہیگا"

اور انھوں نے یروشلم کے بارے میں بھی اسی قسم کی پیش گوئی کی تھی کہ:

تمہارے دشمن تم پر غالب آ جائیں گے۔ تمہیں اور تمہارے بچوں کو بھی ذبح کریں گے اور شہر تباہ ہو جائے گا"

البتہ کہا جاتا ہے کہ کنسٹنٹائن نے ہڈریان کی یہودیوں کے داخلہ پر پابندی کو کسی حد تک نرم کر دیا۔ اور سال میں ایک مرتبہ، مقررہ فیس ادا کرنے کے بعد، آخری ہیکل کی تباہی کے دن یہودی شہر میں داخل ہوتے اور اپنی تباہی کو یاد کر کے روتے۔ فلسطین میں تباہی کے بعد جو چند ہزار یہودی بچ رہے تھے۔ انہوں نے گلیلی کے گرد پناہ ڈھونڈلی تھی۔ اور جب فارس حملہ آور ہوا تو انھوں نے اسے اپنے لیے امید کی ایک کرن سمجھا اور نہ صرف حملہ آوروں کا خیر مقدم کیا بلکہ رضا کاروں کے طور سے ان میں شامل ہو گئے۔ ۶۱۴ء میں اہل فارس نے یروشلم پر قبضہ کر کے ہزاروں عیسائیوں کو تہ تیغ اور ان کے معبدوں کو لوٹا اور تباہ کیا۔ چودہ سال بعد ہرکولیس نے حملہ آوروں کو مار بھگایا اور اپنے انتقام کی آگ یہودیوں کے خون سے بجھائی۔

اسلامی روایات

دریں اثنا مکہ میں جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، پیغمبر آخرالزمان کی حیثیت سے دین اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے۔ اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ فلسطین میں بازنطینیوں کے احوال کا تذکرہ وحی الٰہی میں آیا جس میں ان کے مقدر کی پیش گوئی ان الفاظ میں کی گئی

"بازنطینی، ارضِ قریب سے معدوم ہو جائیں گے لیکن چند سال بعد وہ دوبارہ فتح یاب ہوں گے" (القرآن ۳۰:۱)

اس سے بھی زیادہ نمایاں تذکرہ یروشلم سورہ ۲-۱۴۲ میں ہے کہ ابتدائی ایام میں

سرورِ کائناتؐ اور ان کے جاں نثاروں کا یہ قبلہ تھا۔ پھر حکمِ الٰہی کے مطابق ان کا رُخ مکّہ کی سمت موڑ دیا گیا۔ اس سے بھی نمایاں اور واضح تذکرہ سورہ، کی پہلی آیت میں سرورِ کائناتؐ کے سفرِ معراج کے ذکر میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"عظیم ہے وہ خدا جو اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجدِ اقصےٰ لے گیا جس کے گرد و نواح میں ہماری برکتیں ہیں اور جہاں ہم نے اسے اپنی شان کے بعض مظاہر دکھائے۔"

اس آیتِ قرآنی کی توضیح و تشریح تمام تفاسیر، احادیث اور سرورِ کائناتؐ کی معاصر سوانح حیات ابن ہشام میں تفصیل سے موجود ہے۔ جس کا اجمالی تذکرہ ہم ابتدا میں کر چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جاہل و کافر قریش نے سرورِ کائناتؐ کے اس واقعہ کا مضحکہ اُڑایا لیکن شعور و آگہی کی دولت سے مالا مال ہستیوں نے آمنّا وصدّقنا کہتے ہوئے اسے قبول کیا۔۔ اور یہ پس منظر تھا جس میں حضرت عمرؓ، ایک فاتح کی حیثیت سے شہرِ مقدس میں داخل ہوئے اور اہلِ شہر کو پناہ دینے کے بعد ان کے سامنے صرف ایک اور ایک مقصد تھا کہ وہ جلد سے جلد اس مقدس مقام کو تلاش کرنا چاہتے تھے۔ جہاں سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، سفرِ معراج پر تشریف لے گئے۔ مثیر الغرام کے مصنف نے شداد ابن اوسؓ کی روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے معاہدۂ فتح لکھنے سے فرصت پائی تو وہ بطریق یروشلم سے مخاطب ہوئے۔ "ہمیں مسجد داؤد لے چلئے۔" بطریق نے تعمیل کی، حضرت عمرؓ تلوار باندھے ہوئے آگے آگے چلے۔ اس وقت چار ہزار صحابہ آپ کے جلو میں تھے۔ وہ سب تلواریں باندھے ہوئے تھے۔ ایک گروہ دوسرے عربوں کا تھا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔ (بطریق یہودی دشمنی کے پیش نظر اس مقام کی نشان دہی سے ہچکچا رہا تھا) بطریق، حضرت عمرؓ جو صحابہؓ کے جھرمٹ میں تھے، کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس طرح ہم شہرِ مقدس میں داخل ہوئے، وہ ہمیں اس گرجے میں لایا۔ جو کمامہ کے نام سے مشہور ہے اور کہا: "یہ مسجد داؤد ہے۔" حضرت عمرؓ نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ تھوڑی دیر تفکّر کیا۔ اور فرمایا "تو غلط کہتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کیفیت بیان فرمائی تھی۔ یہ جگہ اس کے مطابق نہیں ہے۔" بطریق اور آگے چلا اور ہمیں کلیسائے صیہون میں لایا اور وہی بات کہی، مگر حضرت عمرؓ نے دوبارہ فرمایا "تو غلط کہتا

ہے۔" بطریق پھر چلا حتیٰ کہ حرم شریف کے دروازہ تک (جو بعد میں بابِ محمدؐ کہلوایا) ہمیں لے آیا۔ اب سنو، کہ اس وقت گوبر، تمام حرم میں پھیلا ہوا تھا اور چٹان یا مسجدِ داؤد کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا، چنانچہ بطریق نے کہا" اس میں جانے اور آگے بڑھنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ گھٹنوں کے بل چل کر جائیں۔" حضرت عمرؓ نے ہر طرف نظر کی اور دیر تک غور و فکر کے بعد کہا:

"وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ۔ یہی وہ جگہ ہے۔ جس کی کیفیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان فرمائی۔"

حضرت عمرؓ حرم شریف کے اگلے حصے کی طرف بڑھے۔ جو مغرب سے (یعنی جنوب مغرب سے) ملا ہوا ہے اور انھوں نے اپنے ہاتھوں سے کوڑے کو اٹھا اٹھا کے دامن میں بھرنا شروع کیا۔ اور ہم سب نے جو ان کے ساتھ تھے۔ ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کو لیے ہوئے روانہ ہوئے اور ہم بھی ان کی اتباع میں پیچھے پیچھے تھے۔ اور کوڑے کو وادی میں پھینک دیا۔ جو وادیٔ جہنم کہلاتی ہے۔ پھر ہم کوڑا اٹھانے کے لیے واپس آئے اور اسی طرح حضرت عمرؓ اور ہم جو ان کے ساتھ تھے۔ برابر کوڑا اٹھا اٹھا کے پھینکتے رہے۔ حتیٰ کہ اس مقام کو جہاں اب مسجد قائم ہے، پوری طرح صاف کر دیا۔" لیکن حضرت عمرؓ نے ہدایت فرمائی کہ جب تک یہ جگہ بارش کے پانی سے تین مرتبہ نہ دھل جائے، یہاں نماز ادا نہ کی جائے، بعد ازاں جنوب کی طرف وہ صاف جگہ کی طرف بڑھے اور نماز کا قصد کیا۔

مثیر الغرام میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے کعب الاحبار (کہ یہودی سے مسلمان ہوئے تھے) پوچھا۔ کہ "تم کیا کہتے ہو۔ مسجد یا قبلہ کس جگہ رکھا جائے" کعب نے جواب دیا۔ کہ اس کے واسطے چٹان کے عقب میں جگہ رکھو جس سے دو قبلے ہو جائیں گے۔ یعنی ایک قبلہ موسیٰؑ اور دوسرا قبلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔" لیکن امیر المؤمنین نے فرمایا:

"اے ابو اسحٰق ابھی تک تمہارا میلان یہودیوں کی طرف ہے۔ مسجد، چٹان کے (عقب میں نہیں) سامنے رہے گی۔"

پھر حضرت عمرؓ حرم شریف کے سامنے (یعنی جنوب) کے رُخ بڑھے پھر مغرب کی طرف بڑھے اور فرمایا۔ کہ آؤ اسے مسجد کی جگہ بنا لیں۔"

اذان، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن، حضرت بلالؓ نے وہی اپنے آقا و مولا

کے وصال مبارک کے بعد سے حضرت بلال رضؓ نے آپ کی یاد میں اذان دینا ترک کر دیا تھا لیکن امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کے اصرار اور صحابہ کبار کی آرزو پر حضرت بلالؓ نے اس موقعہ پر اذان دی۔ اور سب نے امیر المؤمنین کے پیچھے نماز ادا کی۔

حضرت عمرؓ کے قافلہ میں صحابۂ رسول کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ان میں سے دو کا ذکر بطورِ خاص آتا ہے کہ جنہوں نے یروشلم کو اسلامی تعلیمات کا گہوارہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ پہلے صحابی رسول حضرت عُبیدہ بن الصامت ہیں کہ جنہیں شام میں "قاضی اور مبلّغ" بنا کر بھیجا گیا تھا۔ حضرت عمرؓ، اصحابِ رسولؐ کا بے انتہا احترام کرتے تھے۔ اس لیے انھیں اپنے معمول کے فرائض کے علاوہ تبلیغ و تعلیم کا فریضہ بھی سونپا گیا تھا۔ اب حضرت عُبیدہ کو شہر قدس کا قاضی بنا دیا گیا۔ اور انھوں نے اسی عہدہ پر شہر قدس ہی میں انتقال فرمایا۔ اصحابِ رسولؐ میں سے دوسرے جنھوں نے دینی مقاصد کے تحت شہر قدس میں سکونت اختیار کی، حضرت شدّادؓ بن اوس تھے۔ جو اپنی سادگی اور علمِ حدیث کی بنا پر بہت محترم تھے۔ انھوں نے بھی اسی شہر میں جان دی۔

حضرت عمرؓ نے شہر چھوڑنے سے قبل صخرہ اور براق باندھنے کے قریب اس جگہ جہاں انھوں نے اپنے ہمراہیوں سمیت نماز ادا کی تھی۔ ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔

سادہ سی مسجد

حضرت عمرؓ کے حکم یا ایما سے اس خرابہ پر جو مسجد اٹھائی گئی، اس کا تذکرہ کسی عرب مؤرخ یا تاریخ دان نے نہیں کیا۔ اس کے برعکس عیسائی مؤرخین تھیوفینس، الیاس ناصبی اور میکائیل شامی نے اپنی اپنی تاریخ میں سقوطِ یروشلم اور ہیکل کی جگہ ایک مسجد کا موجود ہونا لکھا ہے۔ پروفیسر کریسول کے نزدیک ان بیانات میں افسانوی رنگ شامل ہو گیا ہے۔

ایک قدیم سیّاح آرکلف نے بھی ایک سادہ سی مسجد کا ذکر کیا ہے۔ یہ سیّاح ۶۷۰ء میں مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے بیت المقدس آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ

> "جس جگہ قدیم ایّام میں ہیکل سلیمانی کی شاندار عمارت تھی، اس کی مشرقی دیوار کے نزدیک مسلمانوں نے ایک مستطیل شکل کی عمارت تعمیر کر لی ہے، جہاں وہ نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ عمارت معمولی طرز کی ہے۔ جسے انھوں

نے بعض پرانے آثار پر بڑے بڑے شہتیر رکھ کر بنایا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سادہ سی عمارت میں بیک وقت تین ہزار نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔"

یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سادہ لیکن ایمان کی حرارت سے گرم عمارت کب تک قائم رہی البتہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس سادہ سی ابتدا کے پچاس سال بعد اس شہر میں اسلامی طرز تعمیر کی عظیم یادگاروں کا آغاز ہوا۔ اور یروشلم کو قطعی طور پر اسلام کے تیسرے مقدس شہر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کا رومی نام ختم کر دیا گیا اور یہ بیت الحرام کے مقابلہ میں "البیت المقدس" کہلایا، جو بیت المقدس اور القدس ہو گیا۔ اور آخر اسے القدس شریف بھی کہا جانے لگا۔

سرورِ کائناتؐ کی ذاتِ اقدس اور حضرت عمرؓ سے اس شہر کی وابستگی ہی کا احساس تھا کہ حضرت معاویہؓ نے اپنی خلافت کا اعلان، دمشق کے بجائے اس جگہ کرنے کو ترجیح دی اور اس کے جانشینوں کے دور میں یہ شہر واقعتہً دینی مرکز بن گیا، کیونکہ مکہ و مدینہ ان کے حریفوں کے تصرف میں تھا۔ حضرت عمرؓ کی اس سادہ سی عمارت کی جگہ مسجدِ اقصیٰ اٹھائی گئی۔ اور سرورِ کائنات کے سفرِ معراج پر روانہ ہونے کی جگہ قبۃ الصخرہ بلند ہوا (جسے یورپی مؤرخین غلط طور پر مسجد عمر کا نام دیتے ہیں) اور وہ احاطہ، جس میں یہ عظیم یادگاریں قائم ہیں حرم شریف کہلوایا۔

بانیٔ مسجد

ان دونوں عظیم عمارتوں کی اساس پانچویں اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان نے ۷۲ھ (۶۹۰ء) میں اٹھائی۔ اس سلسلے میں اس کے سیاسی عزائم کو بہت کچھ ہوا دی جاتی ہے لیکن اس معاملہ میں اس کی تحریک اور فعل دونوں کی اساس دین اور دینی شعائر پر تھی۔ لوگوں کو اس دور میں جبکہ مکہ و مدینہ اس کے حریفوں کے قبضہ میں تھا۔ اس جگہ حج کی ترغیب دینا دراصل سرورِ کائناتؐ کے اس ارشاد پر مبنی تھا، جس میں فرمایا ہے کہ

"صرف تین مسجدوں، مسجد حرام، مسجد اقصےٰ اور مسجد نبویؐ کی زیارت کے لیے رختِ سفر باندھنا چاہیئے۔"

عصری اور اثری انکشافات کے مطابق خلیفہ عبد الملک صرف قبۃ الصخرہ کی تعمیر مکمل کر سکا۔ اس کی تمام تر توجہ گنبدِ صخرہ اور اس کی زینت پر مرکوز رہی۔ بنا بریں وہ مسجد اقصےٰ کی

تعمیر و تزئین کی طرف دھیان نہ دے سکا۔ چنانچہ مسجد اقصیٰ کی تعمیر کے سلسلے میں باپ کے ادھورے کام کو اس کے سعادت مند بیٹے ولید نے تکمیل تک پہنچانے کا عزم کیا۔ اور یہ خیال عمل کی شکل اختیار کر کے مسجد اقصیٰ کو نیا رنگ و روپ دے گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مؤرخین نے مسجد اقصیٰ کی سب سے پہلی مستقل تعمیر کو عبدالملک کے بجائے ولید بن عبدالملک سے منسوب کیا ہے۔ اسی ولید کے زمانے میں سندھ کی سرزمین پر اسلام کا پرچم لہرایا۔ یہ مسجد چھ سال میں مکمل ہوئی اور اس پر ولید کی سلطنت کے سات سالہ محاصل خرچ ہوئے۔ مسجد کے تمام دروازوں پر سونے چاندی کی تختیاں لگیں۔ مسجد کو ہفتے میں دو بار دھویا جاتا اور مسجد کی خدمت کے لیے ۳۰۰ آدمی مقرر تھے۔ ابن عساکر کے مطابق ولید کی بنا کردہ عمارت میں چار مینار تھے۔ جن میں سے تین مغربی جانب ایک ہی قطار میں اور ایک باب الاسباط کے قریب تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اموی خلفاء نے محض ہنگامی دور ہی میں بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کو عزت و توقیر کی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ عام حالات میں بھی اسے وہ مقدس ترین مقام اور شہر سمجھتے رہے۔ چنانچہ سلیمان بن عبدالملک نے بھی تخت خلافت پر رونق افروز ہونے کی تقریب، دمشق کے بجائے القدس میں منائی۔ وہ فلسطین کا اس قدر شائق تھا کہ اس نے رام اللہ کو اپنا دوسرا دارالسلطنت قرار دے کر، یہاں ایک عظیم الشان محل اور ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی۔

آٹھویں اموی خلیفہ، جو اپنی سادگی، قناعت اور راستی کی بنا پر تاریخ میں عمر ثانی کہلائے، نے قبۃ الصخرہ کو اس قدر عظمت دی کہ اپنے پیشروؤں کے تمام گورنروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی دیانت و امانت کے لیے اس مقدس مقام پر حلف دیں۔

عبّاسی دَور

عباسی خلفائے نے بھی اپنے پیشروؤں کی اس روایت کو زندہ رکھا اور ان میں سے کم و بیش تین تو ایسے تھے۔ جنہوں نے ایک زائر کی حیثیت سے مسجد اقصیٰ میں حاضری دی۔ عبّاسی خاندان کے بانی المنصور تو دو مرتبہ یہاں حاضر ہوئے۔ پہلی مرتبہ مکہ اور مدینہ سے ہوتے ہوئے وہ القدس پہنچے اور دوسری مرتبہ سیدھے یہاں آئے۔ المہدی نے مسجد اقصیٰ کی برکتوں

سے مالا مال ہونے کے لیے اپنے بیٹے شہزادہ ہارون الرشید کے ساتھ القدس کا سفر کیا۔
المامون کا ذوق و شوق تو اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ قبۃ الصخرہ میں بعض نمایاں تبدیلیاں اسی
کے حکم سے ان کے بھائی خلیفہ معتصم کی نگرانی میں ہوئیں جو اس وقت شام کے گورنر تھے۔
مثیر الغرام کا مصنف راوی ہے کہ ۷۴۶ء میں کہ ابھی اموی خلافت کے سانس
باقی تھے۔ اور اس کے دو سال بعد سفاح کے ہاتھوں انجام کو پہنچی۔ ایک زلزلہ آیا جس نے مسجد
کے مشرقی و مغربی حصہ کو گرا دیا۔ اس زلزلے کے تقریباً چوبیس سال بعد تک کہ انارکی کا دور
تھا مسجد اقصیٰ اسی ویرانی کے عالم میں رہی حتیٰ کہ منصور کو اطلاع دی گئی، لیکن اس کے
خزانہ میں روپیہ نہیں تھا" چنانچہ اس کے حکم کے مطابق مسجد کے چوبی دروازوں پر منڈھا ہوا
خالص سونے اور چاندی کا پترا اکھاڑا گیا اور اسے گلا کر درہم و دینار میں ڈھال دیا گیا۔ جب
تک تعمیر مکمل نہ ہوئی یہی روپیہ خرچ ہوتا رہا۔ اس تعمیر میں مسجد کے مشرقی و مغربی حصے از سر نو
کیے گئے۔ ۱۵۴ھ (۷۷۱ء) میں خلیفہ منصور القدس آیا اور ایک ماہ تک شہر میں مقیم رہا۔ تاکہ
مسجد اقصیٰ میں ادائیگی نماز کی فضیلتوں سے مالا مال ہو سکے۔ بدقسمتی سے تھوڑے ہی عرصہ
بعد ایک اور زلزلہ میں المنصور کے حکم سے تعمیر شدہ عمارت زمین پر آ رہی۔ مثیر الغرام کا کہنا ہے
کہ منصور کے جانشین المہدی کو اطلاع ہوئی تو اس نے اسے از سر نو تعمیر کرنے کا حکم دیا۔
محترم مسجد کی تعمیر کا کام ۱۶۳ھ (۷۸۰ء) میں شروع ہوا۔ چونکہ ولید بن عبدالملک کی عمارت عرض
میں تنگ، اور طول میں ضرورت سے زیادہ تھی اس لیے خلیفہ مہدی کے حکم سے اس کا طول کم
اور عرض بڑھا دیا گیا۔ اور جب تعمیر مکمل ہو چکی تو خلیفہ مہدی نے اپنے پیشروؤں کی طرح اس خیر و
برکت والی مسجد میں، جس کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ اس کے چوگرد کو برکت
دی ہے۔ بغداد سے آکر نماز ادا کی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دورِ خلافت میں حضرت عمرؓ کے دور سے زائرین حرم
کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ سرکاری حکام کے علاوہ مفسرین، محدثین، صوفیا
اور اہل اللہ اور ہر قسم کے مردوں اور عورتوں نے زیارت، عبادت، طلب علم اور اقامت
کے لیے اس شہر کا سفر کیا اور جن لوگوں نے دینی اغراض سے یہاں اقامت اختیار کی
بیت المقدس کے ایک مسلمان مؤرخ نے ان کے نام تیس صفحات میں گنائے ہیں۔ ان میں
سے ایک ام درداء ہیں جنہوں نے معاویہ کی پیشکش ٹھکرا دی تھی اور جو سال کا نصف

دمشق میں اور نصف یروشلم میں بسر کرتیں تاکہ غرباء کو ان تک رسائی میں سہولت رہے" اور دوسری نامور خاتون صوفی، رابعہ بصریہ ہیں۔ جو ترک سکونت کر کے القدس آئیں اور اپنی زندگی یاد الٰہی میں بسر کرنے کے بعد یہیں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

مسلمانوں کے علاوہ عیسائی زائرین بھی بکثرت شہر مقدس کی زیارت کو آتے۔ لیکن عہد ہارون تک ان زائرین کو یہاں اقامت کی اجازت نہیں تھی۔ ہارون رشید نے شارلیمان کی درخواست پر پہلی مرتبہ القدس میں عیسائی زائرین کے لیے ہوسٹل کی تعمیر کی اجازت دے دی جس میں خدمت کے لیے ننوں کو یورپ سے بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ ہارون رشید نے اسلامی قوانین کے تحت عیسائیوں اور یہودیوں کو مکمل مذہبی آزادی دے دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بیت المقدس میں کوئی یہودی معبد نہیں بنا اور اب تک اگر کسی یہودی معبد کا ذکر ملتا ہے، تو ایک ایرانی سیاح کی یادداشت میں، جو صلیبی جنگوں سے پچاس سال قبل بیت المقدس آیا تھا۔ البتہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مقدس مقامات شہر میں بکثرت تھے، بالخصوص مسلمانوں کے لیے تاریخ کی رفتار بیت المقدس کی عظمت اور شوکت میں بتدریج اضافہ کرتی چلی گئی۔ خلافت کے سنہری دور کا زائر ابن حوقل دسویں صدی عیسوی میں لکھتا ہے کہ:

"شہر قدس رام اللہ کے برابر ہے لیکن جہاں تک مسجد اقصیٰ کی وسعتوں کا تعلق ہے دنیائے اسلام میں اس کی نظیر نہیں ہے۔"

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مسجد کا لفظ عرب مؤرخین نے صرف مسجد اقصیٰ کی عمارت کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اس لفظ سے ان کی مراد اس پورے رقبہ سے ہے۔ جو حرم شریف میں شامل ہے۔ اور تمام مینار، گنبد، دالان، قبۃ الصخرہ اور بعض دوسرے مقدس مقامات وغیرہ مسجد اقصیٰ کے معنوں میں داخل ہیں۔ قبۃ الصخرہ کو فرنگیوں نے "مسجد عمرؓ" کا نام دیا تھا۔ حالانکہ وہ مسجد یا نماز باجماعت کا مقام نہیں ہے بلکہ صحن مسجد میں واقعہ گنبدوں میں سب سے بڑا گنبد ہے جو محض اس کے نیچے موجود متبرک چٹان کے لیے تعمیر کرایا گیا۔

دوسرے عرب جغرافیہ نویسوں کی طرح مقدسی نے بھی پورے رقبہ حرم کو المسجد یا مسجد الاقصیٰ اور نماز کی اصلی جگہ جسے ہم مسجد اقصیٰ کہتے ہیں کو المغطیٰ لکھا ہے لیکن ہم

"حرم شریف" پورے احاطۂ حرم اور مسجد یا مسجد اقصےٰ کے الفاظ خاص مسجد کی عمارت کے لیے استعمال کریں گے۔ اس جگہ یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ فلسطین میں قبلہ جنوب کی سمت ہے۔

نویں صدی کے ربع آخر تک فلسطین و شام خلفائے بغداد کے قبضہ میں تھے۔ لیکن ۲۶۴ھ (۸۷۸ء) میں ان کے والی قاہرہ ابن طولون نے بغاوت کر دی اور مصر پر قبضہ اور ملک شام فتح کر لیا اور خود مختار بن بیٹھا۔ خاندان طولونیہ کی حکومت جنوبی شام اور فلسطین میں ۹۰۴ء تک رہی جس کے بعد اخشیدیہ کا دور آ گیا۔ مگر وہ بھی ۹۶۹ء میں ختم ہو گیا۔ اور فاطمی خلیفہ المعز نے اسے مصر و شام سے نکال باہر کیا۔

خلیفہ المعز کا جانشین العزیز تھا۔ اسی کے عہد میں (۹۸۵ء) مشہور عرب جغرافیہ دان بشاری المقدسی نے بیت المقدس کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ مقدسی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ بیت المقدس ہی کا رہنے والا تھا۔ اس کا خاندان شہر کے ان پہلے عرب فاتحین میں تھا جو یہاں آباد ہو گئے تھے۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷۸۰ء میں المہدی کی تعمیر سے ۹۸۵ء تک مسجد اقصیٰ پر کوئی افتاد نہیں آئی۔ بلکہ اسی سال تھوڑی مدت پہلے والی خراسان عبداللہ بن طاہر نے مسجد میں سنگ مرمر کے ستونوں کے برآمدے کا اضافہ کر دیا تھا۔

مقدسی کا بیان

مقدسی لکھتا ہے "مسجد اقصیٰ (مسجد اور حرم شریف) شہر بیت المقدس کے جنوب مشرقی گوشے میں واقع ہے۔ حرم کی سنگین چار دیواری کے پتھر طول میں کم و بیش دس ذرع (دس گز) ہیں۔ جس پتھر کی سلیں اس چار دیواری میں استعمال کی گئی ہیں، وہ نہایت سخت ہے۔ لیکن ان سلوں کو نہایت عمدگی سے تراش کر ان کے جوڑ نہایت پختگی سے ملائے گئے ہیں۔ عبدالملک (اور اس کے جانشین) نے جو عمارت تعمیر کی۔ اس میں چھوٹے مگر خوش قطع پتھر لگائے اور اوپر کنگرے بھی بنا دیئے۔ یہ مسجد بڑی خوبصورت، شاندار اور عظمت و شوکت میں جامع دمشق سے بھی بالاتر ہے۔ کیونکہ اسے بناتے وقت نصاریٰ کا بڑا کلیسا (کنیسۃ الکمامہ) بطور مدمقابل ان کے سامنے تھا۔ کنیسۃ الکمامہ کو دنیائے مسیحیت میں مقدس ترین گرجا سمجھا جاتا ہے کیونکہ نصاریٰ کے مطابق حضرت عیسےٰ کو سولی پر چڑھائے جانے کے بعد اسی

جگہ دفن کیا گیا) لیکن عباسی خلفاء کے زمانے میں زلزلوں نے صدر دالان (المغطّیٰ) کو شدید نقصان پہنچایا اور سچ یہ ہے کہ اس حصّہ کے سوا جو محراب کے اردگرد ہے۔ ساری عمارت گر پڑی۔ جس وقت خلیفہ المہدی کو اس کی خبر ہوئی۔ تو اس کے خزانے میں جو دولت موجود تھی۔ وہ مسجد کی دوبارہ تعمیر کے لیے کسی طرح کافی نہ تھی۔ چنانچہ اس نے صوبوں کے والیوں اور فوجی سپہ سالاروں کو مراسلے لکھے کہ ان میں سے ہر ایک شخص ایک ایک دالان کی تعمیر اپنے ذمے لے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور عمارت ایسی مضبوط اور زبردست تیار ہو گئی کہ پہلے کبھی نہ تھی۔ پرانی عمارت کا جو حصّہ گرنے سے بچ گیا تھا۔ مرمت کے بعد باقی رکھا گیا اور نئی عمارت کی زینت بن گیا۔ مسجدِ اقصےٰ کی صدر عمارت کے چھبیس دروازے ہیں، محراب کے مقابل کا دروازہ باب کلاں کہلاتا ہے اور اس کے کواڑوں پر پیتل چڑھا ہے، یہ دروازہ اتنا بھاری ہے کہ شہ زور اور مضبوط ترین آدمی ہی اسے جنبش دے سکتا ہے۔ اس کے دائیں اور بائیں طرف سات سات دروازے ہیں، جن پر پیتل چڑھا ہوا ہے۔ مسجد کے مشرقی پہلو پر گیارہ دروازے ہیں، لیکن یہ مُعرّی ہیں اور ان پر پیتل نہیں چڑھایا گیا۔ شمالی رویہ پندرہ دروازوں کے اُدھر سنگِ مرمر کے ستونوں کا ایک وسیع دالان ہے، جسے والیٔ خراسان عبداللہ بن طاہر نے تعمیر کرایا تھا صحن کے دائیں طرف (یعنی احاطۂ حرم کی مغربی دیوار سے ملے ہوئے) دالان ہیں، جن کے ستون سنگِ مرمر سے بنے اور اندر سے صندلا شدہ ہیں پیچھے کے رُخ یعنی حرم کی شمالی دیوار سے متصل پتھروں کو کھود کر دالان بنائے گئے ہیں

مقدسی نے مسجد کی عمارت کے اس حصہ کی بہت تعریف کی ہے، جو مسقف تھا اور جس کی جنوبی دیوار میں مسجد کی شاندار محراب تھی۔ اس حصہ پر ڈھلوان چھت پڑی ہوئی تھی۔ اوپر نہایت عالی شان گنبد تھا۔

مسجد کی تمام چھتوں کے نیچے چھت گیری کے طور پر جست کی چادریں لگی ہوئی تھیں لیکن شمالی دیواروں کے دالانوں سے ملحق چھت رنگین پتھروں اور رنگا رنگ نقوش سے مزیّن تھی۔

مقدسی مزید لکھتا ہے کہ "مسجد کے بائیں جانب (یعنی احاطۂ حرم کے مشرقی رُخ) دالان نہیں۔ مسجدِ اقصیٰ کا صدر دالان' احاطۂ حرم کی مشرقی دیوار تک نہیں آتا۔ اور یہ حصّہ

کبھی مکمل ہی نہیں کیا گیا) آج تک مسجد اقصیٰ اسی حالت میں ہے، مسجد اور مشرقی دیوار کے مابین جو خالی جگہ ہے۔ اسے آجکل حضرت سلیمانؑ کے اصطبل کی جگہ بتایا جاتا ہے حالانکہ اثری اکتشافات سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ قدیم الایام میں حضرت سلیمانؑ اپنے گھوڑے اس مقام پر باندھا کرتے تھے) اس کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ اولاً یہ کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ مسلمانوں کی نماز کے لیے مسجد احاطۂ حرم شریف کے مغربی حصے میں بنائی جائے۔ چنانچہ یہ حصہ جو جنوب مشرقی کونے میں واقع ہے۔ خالی چھوڑ دیا گیا تاکہ حضرت عمرؓ کے ارشاد سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ ثانیاً یہ کہ اگر عمارت کو احاطہ کے اس جنوب مشرقی کونے تک وسعت دی جاتی۔ تو چٹان صخرہ، مسجد کی بڑی محراب کے مقابل نہیں آتی تھی" ــــ مقدسی اور ابن الفقیہ ــــ (۹۰۳ء) نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"مسجد کے منبر میں ایک سنگ مرمر کی تختی پر "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اور محمد رسول اللہ صلعم" کندہ ہے۔"

تاریخ میں ہے کہ ۴۰۷ھ اور ۴۲۵ھ میں شدید زلزلے آئے۔ جن سے زبردست نقصان ہوا، لیکن مسجد محفوظ رہی، البتہ ۴۰۷ھ (۱۰۱۹ء) کے زلزلہ میں قبۃ الصخرہ کا گنبد گر پڑا اور ۴۲۵ھ (۱۰۳۴ء) کے زلزلے سے احاطۂ حرم کی بیرونی دیوار متاثر ہوئی۔ جسے فاطمی خلیفہ الظاہر نے از سرِ نو تعمیر کرایا۔ مزید برآں فاطمی خلیفہ نے مسجد کی تزئین اور آرائش میں بھی اضافہ کیا۔ یہ ۴۲۶ھ کا واقعہ ہے۔ کام کی نگرانی عبداللہ ابن الحسن القاری نے کی تھی۔ علی ہروی نے ۱۱۷۳ء میں بیت المقدس کی زیارت کے دوران اس سلسلے میں ایک کتبہ دیکھا، جو مسجد اقصےٰ کی چھت میں لگا ہوا تھا۔ کتبہ میں لکھا تھا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم ــــ پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گئی۔ جس کی چاروں اطراف ہم نے برکت دی۔ اللہ اپنے بندے، خادم اور نائب امیر المؤمنین علی ابوالحسن الظاہر الاعزاز الدین اللہ کی تائید و نصرت فرمائے۔ اللہ کی رحمت ہو، اس کے پاک اجداد پر اور سعادت مند اخلاف پر۔ انھوں نے اپنے خاص کارندے ابوالقاسم علی بن احمد کو حکم دیا کہ اس گنبد کی مرمت اور جلا

کا انتظام کرے، اللہ تعالیٰ اس کا حامی و مددگار ہو گا۔ یہ کام ذیقعد ۴۲۶ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچا"۔

علی ہروی لکھتا ہے کہ فاطمی خلیفہ کے حکم سے دروازوں پر از سر نو سونے کی مینا کاری کی گئی۔

مشہور ایرانی سیاح ناصر خسرو ۴۳۸ھ (۱۰۴۷ء) میں بیت المقدس آیا تھا۔ اس کے عہد میں مسجد میں کچھ تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ مقدسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانے میں مسجد کے چھبیس دروازے، پندرہ جانب شمال اور گیارہ جانب مشرق تھے۔ جبکہ ایرانی سیاح نے شمال میں صرف سات دروازے اور جانب مشرق دس دروازے بیان کیے ہیں۔

علاوہ ازیں ناصر خسرو، ابن طاہر کے دالان کا بھی کوئی تذکرہ نہیں کرتا، جو بقول مقدسی شمالی دروازے کے آگے بطور برآمدے کے بنایا گیا تھا۔ یہ تبدیلیاں غالباً ۴۰۷ھ اور ۴۲۵ھ کے زلزلوں کی وجہ سے ہوئیں۔ ناصر خسرو نے مسجد کے ستونوں کی تعداد ۲۸۰ بتائی ہے۔ اور یہ ستون مسجد قرطبہ کے ستونوں کے مشابہ تھے۔ اور چودہ چودہ ستونوں کی بیس قطاروں نے مسجد کو چودہ دالانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ دو ستونوں کا درمیان کا فاصلہ چھ ذرع (گز) تھا۔ ناصر کا اپنا بیان حسب ذیل ہے:-

"مسجد اقصیٰ شہر کے مشرقی رُخ پر واقع ہے۔ اس کی (یعنی احاطہ حرم کی) ایک دیوار وادی جہنم کے سرے پر ہے۔ اس دیوار کو باہر سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سو گز تک یہ بغیر چونا گچی کے صرف بڑے بڑے پتھر جما کر تیار کی گئی ہے۔ حرم قدس کے اندرونی رُخ دیوار کا بالائی حصہ بالکل مسطح ہے۔ احاطۂ حرم کے جنوب مشرقی کونے کے قریب مہد عیسیٰ" سے آگے ایک خوبصورت اور وسیع مسجد ہے، اس مسجد کو مسجد الاقصیٰ کہا جاتا ہے، اس مسجد میں اللہ جل شانہ، راتوں رات اپنے حبیبؐ کو شب معراج میں مسجد حرام سے یہاں لایا اور یہیں سے آپؐ آسمان پر تشریف لے گئے جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ

اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَى الَّذِيْ بَارَكْنَا حَوْلَهٗ (بنی اسرائیل)

ٹھیک اسی جگہ پر جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفرِ معراج شروع کیا تھا۔ لوگوں نے کمال ہنرمندی سے مسجد تعمیر کی ہے۔ اس میں خوبصورت قالینوں کا فرش ہے۔ ہمیشہ موجود رہنے اور کام کرنے کے لیے خاص خدام مقرر ہیں۔

جنوب مشرقی گوشے سے (حرم کی) جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ چلیں تو دو سو گز اور کوئی عمارت نہیں ہے۔ یہ گویا (احاطہ حرم کا) صحن ہے۔ مسجد کی صدر عمارت (المغطّٰی) بہت وسیع ہے۔ اس کی مغربی دیوار ایک سو بیس گز اور عرض ایک سو پچاس گز ہے۔ مسجد میں دو سو اسی سنگی کمانیں قائم ہیں۔ ستون اور پائے دونوں کو سیسہ سے محکم تر بنا دیا گیا ہے۔ سنگِ مرمر سے مسجد کی زینت بڑھائی گئی ہے۔ مسجد کے وسط میں جنوبی دیوار کے مقابل مقصورہ ہے، اس کی وسعت اتنی ہے کہ ساٹھ ستون اس کے اندر آگئے ہیں۔ بڑی رو بقبلہ محراب[1] پر مینا کاری کی گئی ہے اور اس کے دونوں جانب سنگِ مرمر کے ستون ہیں، جن کا رنگ عقیق احمر کا ہے۔ بڑی محراب کے سیدھے ہاتھ امیر معاویہ کی محراب[2] ہے اور بائیں طرف حضرت عمرؓ کی مسجد[3] کی چھت چوبی ہے جسے نہایت خوبصورتی سے تراشا گیا ہے۔ مسجد کے طول یعنی مشرقی دیوار میں دس اور عرض یعنی شمالی دیوار میں پانچ دروازے ہیں۔ ان دروں کی بلندی دس ہاتھ (بارہ گز) اور چوڑائی چھ ہاتھ (سات گز) ہے۔ مشرقی دیوار کا کل طول چار سو بیس گز اور مشرقی دیوار کا ایک سو پچاس گز ہے۔ انہی دروازوں میں ایک پیتل کا ہے، جسے نفاست اور خوبصورتی سے بنایا گیا ہے اور دیکھنے والے کو سونے کا معلوم ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ یہ دروازہ خلیفہ المامون نے بغداد سے بھجوایا تھا (اب ان دروازوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔)

ناصر خسرو نے حرم کے جنوب مشرقی گوشے اور مسجد کی مشرقی دیوار کے درمیانی صحن کا طول دو سو گز بتایا ہے۔

---

[1] موجودہ محراب دورِ ایوبی کی یادگار ہے۔

[2] وہ محراب جہاں کھڑے ہو کر حضرت معاویہ نماز ادا کرتے تھے۔

[3] اس جگہ حضرت عمرؓ نے نماز ادا کی تھی۔

ناصر خسرو مزید لکھتا ہے:

دیوارِ جنوبی پر ایک دروازہ ہے، جہاں وضو خانہ ہے..... حرم مسجد بہت طویل ہے۔ مسجد میں متعدد حوض اور تالاب ہیں، جو زمین کھود کر بنائے گئے ہیں، کیونکہ کل مسجد پہاڑی چٹان پر ہے۔ برساتی پانی ضائع نہیں ہوتا۔ بلکہ تالابوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ رنگ کے پرنالے بنے ہیں۔ جن کے ذریعے پانی بہتا ہے۔ ان پرنالوں کے نیچے سنگین حوض بنے ہوئے ہیں۔ جن کے پیندے میں سوراخ ہے۔ ان سوراخوں سے پانی بہہ کر نالیوں کے ذریعے سے بڑے حوض میں چلا جاتا ہے۔ جو آمیزش سے پاک صاف ہوتا ہے۔ مسجد کے حوضوں کی مرمت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ یہ سب سنگِ خارا کے بنے ہوئے ہیں۔ حوضوں کے دہانے اس قسم کے ہیں جیسے تنور اور کنوئیں کا منہ ہوتا ہے۔ اور ہر حوض کے اوپر ایک پتھر رکھا رہتا ہے۔ تاکہ کوئی چیز اس میں نہ گرے۔"

ناصر خسرو باب النبیؐ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

جن مقامات پر شہری آبادی نشیب میں ہے۔ وہاں مسجد میں صحن کی جانب سرنگ لگا کر زمین دوز دروازے نکالے ہیں۔ ان دروازوں سے ایک کو جو قبلہ رُو ہے، باب النبیؐ کہتے ہیں۔ اس کی چوڑائی دس گز اور بلندی سیڑھیوں میں کسی جگہ بیس گز اور کسی جگہ پانچ گز ہے۔ سرنگ کی چھت پر مسجد کی عمارت ہے۔ چھت بہت مضبوط ہے۔ اور اس میں ایسے بھاری پتھر لگے ہیں کہ عقل میں نہیں آتا۔ کہ قوتِ بشری نے انھیں اٹھا کر کس طرح یہاں پہنچایا ہو گا۔ رسول اللہؐ اسی دروازہ سے مسجدِ اقصیٰ میں داخل ہوئے۔"

خسرو مزید لکھتا ہے کہ:

"شام اور نواحی علاقوں کے لوگ، جو حج بیت الحرم مکہ ادا نہیں کر سکتے، ایامِ حج میں بیت المقدس کا رُخ کرتے اور تمام رسومات ادا کرتے ہیں۔ قربانی کے دن مکہ کی قربانیاں دیتے ہیں اور ذی الحجہ کے ابتدائی ایام میں بعض سالوں میں تو یہاں بیس ہزار سے بھی زائد افراد جمع ہو جاتے ہیں۔"

القدس کو یہ فخر و امتیاز محض مسجد الاقصیٰ کی بدولت حاصل تھا۔ خسرو نے اگرچہ یہودیوں اور عیسائیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے "جو بیت المقدس کے کلیساؤں اور کنشتوں کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔" لیکن جس طرح اس نے کلیسائے نشور اور دوسرے گرجاؤں کا ذکر کیا ہے، یہود کے کنشت کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہود کے داخلہ القدس پر جو پابندی لگائی تھی، وہ بتدریج نرم ہوتی گئی مگر خسرو کا یہ نامکمل بیان "یہودی کنشت" کے بارے ایک لاینحل مسئلہ ہے، کیونکہ اسلامی قوانین کے تحت کسی نئے معبد کی تعمیر کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ یہودیوں نے کسی رہائشی مکان کو معبد کی صورت دے لی ہو لیکن پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ کہ خسرو یا اس کے کسی ہم عصر مؤرخ نے حرم شریف کی مغربی دیوار، جو بعد میں دیوارِ گریہ کہلائی پر یہودیوں کی آہ و زاری کا ذکر تک نہیں کیا۔

امام الغزالی نے جو خسرو کے پچاس برس بعد القدس آئے اور جنہوں نے مغربی دیوار سے ایک تیر کے فاصلے پر اقامت اختیار کی۔ کسی معبد یا دیوارِ گریہ کا ذکر نہیں کیا۔ الغزالی نے جب تصوف اختیار کیا۔ اور مکہ و مدینہ کے بیچ بیت المقدس کی راہ لی۔ تو وہ بغداد کے سب سے بڑے تعلیمی ادارہ نظامیہ کے پرنسپل تھے۔ جہاں سے انہوں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ الغزالی جب شہر میں وارد ہوئے۔ مسجد اقصیٰ اور اس کے مضافات قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں سے ہمہ وقت گونجا کرتے اور اس کے چاروں طرف دینی درسگاہیں اور صوفیاء کے حجرے تھے، چنانچہ انھوں نے بھی ۱۰۹۵ء میں حرم شریف کے مشرق میں اقامت اختیار کی۔ اور مسجد اقصیٰ میں اپنی شہرہ آفاق کتاب احیائے العلوم کا آغاز کیا۔ یہ جگہ باب الرحمہ کے قریب تھی۔ کہ جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ "اس کے اندر رحمت و برکت ہے۔" (۱۳:۵۷) مسجد الاقصیٰ میں الغزالی کے خطبات اس قدر مؤثر اور دلپذیر تھے کہ مسلمانوں نے انھیں مجبور کیا۔ کہ وہ اسلامی احکام و روایات کو اپنے انداز میں لکھ دیں۔ چنانچہ ان کا کتابچہ "القدسیہ" اسی مطالبہ کی تکمیل ہے جو سلاست بیان اور جامعیت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔

بدترین دن

الغزالی کی زیارت کے چار سال بعد ۱۰۹۹ء میں "اسلام پر بدترین دن" آیا۔ جب ۱۴ جولائی

کو صلیبی گوڈ فری دی بوئلون کی کمان میں شہر مقدس پر قابض ہو گئے۔ جیسا کہ قبل ازیں کہا جا چکا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کا خون اس قدر بہایا کہ حرم شریف میں گھوڑوں کے گھٹنے خون میں ڈوب گئے۔ اس کے علاوہ ان یہود کو بھی جو پناہ کی تلاش میں اپنے "معبد" میں جمع ہو گئے تھے۔ عمارت سمیت زندہ جلا ڈالا۔ صلیبیوں نے حرم شریف کے پورے علاقہ پر قبضہ کر کے اسے "محاربین دیر" (KNIGHTS OF THE ORDER OF THE TEMPLE) (الداویہ) کو تفویض کر دیا۔ "محاربین دیر" کا دستہ قبۃ الصخرہ کی نسبت سے اسی زمانے میں ترتیب دیا گیا تھا۔ کیونکہ صلیبی قبۃ الصخرہ کو عہد مسیح کا دیر سمجھتے اور "ٹمپلم ڈومینی" سے موسوم کرتے تھے۔ وہ مسجد اقصیٰ کو "پے لے ٹیم" یا "ٹیمپلیم سالومنیس" (یعنی سلیمان کا ہیکل) کہتے تھے۔ انھوں نے مسجد اقصیٰ اور احاطۂ حرم کے قریبی حصوں میں بہت سی تبدیلیاں کیں لیکن قبۃ الصخرہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ البتہ مسجد کے مغرب میں جنوبی دیوار کے ساتھ اپنا اسلحہ خانہ تعمیر کیا (ناصر خسرو کے عہد میں اس جگہ محراب داؤد برآمدہ تھا) اور احاطۂ حرم کے جنوب مشرقی حصہ میں واقع تہہ خانہ کو اپنا اصطبل بنا لیا۔

مشہور صقالی جغرافیہ نویس ادریسی نے اپنی تالیف نزہت المشتاق مؤلفہ ۱۱۵۴ء میں اس کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بیت المقدس پر عیسائیوں کے قبضہ سے لے کر تادم تحریر الداویہ نامی دستہ کے سپاہی مسجد الاقصیٰ کو رہائش گاہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ (اور اس طرح اس پاک و مقدس مسجد کی بے حرمتی کے مرتکب ہوتے ہیں) ادریسی کی عبارت ہے:

"مسجد اقصیٰ، بیت المقدس کی بڑی مسجد ہے۔ اور دنیا بھر میں اس سے زیادہ طول و عرض کی کوئی مسجد نہیں، البتہ ممکن ہے کہ اندلس کی مسجد قرطبہ اس سے زیادہ وسیع ہو۔ کیونکہ اس کی چھت لوگوں کے کہنے مطابق اقصیٰ سے بڑی ہے۔ پھر بھی اقصیٰ کا صحن (یعنی احاطہ حرم) مسجد قرطبہ کے صحن سے بڑا ہے۔ احاطہ حرم کے اس حصے میں جو محراب کی طرف ہے مسجد کی عمارت اور ستونوں کی متعدد قطاروں پر سنگین گنبد بنے ہوئے ہیں۔ باقی نصف (احاطہ) غیر مسقف کھلا ہوا صحن ہے۔ قبۃ الصخرہ کا جنوبی دروازہ مسجد کی صدر عمارت کے رخ کھلتا ہے۔ جہاں مسلمان پہلے نماز ادا کیا کرتے تھے لیکن

جب سے شہر پر صلیبیوں کا قبضہ ہوا ہے، تحریر ہذا کے وقت (۱۱۵۴ء) تک انہی کا قبضہ ہے، اس وقت سے انھوں نے مسجد کو بہت سے کمروں میں تقسیم کر دیا ہے۔"

علی ہروی جو صلاح الدین کے فتح بیت المقدس سے چند ہی سال قبل صلیبی دور میں یہاں آیا۔ لکھتا ہے:

"صدر عمارت کا صدر دالان پندرہ قدم (۴۸ فٹ) اور جنوب سے شمال ۹۴ قدم (۲۳۵ فٹ) لمبا ہے۔ مسجد کے گنبد کی بلندی ۶۰ ذرع (۳۰ گز) اور محیط ۹۶ ذرع (یعنی قطر ۷ اگز) ہے۔ گنبد کے نیچے کا ہر پہلو ۶۰ فٹ ہے۔ کل مسجد کا طول شمالاً جنوباً ۲۲۲ فٹ ہے۔"

یہ ناسور ۹۰ سال تک رستا رہا اس وقت تک جبکہ صلاح الدین ایوبیؒ نے ۱۱۸۷ء میں اسے صلیبیوں سے واگزار کرا لیا۔ اس سے بیس سال قبل ایک ہسپانوی سیاح ربی بنجامن بیت المقدس آیا اور اس نے اپنی زیارتوں کے سلسلہ میں مقدس مقامات اور شہروں کا ذکر کیا ہے وہ مسلمانوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ البتہ اس کے عہد میں دو سو یہودی شہر میں موجود تھے جو چمڑے کا کاروبار کرتے تھے لیکن بنجامن کے کچھ عرصہ بعد ایک دوسرا یہودی سیاح ربی پیٹاشیا صرف ایک یہودی انگریز کا ذکر کرتا ہے۔ بنجامن کسی یہودی کنشت کا ذکر نہیں کرتا۔ البتہ قبۃ الصخرہ کے بارے میں لکھتا ہے۔ کہ صلیبی اسے "ٹمپلم ڈومینی" کہتے ہیں اور قبہ کی مخالف سمت مغرب میں قدیم ہیکل کی دیواریں ہیں جسے باب الرحمہ کہا جاتا ہے اور یہودی اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ بنجامن کا یہ بیان عینی شہادت پر نہیں بلکہ شنید پر مبنی ہے کیونکہ باب الرحمہ مغربی سمت نہیں مشرقی سمت تھا۔ اس نے اپنے بارے میں بھی یہ نہیں کہا کہ اس نے اس دیوار کی زیارت کی ہے۔ پھر بھی بنجامن اس لحاظ سے قابلِ اعتنا ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ یہودیوں کے اس مرکز عقیدت کا حوالہ دیا۔ جو بعد میں دیوار گریہ کہلائی۔ بلاشبہ مذہب پرست یہودی کنسٹنٹائن کے عہد سے ہیکل قدیم کی زیارت کے لیے گاہ بگاہ بیت المقدس میں آتے رہے لیکن یہ انفرادی یا اجتماعی طور پر یہود کا کوئی مذہبی فریضہ نہیں تھا اور ان کا یہ تصور بھی آثری یا تاریخی شواہد پر مبنی نہیں کہ حرم قدس کی دیواروں کا نچلا حصہ قدیم ہیکل کے باقیات ہے، اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے کب سے حرم کی مغربی دیوار کے بیرونی حصہ کو رسمی طور سے عقیدت کا مرکز قرار دیا۔ قوی امکان یہ ہے کہ یہ تدریجی عمل کا نتیجہ ہے۔

جیسے مسلم حکام نے محسوس نہیں کیا۔ ۱۱۸۷ء کے بعد بیت المقدس میں یہودی زندگی کی بحالی صلاح الدین کی رحم دلی کی مرہونِ منت تھی۔ مشہور یہودی مورخ گریٹز کے مطابق ـــ یہودی صلاح الدین کی سلطنت کو امن کا مسکن سمجھتے تھے" ـــ چنانچہ ان کی تعداد جو صلیبیوں کے عہد میں ایک رہ گئی تھی۔ بعد کے مسلم حکمرانوں کے دور میں بتدریج بڑھتی گئی۔ اور عیسائی یورپ کے یہودی امن کی تلاش میں فلسطین آتے رہے۔

صلاحُ الدّین ایّوبی

صلاح الدین کس قدر رحم دل تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے فتح القدس کے بعد ان عیسائیوں کو جنہوں نے مغربی مؤرخین کے بقول مسلمانوں کا اس قدر قتلِ عام کیا تھا۔ کہ حرم قدس میں ان کے گھوڑے گھٹنوں تک خون میں نہا نہا گئے معمولی معاوضہ کے عوض بخش دیا۔ بلکہ معمّر مردوں اور عورتوں کو اس سے بھی مستثنیٰ رکھا اور بیواؤں اور یتامیٰ کو تحفے دیئے۔ ہزاروں افراد کو بلا معاوضہ رہا کر دیا۔ القدس میں صلاح الدین کا داخلہ حضرت عمرؓ کی آمد سے بھی زیادہ اہمیت کا باعث بنا، وہ سرورِ کائناتؐ کے سفرِ معراج کی سالگرہ کے دن یعنی ۲۷ رجب کو القدس میں داخل ہوا۔ اور مسلمانوں نے اسے نیک فال سمجھا۔ لیکن اس قدر تاخیر ہو چکی تھی۔ کہ وہ جمعہ کی نماز ادا نہ کر سکا۔ ابنِ اثیر کے بیان کے مطابق اس نے حکم دیا۔ کہ عمارات کو پہلی حالت میں درست کیا جائے، صلیبی الداد یہ نے اقصیٰ کے مغربی حصہ میں رہائشی مکان، گودام اور پاخانے وغیرہ تعمیر کر لیے تھے۔ سلطان صلاح الدین نے مسجد کو ان تمام نجاستوں سے پاک کیا اور سات روز تک تمام شرفاء، علماء، اور عامیوں نے فرشِ مبارک کو پانی سے سات مرتبہ دھویا۔ اس کی دیواروں سے میل و گندگی کو صاف کیا اور عمارت کو عرقِ گلاب میں نہا نہا دیا۔ آئندہ جمعہ کو صلاح الدّین اپنی فاتح فوج اور علماء کی کثیر تعداد کے ساتھ، جو تمام علاقوں سے جمع ہوئے تھے مسجدِ قدس میں سجدۂ شکر بجا لانے کے لیے حاضر ہوا، قاضیٔ دمشق نے اس موقعہ پہ ایک طویل خطبہ دیا، جس میں اُس نے قرآن، اسلامی تاریخ اور روایات کی رُو سے اس مسجدِ مقدس کی اہمیت بیان کی اور انتباہ کیا۔

"اے فرزندانِ توحید! کہیں اس فریب میں مبتلا نہ ہو جانا کہ تمہاری فتح

تمہاری تلواروں کی بدولت ہے۔ بلکہ فتح اللہ کا فضل ہے کہ فتح ہمیشہ اسی کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس کی نافرمانی کرنے لگو جس نے تمہیں فتح سے نوازا ہے۔ اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اس کے احکام پر عمل پیرا ہو۔ وہ تمہیں مزید فتوحات دے گا۔ اس کے دشمن کا تدارک کرو اور اس سرزمین کو غلاظتوں سے پاک رکھو۔"

پھر مسجد قدس کی فضائیں اذان کی صدا سے گونج اٹھیں۔ قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کے فرشوں کے پتھر پھر سے مسلمانوں کی پیشانیاں چومنے لگے۔ سلطان صلاح الدین نے مسجد کی بحالی اور تطہیر کی طرف توجہ دی اور اس کی یاد میں کتبہ آج بھی مسجد کی درمیانی محراب کے اوپر موجود ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط مسجد اقصیٰ اور اس مقدس محراب کی بنا تقوٰی پر ہے۔ ۵۸۳ھ میں جب اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو اپنے حقیر بندے اور نائب یوسف بن ایوب ابو مظفر سلطان صلاح الدنیا والدین کے ہاتھوں فتح کرایا، تو اس نے مسجد اقصیٰ اور اس محراب کی بحالی کا حکم دیا۔ وہ اللہ سے دعا کرتا ہے کہ خدائے کریم اسے اپنے فضل و کرم کی شکرگزاری کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی عفو و رحمت سے توابین و مستغفرین میں داخل کرے۔"

صلاح الدین، اس کی وہی پہلی سی عظمت اور شان و شوکت بحال کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس مسجد اور اس کے شہر کو اسلامی تعلیم و تمدن کا گہوارہ بنانے کا خواہاں تھا چنانچہ اس نے مسجد اقصیٰ میں تعلیم و تدریس کی سابقہ روایات کو قائم کرنے کے ساتھ ساتھ شہر میں کئی نئے خیراتی اور تعلیمی ادارے قائم کیے۔ اور اپنے نام پر اعلیٰ تدریس کا ایک مدرسہ علماء اور صوفیاء کے لیے قیام گاہوں کی اساس رکھی۔ اس کے جانشینوں اور نائبین نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا، مسجد حرم اور اس سے باہر اپنی نشانی کے لیے کئی یادگاریں چھوڑیں ان میں سے سلطان کے بھتیجے الملک المعظم عیسٰے نے مسجد کے شمال میں ایک دالان بنایا جس کے سات دروازے تھے۔ بیٹے الافضل نے ۱۱۹۳ء میں حرم کے جنوب مغربی کونے میں مسجد المغاربہ کی بنا رکھی اور باب المغاربہ سے باہر کی تمام زمین کا شمالی افریقہ کے علماء، طلباء، زائرین اور مسجد کے نام پر دینی وقف قائم کیا۔ اس حصہ حرم اور اراضی کا

مسجد اور وقف کے لیے انتخاب اس لیے نہایت عمدہ تھا کہ باب المغاربہ کے اندر اور باہر کی زمین کو سرور کائنات کے سفر معراج سے خصوصی نسبت تھی۔ اس لیے اسے باب النبیؐ یا باب البراق بھی کہا گیا۔ اور سرور کائناتؐ جہاں براق النبیؐ سے اترے تھے اسے حرم میں ایک دروازے کے مغربی سمت، ایک دالان کی صورت میں جسے مسجد البراق بھی کہا گیا، محفوظ کر لیا گیا تھا۔

ایک اور قبہ جو عہد صلاح الدین میں تعمیر ہوا وہ سرور کائناتؐ کے آسمان پر تشریف لے جانے سے نسبت رکھتا ہے۔ ۱۲۰۰ء میں بیت المقدس کے گورنر نے اس جگہ کے قبہ کو از سر نو تعمیر کرایا۔ جہاں سرور کائناتؐ نے معراج کی شب آسمان کے سفر پر روانہ ہونے سے قبل نماز ادا کی تھی۔

صلاح الدین نے مسجد کی عظمت و شوکت اور شہر کے عزت و احترام کے لیے ایک اور اقدام بھی کیا۔ اہل صلیب نے اپنے وحشیانہ دور میں شہر کے قبرستانوں سے اکثر بزرگ اور نامور ہستیوں کی قبروں کو صاف کر دیا تھا، سلطان غازی نے باب الرحمہ کی دیواروں کے ساتھ اپنی مہم کے شہداء کو مدفون کرنے کا حکم دیا اور اس علاقہ کو "گنج شہیداں" یا شہیدوں کے قبرستان کا نام دیا گیا۔ قبل ازیں بھی یہ جگہ معروف ہستیوں (مرد و خواتین) کا مدفن تھا۔ اصحاب رسولؐ، عبیدہ اور شداد اسی جگہ مدفون ہوئے تھے اور فاطمہ بنت معاویہ کو بھی اسی مقام پر دفن کیا گیا تھا اور بعض اہم شخصیتوں کو جو دوسرے شہروں میں جاں بحق ہوئیں۔ ان کی وصیت کے مطابق اسی قبرستان میں مٹی دی گئی۔ چنانچہ فاطمیوں سے قبل مصر کے دو حکمرانوں کو جن میں ایک نے قاہرہ اور دوسرے نے دمشق میں انتقال کیا۔ تدفین کے لیے یہیں لایا گیا۔

سلطان صلاح الدین نے مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کی اسلامی شان و شوکت کی بحالی کے لیے جو اقدامات کیے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاصر اور متاخر مؤرخین نے بیت المقدس، حرم شریف، اور اس کے مقدس مقامات کے بارے میں متعدد کتب لکھیں اور اس سلسلے کا ابتدائی کام صلاح الدین کے معاصر ابن عساکر نے کیا جس کا بلیشہ ”حسنہ بیت المقدس میں لکھا گیا۔ یا مسجد اقصیٰ میں لیکچر کی صورت میں سامنے آیا۔ اس نے زیارت اقصیٰ کو نہایت اہمیت دے دی جو بالآخر باقاعدہ شکل اختیار کر گئی۔

زائرین قبۃ الصخرہ، مسجد اقصیٰ اور دوسرے مقدس مقامات کی زیارت مقررہ رسومات کے مطابق کرنے لگے۔

مصر کے مملوک سلطانوں اور عثمانی خلفاء کے دور میں بھی اس کی اہمیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ مملوک سلطان محمد بن قلاوون نے اپنے عہدِ حکومت (۱۳۱۰ء تا ۱۳۴۰ء) میں محراب داؤد سے متصل حرم کی جنوبی دیوار کی مرمت کرائی اور مسجد اقصیٰ کے جنوبی گوشہ میں سنگِ مرمر کی سلیں بچھائی گئیں۔ اور بڑی محراب کے دائیں بائیں دو روشن دان بنائے گئے۔

۱۴۷۵ء میں سلطان قایتبائی حج مکہ سے واپسی پر بیت المقدس آیا۔ اور مسجد اقصیٰ میں بیٹھ کر دستور قدیم کے مطابق اپنے حکام کے خلاف شکایات سنیں۔ اس کے عہد میں پہلی مرتبہ انکشاف ہوا کہ یہودیوں نے جنھیں سلطان صلاح الدین نے یورپی عیسائیوں کے ظلم و تشدد سے نجات دلائی اور پناہ دی تھی۔ شہر میں ایک "تنگ و تاریک سا کنشت" بنا لیا ہے۔ یہ مسئلہ ایک شافعی قاضی کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے فیصلہ دیا کہ عمارت چونکہ یہود کی ملکیت ہے، اس لیے اسے تجارتی یا رہائشی اغراض کے لیے تو استعمال کر سکتے ہیں، مگر اسے کنشت کے طور استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ بعض افراد نے اس فیصلہ کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور یہ عمارت منہدم کر دی۔ یہودیوں نے سلطان سے اپیل کی، جس نے نہ صرف متعلقہ افراد کو سزا دی بلکہ یہودیوں کو کنشت تعمیر کرنے کے لیے قانونی تحفظ دے دیا۔ یہ واقعہ ۱۴۷۳ء کا ہے۔ چنانچہ جب سلطان ۱۴۷۵ء میں مسجد اقصیٰ میں بیٹھا، تو ابھی یہ مسئلہ زندہ تھا، سلطان نے اقصیٰ مسجد کے قریب حرم شریف میں بڑے پیمانے پر المدرسہ الاشرافیہ قائم کرنے کا حکم دیا۔ جو مجیر الدین کے مطابق حرم مقدس کا تیسرا ہیرا تھا۔ مملوک کے دور میں حرم شریف میں چار نئے مینار اور متعدد دالان تعمیر کیے گئے اور یہ وہی تھے، جنھوں نے منگولوں کو شمالی فلسطین میں عبرت ناک شکست دی اور سرزمین مقدس میں صلیبیوں کے آخری اڈے ختم کیے۔ انہی کے دور میں مجیر الدین نے کہ قاضی شہر تھا، اپنی کتاب میں مسجد اقصیٰ کی جو کیفیت قلم بند کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۴۹۶ء سے اب تک مسجد کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اگرچہ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۲ء مسجد کی وسیع پیمانے پر مرمت ہوئی۔ لیکن اس سے نقشہ میں کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ مسجد میں شمال کی طرف سے داخل ہوں تو قبلہ کے رخ سے ایک دو ...

غربی جانب دو دروازے تو صحن میں کھلتے ہیں، ایک دَر اس عمارت کا راستہ ہے، جو صلیبی عہد میں "مخازن دیر" کا اسلحہ خانہ تھی جسے مجیر الدین مسجد نساء کے نام سے یاد کرتا ہے۔

مجیر الدین لکھتے ہیں:

"مسجد اقصیٰ شمالاً جنوباً صدر محراب سے صدر دروازے کی دہلیز تک ایک سو ذرع (۲۳۰ فٹ) لمبی ہے۔ اس میں محراب کا اندرونی خم اور شمالی دروازہ کا سائبان شامل نہیں۔ اس کا عرض مشرقی دروازے سے مغربی دروازہ تک ۷۶ ذرع (۱۰۷ فٹ) ہے۔ (ان خطوں کی موجودہ پیمائش بھی ۲۳۰ × ۱۰۷ فٹ ہے) مشرقی دروازہ سے مہد مسیح کو جاتے ہیں صحن حرم کی طرف مسجد کے دس دروازے ہیں، دس دروازے شمال میں ہیں گویا ہر دالان کے سرے پر ایک دَر ہے۔ پھر مشرقی، مغربی اور ایک تیسرا دروازہ وُہ ہے جس سے "جامع النساء" نامی عمارت میں جاتے ہیں۔ یہ وسیع ایوان مسجد اقصیٰ کا غربی حصہ ہے، اس میں شرقاً غرباً دہرا دالان اور نہایت مضبوط دس لداؤ ہیں۔ یہ عمارت فاطمی خلفاء کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی"

علامہ جلال الدین سیوطی ۱۴۷۰ء میں بیت المقدس آئے تھے۔ انھوں نے محرابوں کے بارے میں جو کچھ لکھا، آج بھی محرابیں اسی کے مطابق ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اکثر لوگوں کا اتفاق ہے کہ محراب زکریاؑ مسجد کے مشرقی دروازے سے ملے ہوئے دالان کی محراب ہے۔ اس محراب میں حضرت زکریاؑ ولادت مسیح سے قبل دن رات مصروف عبادت رہا کرتے تھے، آپ حضرت مریمؑ کے قریبی عزیز تھے۔ جب افترا پردازوں نے حضرت مریم پر بہتان باندھا تو آپ نے ان کے خلاف حضرت مریمؑ کی زبردست حمایت کی تھی۔ اور اریحا کے قدیم تاریخی شہر کے قریب دریائے اردن پر آپ کے صاحبزادے حضرت یحییٰ نے حضرت عیسیٰ کو بپتسمہ دیا تھا"

محراب معاویہ کے بارے میں علامہ سیوطی لکھتے ہیں:۔

"یہ محراب خطیب کے مقام یا مقصورہ کے اندر آگئی ہے، اس محراب اور صدر محراب کے درمیان خوبصورت منبر ہے"

"محراب عمرؓ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہی بڑی محراب جس کے برابر منبر شریف بنا ہوا ہے اور جو مسجد اقصیٰ کے صدر دروازہ کے بالمقابل ہے محراب عمر ہے اور بعض کا قول ہے کہ محراب عمرؓ مسجد کے مشرقی والان یعنی جنوبی دیوار سے ملی ہوئی، اس کے سامنے کے رُخ اور ملے ہوئے حصوں ہی کو جامع عمرؓ کہتے ہیں اور یہی جگہ ہے جسے آپؓ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر صاف کیا اور یہاں نماز ادا کی جس سے یہ جامع مسجد مشہور ہو گئی۔ لیکن اکثر آراء پہلے قول کے موافق ہیں یعنی یہ کہ محراب عمرؓ منبر سے ملی ہوئی صدر محراب ہی ہے۔"

تاریخ بتاتی ہے کہ موجودہ مسجد عہدِ ناصر خسرو سے قطعاً مختلف ہے۔ ناصر خسرو کے زمانے (۱۰۴۷ء) میں مسجد اقصیٰ کی عمارت بہت شان دار اور موجودہ عمارت سے دگنی تھی۔ اس کی چھت ۲۸۰ سنگین ستونوں پر قائم تھی۔ اور اس کے والان پندرہ تھے۔ لیکن بقول تائے طرلیوس جب ۱۰۹۹ء میں بیت المقدس پر عیسائیوں کا قبضہ ہوا، اس وقت سے ۱۱۸۷ء تک مسجد اور حرم شریف انہی کے قبضہ میں رہا۔ ان کے زمانے میں مسجد کو سخت نقصان پہنچا۔ انھوں نے جابجا توڑ پھوڑ کی اور مسجد کے ایک حصہ کو گرجا میں تبدیل کر دیا۔ باقی حصے کو رہائش اور اسلحہ خانے کے لیے استعمال کرتے رہے۔ مسجد اقصیٰ کی موجودہ معمولی حالت کی تمام تر ذمہ داری انہی صلیبیوں پر ہے۔

مصر کے مملوک سلاطین ملک الکامل اور الملک الناصر کے زمانے میں امیر عز الدین ایبک مصری کے زیر نگرانی مسجد کے مغربی اضلاع اور نہہ خانوں کی تعمیر نو عمل میں آئی۔ اسی نوع کا کام مشرقی دالانوں میں ہوا۔ اس وقت سے مسجدِ اقصیٰ کی شکل وصورت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ البتہ ۱۸۰۹ء اور ۱۸۱۷ء میں مسجد کی مرمت کا کام وسیع پیمانہ پر ہوا اور ۱۸۴۲ء میں مسجد کا ایک تہائی حصہ از سر نو تعمیر کیا گیا۔

اسلام کے خادموں اور جاں نثاروں کی حیثیت سے عثمانی سلطان مملوک کے جانشین ہوئے اور جب سلیم اول نے دمشق کو فتح کرنے کے بعد پیش قدمی کی۔ تو وہ اپنی فوج سے الگ ہو کر بیت المقدس آیا۔ مسجد اقصیٰ کی زیارت کی اور تمام رسومات کی ادائیگی کے بعد اپنی فوج سے جا ملا۔ قاہرہ میں جب مکّہ کے شریف اس کی خدمت میں حاضر ہو گئے تو اُس نے مملوک کا خطاب "خادم حرمین الشریفین" کا لقب اختیار کیا۔ سلیم اول کے جانشین سلیمان اعظم نے بیت المقدس کی تمام دیواروں کو موجودہ رنگ و رُوپ دیا۔ آب رسانی کا نیا نظام قائم

حرم شریف میں اور اس کے قریب پانچ نئے تالاب بنوائے۔ اور حرم شریف اور قبۃ الصخرہ کی وسیع پیمانہ پر مرمت کروائی۔ عثمانی سلاطین نے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی عظمت و منزلت کو دو بالا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اس کی تفصیلات شہر کی دینی عدالت کے ریکارڈ میں یا مناسب مقامات پر کتبوں کی صورت میں موجود ہے۔ اناری اور عثمانیت کے دور میں بھی انھوں نے مسجد اقصیٰ کو فراموش نہیں کیا اور مسجد استنبول کے ساتھ ہی حرم بانی، مکہ، مدینہ اور اقصےٰ سے بھی غافل نہ رہے۔ بلکہ مسجد اقصیٰ کی دیکھ بھال اور عظمت و منزلت ان کے لیے طرۂ امتیاز تھی۔ انیسویں صدی عیسوی میں سلطان محمود ثانی، سلطان عبدالمجید اور سلطان عبدالعزیز نے حرم شریف اور اس کی عمارتوں کی مرمت اس پیمانے پر کروائی کہ بعض مقامات پر تو تعمیرِ نو کا گمان گزرتا تھا۔ آخرالذکر سلطان اپنی فضول خرچی کے لیے بدنام ہے اور اس سلسلہ میں اس کے نامۂ اعمال میں اگر کوئی نیکی ہے تو صرف وہ فراخدلانہ اخراجات ہیں جو اس نے قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کی تزئین و آرائش پر کیے۔ انیسویں صدی کے آخری بیس سال میں تو مکہ، مدینہ، بیت المقدس اور ان کے حرم بطورِ خاص ترکانِ عثمان کی توجہ اور عقیدت کا مرکز رہے۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے حرمین کے فروش کو گراں قیمت ایرانی تالینوں سے آراستہ کیا۔

عثمانی سلاطین نے اپنے دورِ حکومت میں اگرچہ اقلیتوں کو ہر قسم کی سہولت دی تھی اس کے باوجود شہرِ مقدس میں کسی اقلیت کو اپنا معبد بنانے کی اجازت نہ تھی۔ مگر جب مصر کے حاکم نے بغاوت کرکے شام و فلسطین پر قبضہ کر لیا، تو نہ صرف عیسائیوں کی مراعات میں اضافہ ہوا بلکہ یہود کا دباؤ بھی بڑھ گیا۔ حتّیٰ کہ ۱۸۳۹ء کے خزاں میں غیر ملکی یہودیوں نے جو برطانوی قونسلیٹ کی زیرِ نگرانی تھے۔ انتہائی عیاری سے کام لیتے ہوئے دیوارِ گریہ پر اپنا حق تسلیم کرانے کی کوشش کی۔ ایک برطانوی قونسل نے مصری کمانڈر انچیف ابراہیم پاشا سے درخواست کی کہ ایک برطانوی یہودی دیوارِ گریہ سے باہر پختہ فرش بنانا چاہتا ہے۔ اسے اس کی اجازت دی جائے۔ ابراہیم پاشا کا ردّ عمل حوصلہ افزا تھا مگر شہر کی مشاورتی کونسل نے اس سفارش کو مسترد کر دیا اور شیخ المغاربہ نے بھی اس کی تائید کی۔ اس کے بعد یہ مسئلہ کن کن مراحل سے گزرا۔ اس کا تفصیلاً ذکر دیوارِ گریہ کے عنوان سے آگے کیا جا رہا ہے۔ یہاں بہرحال اتنا جان لیجیے کہ یہ پہلا مستند حوالہ

ہے کہ جب یہود نے دیوار گریہ پر اپنا حق جتایا اور جسے مسترد کر دیا گیا لیکن خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد ان کی سازشیں تیز تر ہوتی گئیں اور آخر وہ دیوار گریہ پر اپنا حق جتانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر وقت کی رفتار نے مسجد اقصیٰ کی عظمت و شوکت اور اس سے اہل اسلام کی عقیدت میں کوئی فرق نہیں ڈالا۔ ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی اپنے سفر نامہ زیارۃ الشام والقدس میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مسجد اقصیٰ چاروں طرف پہاڑوں میں اس طرح محدود ہے جس طرح صدف صادق کے دو حصوں میں چمکتا ہوا گوہر، مسجد اقصیٰ کا حرم محترم وسعت میں مسجد حرام سے سہ چند ہے، مسجد شہر کے مشرقی گوشے میں فصیل شہر سے ملحق ہے۔ مسجد اقصیٰ کے دس دروازے ہیں۔ سات ایک قطار میں مغربی جانب اور تین شمالی جانب۔ مغربی دروازوں کے نام یہ ہیں۔ باب المغاربہ، باب السکینہ، جس کو باب السلسلہ بھی کہتے ہیں۔ باب المونضا، باب القطانین باب الحدید، باب الاحصیری، باب الغوانمہ، شمالی جانب باب شرف الانبیاء (اسی سے سیدنا عمرؓ حرم میں داخل ہوئے تھے) باب حطہ (بنی اسرائیل وادی تیہ سے نجات پانے کے بعد اسی راستے سے آئے تھے) اور باب الاسباط جس کو باب الرحمہ بھی کہتے ہیں، واقع ہیں۔ ان کے علاوہ مشرقی جانب باہم ملے ہوئے دو دروازے بند ہیں۔ انھیں باب التوبۃ اور باب الرحمہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مسجد کے نیچے مغربی جانب باب المغاربہ کے قریب دو بند دروازے ہیں۔ ان کے اندر قبلہ رو ایک بڑا حلقہ لٹکا ہوا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ شب معراج رسول اللہ کا براق اسی سے باندھا گیا تھا.... مسجد اقصیٰ کے چار مینارے ہیں، تین مغربی جانب اور ایک شمالی جانب باب الاسباطیہ، بڑے دروازے سے محراب تک پیمائش سو درع اور مشرقی سے غربی تک ستر درع ہے۔ مسجد سے مشرقی جانب وہ ہے، جو چالیس ابدال سے منسوب ہے۔"

اس سے قبل ۱۸۹۲ء میں مولانا شبلی زیارتِ قدس کے لیے گئے تو انھوں نے اپنے سفر نامہ مصر و روم و شام میں لکھا کہ

"مسجد کی عمارت جس کا طول ۲۰۰ گز اور عرض ۱۰۰ گز ہے نہایت خوبصورت اور پُرتکلف ہے۔ چھت ستونوں پر قائم ہے اور ۲۰۰ صرف رخام کے ستون ہیں۔ جابجا پچی کاری اور طلائی کام ہے۔"

۱۹۲۰ء میں برطانوی دورِ انتداب کا آغاز ہوا تو مسلم مقامات و اماکن مقدسہ کی نگرانی کے لیے ایک سپریم اسلامی کونسل قائم ہوئی۔ اس مجلس کے زیرانتظام ۱۹۲۰ء میں بڑے پیمانے پر مرمت کا آغاز ہوا۔ اس وقت مسجد کی عمارت کا بیشتر حصہ مخدوش ہو چکا تھا۔ ماہر انجینروں کی رپورٹ کی روشنی میں مرمت کا آغاز زمین دوز حجروں سے کیا گیا۔ مسجد اقصیٰ دراصل انہی حجروں کی بنیادوں پر قائم ہے۔ حجروں کے کئی ستونوں اور استوانوں کو مضبوط سے مضبوط تر کر دیا گیا۔ اس کے بعد مسجد اقصیٰ کے گنبد پر توجہ دی گئی۔ اس کے آٹھ ستونوں اور چار محرابوں کو از سر نو بنایا گیا کیونکہ پرانے ستون اور محرابیں خستہ ہو چکی تھیں۔ نیز پرانی محرابوں کے نیچے نئی محرابیں تعمیر کر کے درمیانی خلا کو کنکریٹ سے بھر دیا گیا۔ اس سے قدیم محرابیں گرنے سے بچ رہیں۔ ان محرابوں پر کنکریٹ کی نئی چھت ڈالی گئی۔ مغربی دیوار کا ایک حصہ گرا کر اس کی جگہ سیمنٹ کی نئی دیوار تعمیر کی گئی۔ محرابوں پر سبز اور سنہرا رنگ کیا گیا اور ان کے درمیان پیتل کی مضبوط سلاخیں لگا دی گئیں۔ پھول دار شیشہ کی تیس نئی کھڑکیاں بھی بنائی گئیں۔ ان سے مسجد کی خوبصورتی میں بہت اضافہ ہو گیا۔ اس کام کی یادگار میں مسجد کی درمیانی محراب کے اردگرد یہ کتبہ تحریر کیا گیا:

ترجمہ: اس برکت والی مسجد الاقصیٰ کے گنبد کی مرمت اعلیٰ مجلس اسلامی نے ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۷ء) میں کرائی۔"

اس مرمت کو ابھی ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ بیت المقدس میں ایک شدید زلزلہ آیا جس میں مسجد اقصیٰ کو شدید نقصان پہنچا۔ پیشتر اس کے کہ مجلس اس کی مرمت کا اہتمام کرتی۔ ۱۹۳۶ء میں ایک اور زلزلہ آیا جس سے مسجد کے زمین بوس ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ مجلس اسلامی نے فوری اقدامات کئے اور ۱۹۳۸ء میں مصر کی عرب یادگاروں کے محکمہ کے ڈائرکٹر محمود احمد پاشا کی نگرانی میں مرمت کے کام کا آغاز کر دیا۔ جو ۱۹۴۳ء تک جاری رہا۔ اس کام کے دوران مشرقی رواق کو شہید کر کے اس کی جگہ نیا دالان بنایا گیا۔

مسجد کی اندرونی چھت قدیم فاطمی طرز کے نقش و نگار سے آراستہ عمدہ قسم کی عمار
سے بنائی گئی۔ پرانے ستونوں کو ہٹا کر ان کی جگہ سنگِ مرمر کے خوبصورت ستو
کئے گئے۔ ان کا پتھر اٹلی سے منگوایا گیا تھا۔ مرمت کا سارا کام فلسطینی مزدو
کاریگروں نے مصری انجینئروں کے زیرِ نگرانی انجام دیا۔ مسجد کے درمیانی دالان
چھت کی آرائش و زیبائش کے لیے حکومتِ مصر نے دس ہزار مصری پونڈ کا ع
اور دوسرے ممالکِ اسلامیہ سے بھی عطیات موصول ہوئے۔ اس مرمت کی یادگ
طور پر بھی مسجد کے صدر دروازے کی غربی جانب دیوار پر ایک کتبہ نصب کیا گیا

"اعلیٰ مجلس اسلامی نے مصر کے ادارہ آثارِ عربیہ کی زیرِ نگرانی اس
بابرکت مسجد اقصیٰ کے مشرقی دالان، درمیانی رواق اور شمالی رواق کے
سامنے کے حصے کی مرمت کرائی۔ مرمت کا کام ۱۳۵۷ھ میں شروع اور
۱۳۶۲ھ میں ختم ہوا۔ وسطی رواق کی چوبی اندرونی چھت کی مرمت ۔۔۔
جلالۃ الملک فاروق اول کے عہد میں حکومتِ مصر کے ہاتھوں انجام پائی۔"

برطانوی انتدابی دور میں بھی مسجد اقصیٰ میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے وقت ایک
منظر ہوتا تھا۔ الحاج محمد الیاس برنی اپنے سفرنامہ مطبوعہ ۱۹۲۸ء میں لکھتے ہیں کہ نمازِ جمعہ ۔
علماء و مشائخ کی ایک جماعت دو سبز علم ہاتھوں میں لے کر تکبیر و درود پڑھتی ہوئی مسجد میں د
ہوتی ہے۔ نمازیوں میں ایک بجلی سی دوڑ جاتی ہے۔ یہ دونوں علم جہاد میں سلطان صلاح
کے ساتھ رہتے تھے۔ علماء ان کو منبر کے دونوں طرف کھڑا کر دیتے ہیں۔ خطبہ میں حضرت عم
سلطان صلاح الدین کا ذکر خاص طور پر ہوتا ہے۔"

۱۹۴۸ء میں جب برطانیہ رخصت ہوا تو یہودیوں کی گولہ باری سے مسجد کو بالخص
چوبی چھت کو شدید نقصان پہنچا۔ ۲۳ ستمبر کو متعدد کھڑکیاں اور روشندان ٹوٹ گئے
نماز پڑھتے ہوئے کئی نمازی شہید ہو گئے۔ ۱۰ اکتوبر کو پھر گولہ باری ہوئی۔ اس سے شمالی مغر
دیوار کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ اور موازین میں سے کئی ایک کو شدید نقصان پہنچا۔ جنگ بندی
بعد حکومتِ اردن نے مسجد کی تعمیرِ نو اور مرمت کا فیصلہ کیا۔ تو کافی غور و فکر کے بعد ۱۹۵۲
میں مرمت کا ایک واضح منصوبہ سامنے آیا۔ مصری انجینئروں کی جماعت نے مسجد کا معا
کرنے کے بعد پلان تیار کیا۔ اس کی تکمیل کے اخراجات کے لیے عالمِ اسلام سے ا

کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں چیف انجینئر صالح شورانی نے خیال ظاہر کیا۔ کہ مرمت کی تکمیل میں تین برس لگیں گے اور پانچ لاکھ مصری پونڈ صرف ہوں گے۔ اس میں سے تین لاکھ پونڈ کی رقم بحرین، سعودی عرب اور کویت نے دی۔ ۵۰ ہزار پونڈ کی رقم متحدہ عرب جمہوریہ نے فراہم کی۔ مرمت کے کام کا آغاز دسمبر ۵۸ء میں ہوا۔ اس وقت مسجد کے گنبد کو ۲۸ ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ ان میں سے تین ستون کہنہ اور بوسیدہ ہو چکے تھے۔ انھیں بدلا گیا۔ مسجد کے گنبد پر سیسے کے خول کی جگہ المونیم اور پیتل کی آمیزش سے تیار کردہ خول چڑھانا طے ہوا۔ یہ کام ایک اطالوی کمپنی کے سپرد ہوا۔ نیا خول جس پہ نازک و نفیس مینا کاری ہوئی ہے، دھوپ میں سونے کی طرح چمکتا ہے۔ اس کے علاوہ مسجد کے بعض دروازے جو سلیمان اعظم نے لگائے تھے، تبدیل کر کے ان کی جگہ نئے عربی دروازے لگائے گئے۔ باہر کی دیواروں پر نئی ٹائلیں لگائی گئیں اور اس سلسلے میں یہ خاص اہتمام کیا گیا۔ کہ ان کے رنگ، نقشے اور جائے و تنوع میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ دونوں کا صحن اور میدان تقریباً پانچ فرلانگ لمبا اور تین فرلانگ چوڑا ہے جبکہ مسجد اقصیٰ کے کمرہ کی مساحت ۱۲۰ قدم × ۱۰۰ قدم ہے۔ اس کے اندر سنگ مرمر کے بے شمار طویل و عریض ستون ہیں اور ہر ستون ایک ہی پتھر سے بنایا گیا ہے۔ محراب میں مختلف رنگوں میں سنگ مرمر کے باریک ستون ہیں۔ محراب کی دائیں جانب زیتون کی لکڑی سے بنا ہوا ایک طویل منبر ہے۔ جس پر قدیم طرز کی نقاشی اور گل کاری کی گئی ہے۔ اس پہ لکھی ہوئی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منبر مجاہد اعظم قطب العصر نور الدین زنگی کے بیٹے نے اس وقت حلب سے بھجوایا تھا۔ جب صلاح الدین نے فتح بیت المقدس کے بعد نور الدین زنگی کی آرزو پوری کرنے کے لیے اسے منگوا بھیجا۔ کیونکہ سلطان نورالدین نے اسے بطور خاص مسجد قدس ہی کے لیے بنوایا تھا۔ اس منبر پہ یہ عبارت کندہ ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط یہ منبر بندۂ ناچیز کی خواہش پہ بنایا گیا۔ جو خدا کی رحمت کا محتاج اور اس کی نعمتوں کا سپاس گزار ہے۔ جو اللہ کی راہ میں مجاہد اور دین خداوندی کے دشمنوں کے لیے پابرکاب ہے۔ جو مرکز اسلام والمسلمین، مظلوموں کا حامی الوالقاسم محمود بن زنگی ہے۔ بادشاہ عادل تو اللہ ہے"۔ منبر کے دوسری طرف صنعہ سلیمان بن معالی عمل حمید بن ظافر الحلبی لکھا ہے۔ یہ منبر صدیاں گزر جانے کے باوجود اب تک نیا محسوس ہوتا ہے "لیکن جون ۱۹۶۷ء کو یہ مسجد یہودیوں کے تصرف میں چلی گئی اور آج تک اپنے صلاح الدین کا منتظر ہے"

باب ششم

قُبّۃ الصّخرہ

"جو تجھے محبوب رکھتا ہے، میں اسے محبوب رکھوں گا۔"
"اس جگہ جو نماز ادا کی جاتی ہے، پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔"
حدیث رسول ﷺ

خانہ کعبہ اور گنبد خضرا کے بعد روئے زمین پر قبۃ الصخرہ مسلمانوں کے لیے مقدس ترین

مقام ہے۔ صخرا عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی چٹان کے ہیں۔ یہ چٹان زمین سے صرف دو گز اونچی ہے۔ نہ تو مربع ہے نہ ہی مستطیل۔ عام روایت کے مطابق اس چٹان کا طول ۵۰ فٹ اور عرض ۴۲ فٹ ہے۔ بعض روایات میں اس کا عرض ۴۴ فٹ بتایا گیا ہے۔ اس کی قدامت کے ضمن میں کئی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ ہبوط آدم سے بھی دو ہزار سال پہلے فرشتے اس کا طواف کر چکے تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ طوفان نوحؑ کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی جس مقام پر رکی تھی۔ وہ یہی چٹان تھی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ قیامت کے دن حضرت اسرافیل اسی چٹان پر کھڑے ہو کر صور پھونکیں گے۔ اکثر مفسرین اور محدثین کی رائے ہے کہ صخرہ بہشت کی چٹانوں میں سے ہے یہی وجہ ہے کہ اسے بیت الجنت بھی کہا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس چٹان پر ختم المرسلین نبی کریم صلعم تک تمام انبیاء کرام نے عبادت کی ہے اور اسی ہزار فرشتے ہر وقت اس کو حلقے میں لیے رکھتے ہیں۔ نیز یہ کہ سب انبیاء اسی پر بیٹھ کر خدا کے احکام لوگوں کو پہنچایا کرتے تھے، پھر یہ اڑ کر جانے کو تھا کہ حضرت جبریلؑ نے اپنے ہاتھ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری تک اس کو روک دیا اور شب معراج حضرتؐ نے ہمیشہ کے لیے اسے قائم رکھا۔ بعض روایات کے مطابق یہ چٹان زمین کا سنگ بنیاد ہے۔

امام جلال الدین سیوطی صخرہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

ابن المنصور نے ہمیں بتایا۔ کہ صخرہ بیت المقدس حضرت سلیمانؑ کے عہد میں بارہ ہزار ہاتھ بلند تھا (ہاتھ آجکل کے ایک ہاتھ، ایک بالشت اور ہاتھ کی چوڑائی کے برابر تھا)، اس پر ایک معبد تھا۔ جو صندل کی لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ اس کی اونچائی بارہ میل تھی۔ اس پر سونے کی جالی بنا رکھے ہوئے لعل اور موتیوں کی دو تسبیحوں کے درمیان تھی۔ جس کو لعلکا کی عورتوں نے رات میں بنا تھا۔ یہ جالی تین دن کام آتی تھی۔ جب سورج نکلتا تو امواس (EMMAUS) کے لوگ اور شام کو بیت الرحمٰن کے لوگ اس کے سایہ میں رہتے تھے۔ اس پر ایک بڑا لعل نصب تھا۔ جو رات میں سورج کی طرح چمکتا اور ۵۸۷ ق م بروایت دیگر ۵۲۸ ق م تک جب کہ بخت نصر نے تمام چیزوں کو برباد کرایا۔ یہ سب کچھ برقرار تھا۔ بخت نصر نے جو کچھ ہاتھ لگا۔ لوٹ لیا اور رومان نے کیا۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صخرہ بیت المقدس سر بفلک تھا۔ جس کی بلندی بارہ میل تھی۔ اور اس سے اوپر آسمان کے

علامہ سیوطی مزید لکھتے ہیں :۔

"ہم نے پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت صخرہ کو سفید مونگے کا بنا کر اور اسے وسیع کر کے زمین و آسمان پر پھیلا دے گا۔ پھر لوگ اس صخرہ پر سے جنت یا دوزخ میں جائیں گے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ یہ زمین کسی اور طرح کی زمین میں بدل جائے گی۔ آسمان سفید ہو جائیں گے۔ مٹی چاندی بن جائے گی اور اس پر کسی قسم کی آلودگی نہ رہے گی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! یہ زمین کوئی اور زمین بن جائے گی۔ اور یہ آسمان بدل جائے گا تو خلقت اس روز کہاں ہو گی آپؐ نے جواب دیا کہ پل صراط پر" (گویا قیامت کے روز صخرہ پل صراط کا کام دے گا)

ایک اور بزرگ کا قول ہے۔ کہ الواح میں خدا بیت المقدس کے صخرہ سے کہتا ہے کہ تو میرا عرش ہے۔ تو میرے قریب ہے، میں نے آسمانوں کو تیری جڑ سے اٹھایا اور زمین کو تیرے نیچے بچھایا۔ تمام دور افتادہ مشکل اور دشوار گزار پہاڑ تیرے نیچے ہیں۔ جو تیرے اندر مرا۔ وہ گویا آسمانی دنیا میں مرا۔ دن اور رات کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہو گا۔ جب تک میں تجھ پر آسمانی روشنی نہیں بھیجوں گا اور میں تجھے دھوؤں گا یہاں تک کہ تو دودھ کی طرح سفید ہو جائے ـــــ اور میں تجھ پر ملائکہ اور انبیاء کے گروہ بھیجوں گا۔ اپنی ارواح اور فرشتوں کو نازل کروں گا تا کہ تیرے ساتھ عبادت کریں۔ جو روشنی تجھ پر ڈالوں گا وہ بنی آدم میں سے کافروں اور ان کے نقش پا مٹا دے گی۔ جو کوئی دور سے اس معبد کو دیکھے گا، اس پر برکتیں نازل ہوں گی۔

اسی مصنف سے روایت ہے کہ خدائے تعالیٰ صخرہ بیت المقدس سے کہتا ہے، جو تجھے محبوب رکھتا ہے، میں اس کو محبوب رکھوں گا۔ جو تجھ سے محبت کرتا ہے، میں اس سے محبت کروں گا۔ اور جو تجھ سے نفرت کرے، میں اسے دھتکار دوں گا جو کوئی تجھ میں دو رکعت نماز پڑھ لے۔ میں اس کے سب گناہ بخش کر ایسا معصوم بنا دوں گا، گویا ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ بشرطیکہ وہ دوبارہ گناہوں کی طرف رجوع نہ کرے۔

ایک پرانی روایت ہے کہ مقاتل بن سلیمان اس مسجد میں نماز پڑھنے آئے اور دروازہ پر بیٹھ کر صخرہ کو دیکھنے لگے تو وہاں بہت بڑی جماعت جمع ہو گئی۔ اتنے میں علی بن البدوی سلیپر پہنے فرش پر زور زور سے چلتے ہوئے آگے بڑھے اور انھوں نے حاضرین سے راستہ مانگا۔ تو لوگ ادھر ادھر ہٹ گئے۔ انھوں نے لوگوں سے کہا۔ کہ وہ اس پر دھما کے سے نہ چلیں اور پھر ہاتھ کے اشارہ سے بتایا۔ کہ یہاں مقاتل بن سلیمان ہے اور تم زور سے چل رہے ہو۔ یہی مقام ہے جہاں جنت کی ہوائیں بسی ہوئی ہیں۔ اور نہ صرف اس جگہ بالکل احاطہ میں ایک بالشت جگہ ایسی نہیں۔ جہاں کسی پیغمبر یا مقرب فرشتے نے نماز نہ پڑھی ہو۔

ام عبداللہ بنت خولہ اپنی والدہ سے روایت کرتی ہیں کہ وہ ساعت مقرر ہے جب کعبہ صخرہ کے پاس لے جایا جائے گا اور اس پر حج کی تمام برکات لٹکی ہوں گی۔ اور وہ اس کا عمامہ بن جائیں گی۔

یہ بھی روایت ہے کہ صخرہ معلق ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا کوئی سہارا نہیں ہے یہ اس کی حکمتِ بالغہ ہے۔ کہ کوئی شے اس کی مشیت کے بغیر نہیں گرتی۔ شب معراج کو اس کے مغربی گوشے پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تھے۔ یہ گوشہ آپ کی تعظیم سے کانپنے لگا۔ اور دوسرے گوشے پر فرشتوں کی انگلیوں کے نشان ہیں جنھوں نے اسے لرزنے سے باز رکھا تھا۔

قبۃ الصخرہ کی بنا اور تعمیر کے متعلق متضاد روایات بیان کی جاتی ہیں۔ یہودی اور عیسائی بھی اسے مقدس اور اپنا قبلہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن عہد نامہ قدیم میں اس کا ذکر موجود نہیں البتہ تالمود وغیرہ میں تذکرہ آیا ہے اور تاریخ میں فرانس کے ایک زائر، جو بورڈو کا رہنے والا اور ۳۳۳ء کے لگ بھگ زیارت کے لیے آیا تھا، کے بیان سے قبل اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ زائر لکھتا ہے کہ ہیکل کے احاطہ میں شہنشاہ ہیڈرین کے نصب کردہ گھوڑوں کے دو سنگی بتوں کے قریب جو سوراخ دار چٹان ہے، یہودیوں کا قاعدہ ہے کہ وہ اس مقدس چٹان کو سال میں ایک بار تیل سے چپڑتے، گریہ زاری کرتے اور اپنے کپڑے پھاڑتے ہیں۔ اس کے بعد وہ چلے جاتے ہیں۔ اور یہ قدیم ترین حوالہ ہے جس میں یہود کے رونے دھونے اور ماتم کا ذکر ہے لیکن اس سیاح کی کوئی تحریر آج نہیں ملتی اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس سیاح کی حقیقت کیا تھی۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہی وہ چٹان ہے جس پر حضرت داؤد کے زمانے میں یہودی

اپنی قربانیاں لا کر رکھ دیا کرتے تھے۔ اور جنھیں آسمان سے اُتر کر آگ کا شعلہ جلا کر راکھ کر دیتا تھا۔ یہ ان کے نزدیک قربانی کے قبول ہو جانے کی نشانی تھی اور اس چٹان کے نیچے جو غار ہے۔ اس کے بارے میں یہود کی روایت ہے کہ اس میں قربانی کا خون اور آلائش جمع ہو جاتی جسے بعد میں صاف کر دیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تقدیس اور حرمت کا اعتراف سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دینِ ابراہیمی کے احیاء کی خاطر تشریف لائے تھے چنانچہ خانہ کعبہ میں مقامِ ابراہیم کے سامنے نماز ادا فرماتے۔ اس طرح بیت المقدس کا صخرہ بھی سامنے آ جاتا۔ آپؐ ہجرت کے بعد بھی تقریباً دو سال تک اسی صخرہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرماتے رہے ہجرت کے دوسرے سال کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ سے باہر مسجد بنی سلمہ میں بیت المقدس کی جانب رُخ کر کے نمازِ عصر ادا فرما رہے تھے۔ اور ابھی آپ نے دو رکعت ادا کی تھیں کہ وحیِ الٰہی نازل ہوئی۔

"اے محمدؐ! اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف پھیر دو، اور جہاں کہیں بھی ہو

اسی کی طرف منہ پھیرو"

چنانچہ باقی نماز خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے ادا کی گئی۔ اسی بنا پر مسجد بنی سلمہ کا نام مسجد قبلتین (یعنی دو قبلوں والی مسجد) ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے تحویلِ قبلہ کے اس واقعہ کو مومن و منافق میں ذریعۂ امتیاز قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ

"بے وقوف لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کا جو قبلہ تھا۔ اس سے ان کو کس نے پھیر دیا؟ کہہ دیجیے کہ مشرق و مغرب سب خدا ہی کے ہیں۔ نیز اجو قبلہ (کعبہ) تھا اسے ہم نے پھر قبلہ قرار دیا۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبرؐ کا پیرو کون تھا اور رُو گردانی کرنے والا کون ہے۔ بلاشبہ یہ قبلہ نہایت گراں اور ناگوار ہے لیکن ان لوگوں کے لیے اس میں کوئی گرانی نہیں، جن کو خدا نے ہدایت کی۔"

اور یہ اہلِ اسلام کی نظر میں اس کی حرمت کا ایک سبب ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شبِ معراج یہیں سے براق پر سوار ہو کر خالقِ ارض و سما سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ اور اسی کے پہلو میں انبیاء کی امامت فرمائی۔

حضرت عمرؓ بیت المقدس آئے، تو انھوں نے الصخرہ کو جس پر کوڑے کے ڈھیر تھے، پاک وصاف کر دیا۔ اسی اثنا میں خدا کی قدرت سے مُوسلادھار بارش ہوگئی جس سے پُوری چٹان دُھل کر نکھر آئی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہاں نماز ادا کی۔ اور پھر ان کے حکم سے اس پر ایک سادہ سی مسجد یا عمارت بنا دی گئی۔ آجکل چٹان پر خوبصورت ہشت پہلو عمارت ہے۔ اسے اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے تعمیر کرایا تھا۔ اور اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ الصخرہ خانہ کعبہ اور گنبدِ خضریٰ کے بعد مسلمانوں کا مقدس ترین مقام ہے اور دوسرا سبب مقدسی نے اپنے چچا کے حوالے سے یُوں بیان کیا ہے:

"شام وہ ملک ہے جس پر مدّتوں عیسائی قابض رہے اور اس (عبدالملک) نے وہ خوبصورت گرجا بھی دیکھے۔ جو ابھی تک ان کے قبضے میں ہیں۔ اور ان کی خوش نمائی ایسی دلکش اور شان وشوکت ایسی مشہور ہے، جیسے (بیت المقدس میں) کمامہ (مزارِ مسیح کا گرجا) یا لدّیہ اور راولیہ کے کلیسا دلکش اور مشہور ہیں۔ لہٰذا اس نے مسلمانوں کے لیے ایسی بے مثل اور اعجوبۂ روزگار مسجد بنانا چاہی کہ مسلمان پلٹ کر بھی ان گرجوں کی طرف نہ دیکھیں۔ اسی طرح خلیفہ عبدالملک کو کمامہ کے گنبد کی عظمت وشان دیکھ کر غیرت آئی کہ کہیں مسلمانوں کے دل اس سے مرعوب نہ ہوں۔ اس لیے اس نے چٹان پر یہ گنبد تعمیر کرایا۔"

مؤرخ سبط الجوزی اپنی کتاب "مرأۃ الزمان" میں بیان کرتا ہے کہ عبدالملک نے یہ تعمیر ۶۹ھ میں شروع کی۔ جو ۷۲ھ میں تکمیل کو پہنچی (۶۸۷ء تا ۶۹۰ء) قبۃ الصخرہ کی تعمیر کے وقت خود خلیفہ دمشق سے بیت المقدس آیا، اور وہاں سے ہر ولایت اور شہر کے حاکم کو لکھ کر گنبد کی تعمیر وتزئین کے سلسلے میں رائے مانگی ـــــ سب نے اتفاق کیا۔ اس پر خلیفہ نے اپنی سلطنت کے بہترین کاریگروں کو جمع کیا۔ اور انھیں گنبد کی تعمیر شروع کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے صحنِ حرم میں اس کا نقشہ بنایا۔

خلیفہ کو اس گنبد کی تعمیر میں اس قدر اشتیاق تھا۔ کہ پہلے اس نے اس نقشہ کے مطابق نمونے کا گنبد تعمیر کرایا۔ یہ گنبد اب بھی مشرق کی طرف چٹان کے قریب موجود ہے ـــ جو قبۃ السلسلہ کہلاتا ہے۔ بعد ازاں اس گنبد میں قبۃ الصخرہ کی تعمیر کے لیے خزینے جمع کیے

گئے۔ خلیفہ نے قبۃ الصخرہ کے لیے مصر کا سات برس کا خراج جمع کیا اور زرِ کثیر اس کے لیے الگ کر دیا۔ بیسان کے مشہور عالم و فاضل رجا ابن حیاہ اور یزید ابن اسلام کو مہتمم مقرر کر کے اختیار دیا کہ وہ اس گنبد کی تعمیر میں جتنا روپیہ چاہیں، خرچ کریں۔ انھوں نے پورے اشتیاق سے تعمیر کرائی اور جب قبۃ الصخرہ مکمل ہوا اور مزید خرچ کرنے کا موقعہ نہ رہا تو انھوں نے مخصوص خزانہ میں سے بچی ہوئی رقم کے بارے میں خلیفہ کو لکھا:

"امیر المؤمنین نے بیت المقدس کی چٹان پر جس گنبد کی تعمیر کا حکم دیا تھا وہ مکمل ہو گیا ہے اور اس سے بہتر اور خوبصورت بنانے کے بارے میں ایک لفظ کہنے کی گنجائش نہیں رہی۔ امیر المؤمنین نے اس مقصد کے لیے جو رقم مخصوص کی تھی۔ اس میں سے ایک لاکھ دینار سرخ بچ گئے ہیں امیر المؤمنین کو اختیار ہے کہ باقی رقم کو جہاں چاہیں خرچ میں لائیں۔"

خلیفہ نے جواب میں لکھا:

"اس معظم و محترم عمارت کی تعمیر میں جو کارہائے نمایاں تم نے کیا ہے اس کے صلے میں یہ باقی رقم تم دونوں بطور انعام اپنے کام میں لے آؤ۔"

لیکن انھوں نے پسند نہ کیا بلکہ اپنی بیویوں کے زیور اور اندوختہ بھی خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس پر خلیفہ نے حکم دیا کہ ان درہم و دینار اور سونے کو پگھلا کر قبۃ الصخرہ کی چھت اور دیواروں پر چڑھا دیا جائے" ــــ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی اور قبہ اس قدر روشن ہو گیا کہ سونے کی جوت سے دیکھنے والوں کی نظر نہ ٹھہر سکتی تھی۔ سردی کے موسم میں گنبد کو بارش اور برف سے محفوظ رکھنے کے لیے جانوروں کی اون اور کھال سے دو غلاف تیار کرائے گئے۔ تاکہ بوقتِ ضرورت گنبد پر چڑھا دیئے جائیں۔ رجاء اور یزید ابن سلام نے چٹان کے گرد سیاہ آبنوس کی ایک جالی بھی بنوائی اور باہر کے رُخ ستونوں کے درمیان زری کے پردے بنوا کر لٹکا دیئے۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے مینڈھے کے دونوں سینگ اور خسرو ایران کا تاج ایک زنجیر سے باندھ کر قبۃ الصخرہ کے وسط میں لٹکا دیا۔ ایک بیش بہا موتی بھی اس زنجیر سے آویزاں تھا (یہ نوادرات عہدِ عباسیہ میں کعبہ مکرم میں منتقل کر دیئے گئے)۔

تاریخ بتاتی ہے کہ خلیفہ عبدالملک نے اس حرم کی خدمت کے لیے تین سو خدام

مقرر کئے۔ ان میں سے باون آدمی دن رات زعفران کوٹتے، پیسنے اور اس میں مشک و عنبر اور گلاب و گل جوڑی کا پانی ملا کر ایک خلوق تیار کرنے میں مصروف رہتے۔ یہ خادم حجرہ میں جانے سے قبل اچھی طرح نہا دھو لیتے۔ پھر یہ یمانی زیب تن کر کے چٹان پر اس کی مالش کرتے۔ سونے چاندی کے فانوسوں میں عود، عنبر اور مشک سلگاتے۔ دروازوں کے پردے گرا دیتے اور جب پوری عمارت خوشبو میں رچ بس جاتی تو اس کی خوشبو حرم شریف سے باہر منڈی تک جاتی اور راہ گیروں کے دماغ خوشبو سے معطر ہو جاتے۔ روایت ہے کہ خوشبو سے عمارت کو خوب معطر کر لیا جاتا۔ تو زائرین کو اندر جانے کی اجازت دی جاتی۔ جو دو یا چار رکعت نفل پڑھتے اور جب زائرین لوٹ جاتے۔ تو خدام فرش کو پانی سے دھو ڈالتے۔ ہر دروازے کی نگہبانی کے لیے دس دس حاجب مقرر تھے۔

ابو بکر بن الحارث سے جو عہد مالکی میں مسجد صخرہ میں شمعیں روشن کرنے تھے، روایت ہے کہ قبۃ الصخرہ میں خالص چنبیلی کا تیل جلایا جاتا تھا۔ اس کی خوشبو سے لوگوں میں اس قدر اشتیاق پیدا ہوتا۔ کہ وہ یہ تیل اپنے کپڑوں پر مل لیا کرتے۔

عقبہ بیان کرتا ہے کہ "اس زمانے (عہد ولید) میں مسجد اقصٰی کے چوبی ستونوں کو چھوڑ کر صرف چھت میں چھ ہزار تختے لگے ہوئے تھے۔ اور دروازوں کی تعداد انیس تھی۔ چھ سو ستون سنگ مرمر کے اور سات محرابیں تھیں۔ اور پندرہ کم چار سو زنجیریں جھاڑوں کے ساتھ لٹکتی رہتی تھیں۔ جن میں سے دو سو تیس مسجد اقصٰی میں اور باقی ماندہ (یعنی ایک سو پچپن) گنبد صخرہ میں تھیں۔ ان تمام زنجیروں کی کل لمبائی چار ہزار ذراع اور وزن ۴۳ ہزار رطل شامی (۲۸ ہزار پونڈ) تھا۔" پانچ ہزار فانوس تھے (یہ زنجیریں اور فانوس صلیبی لوٹ کی نذر ہو گئے) خلیفہ عبدالملک کے عہد میں کچھ یہودی اور عیسائی بھی بعض معمولی خدمات انجام دینے پر متعین تھے۔ لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے انھیں ہٹا کر ان کی جگہ شاہی خمس سے خریدے ہوئے خدام مقرر کئے۔ اور جب ان میں سے کوئی مرتا تو اس کا بیٹا یا پوتا اس کی جگہ لے لیتا۔"

اسی عظمت و جبروت سے خیرہ ہو کر عیسائی مؤرخ فرگسن نے دعویٰ کیا کہ حضرت

نہیں بلکہ یہی قبۃ الصخرہ تھا۔ مگر لی سٹرینج اور دوسرے یورپی مؤرخین نے اس کے اس دعویٰ کو باطل قرار دیا ہے۔ وہ اس امر میں متفق ہیں کہ قبۃ الصخرہ خلیفہ عبدالملک کی تعمیر ہے۔ البتہ لی سٹرینج نے یہ مغالطہ دینے کی کوشش ہے کہ قبۃ الصخرہ عبدالملک نے اس لیے تعمیر کیا کہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جو اس کے عہد میں مکہ و مدینہ پر قابض تھے، کی رقابت میں، حجر اسود کے بجائے صخرہ کو مسلمانوں کے لیے حج اور طواف کا مرکز بنانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا یہ دعویٰ محض ایک مستشرق کی ژاژ خائی ہے جو عقلاً و نقلاً غلط ہے۔ مولانا شبلی نے اپنے رسالہ انتقاد میں اس نوع کی روایت کا مسکت ردّ کیا ہے۔

عبدالملک کے بعد عباسی خلیفہ المامون کی ہدایت پر اس کے بھائی ابواسحاق نے جو بعد میں معتصم کے نام سے خلیفہ بنا، گنبد کی مرمت و تزئین کی، اس کا سبب ایک زلزلہ بنا جس سے صخرہ کی عمارت کو نقصان پہنچا تھا۔ یہ کام صالح بن یحییٰ کی زیر نگرانی ۲۱۶ھ (۸۳۱ء) میں ہوا۔ اور لفٹیننٹ اے کونڈر کے بیان کے مطابق اس مرتبہ قبۃ الصخرہ کا بیرونی دیوار سے احاطہ کیا گیا۔ اور بعض بر خود غلط یا خلیفہ کی رضا کے متلاشی معماروں نے خلیفہ عبدالملک کے نصب کردہ کتبہ میں تبدیل کر دی۔ خلیفہ عبدالملک کا کتبہ جنوب مشرقی محراب میں پیوست تھا اور اس کی عبارت یہ تھی۔

"اس گنبد کو اللہ کے بندے عبدالملک امیر المومنین نے سن بہتّر ہجری میں تعمیر کرایا۔ اللہ قبول فرمائے۔"

لیکن یہ کاریگر کتبہ سے سن اور الملک مٹانا بھول گئے، اس لیے ان کی جعل سازی پکڑی گئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آج جو ہشت پہلو عمارت موجود ہے۔ یہ باعتبار کرسی اور نقشہ تعمیر کے مجموعی طور پر بعینہٖ وہی ہے جسے خلیفہ عبدالملک نے ۶۹۱ء میں تعمیر کرایا تھا۔ قبۃ الصخرہ کی سب سے قدیم تفصیلی کیفیت وہ ہے۔ جو ابن الفقیہ نے ۹۰۳ء (۲۹۰ھ) میں لکھی کہ:

"احاطہ حرم کے وسط میں ایک چبوترہ تین سو ہاتھ لمبا اور ایک سو چالیس ہاتھ عریض، ۹ ہاتھ اونچا بنا ہوا ہے۔ اس کی چھ سیڑھیاں چڑھ کر قبۃ الصخرہ میں پہنچتے ہیں، جو چبوترہ کے وسط میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کا عرض و طول سو سو ہاتھ (یعنی ڈیڑھ ڈیڑھ سو فٹ) بلندی

۱۰۵ فٹ اور محیط ۵۴۰ فٹ ہے۔ اس کی چار مسقف ڈیوڑھیاں اور ہر ڈیوڑھی میں چار دَر ہیں۔ اُوپر سنگِ مرمر کا کمانچہ بنا ہُوا ہے۔ خود چٹان ۱۵ فٹ لمبی اور ۴۰ فٹ چوڑی ہے۔ اس کے نیچے ایک غار ہے۔ جس میں باسٹھ آدمیوں کی گنجائش ہے۔ گنبد سفید سنگِ مرمر اور نیچے کی چھت طلائے سُرخ سے بنائی ہے۔ دیواروں میں اوپر کے رُخ ۵۶ دریچے ہیں۔ جو ۵ فٹ لمبے اور ۹ فٹ چوڑے ہیں۔ اور اُن پر مختلف رنگ کے شیشے چڑھے ہوئے ہیں۔ یہ گنبد جسے عبدالملک نے تعمیر کیا۔ بارہ پیل پایوں اور تیس ستونوں پر قائم تھا۔ اس میں گنبد کے اوپر دوسرا گنبد بنا تھا۔ جس پر سیسے کی چادریں اور نیچے سنگِ مرمر تھا۔ آج بھی ہشت پہلو عمارت کے ہر پہلو کا عرض ۶۶ فٹ ہے۔

ابتدائی زمانے میں بھی گنبد اتنا ہی اونچا تھا، جتنا آجکل ہے۔ حالانکہ یہ زلزلوں کے بعد از سرِ نو بنایا گیا۔ البتہ گنبد کے ستونوں کی تعداد اور ترتیب میں ۹۰۳ء کے بعد سے وقتاً فوقتاً (خصوصاً زلزلوں کی وجہ سے) تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ابن الفقیہہ کے مطابق ستونوں کی تعداد ۳۰ تھی لیکن آجکل ۲۸ ہے۔ ان میں سے ۱۲ اندرونی دَور کے ہیں (ہر پیل پائے کے درمیان تین تین) اور ۱۶ بیرونی دَور میں (ہر پائے کے درمیان دو دو ستون) ہیں۔

ابن الفقیہہ کے پچھتر برس بعد (۹۷۸ء) میں ابن حوقل اور اصطخری لکھتے ہیں:

"چٹان کے اوپر عالی شان گنبد ہے، خود چٹان زمین سے نیم قد اونچی ہے۔ اس کا طول و عرض مساوی ہے۔ اس کے نیچے ایک دروازہ سے جو ۵ × ۱۰ ہاتھ ہو گا۔ ایک راستہ اس طرح زینہ بزینہ جاتا ہے، جیسے تہہ خانے میں جاتے ہوں، مگر چٹان کے نیچے کا کمرہ نہ مربع ہے نہ گول۔ بلندی میں قدِ آدم اونچا ہے۔"

مقدسی ۹۸۵ء میں لکھتا ہے کہ:-

"چبوترے کے وسط میں قبۃ الصخرہ ایک ہشت پہلو عمارت پر قائم ہے۔ اس کے چار بڑے دروازے ہیں۔ جن سے صحنِ حرم میں آنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ جنوبی دروازے کا نام باب القبلہ۔ مشرقی کا باب اسرائیل، شمالی کا باب صُور اور مغربی کا باب نساء ہے" ان سب پر سونے کا کام ہے اور ہر ایک کے آگے نہایت خوبصورت اور

منقّش ہیں۔ یہ کواڑ خلیفہ المقتدر باللہ (عہدِ خلافت ۹۰۸ء تا ۹۳۲ء) کی والدہ کے حکم سے یہاں بھیجے گئے تھے۔ ہر دروازے کے اوپر سنگِ مرمر کا کمانچہ ہے۔ کمانچے میں بھی کواڑ ہیں مگر ان پر کوئی نقش و نگار نہیں۔

عمارت کے ستونوں کی تین واحد المرکز قطاریں ہیں۔ یہ ستون سنگِ مرمر کو جلا دے کر بنائے گئے ہیں۔ ان کے اوپر لداؤ کی چھت ہے۔ انہی ستونی دالانوں کے اندرونی رُخ قبۃ الصخرہ کا صدر ایوان ہے۔ جو ہشت پہلو نہیں مدوّر ہے اور اس کے پورے دَور میں گول محرابیں چلی گئی ہیں۔ فرش سے گنبد کے کلس تک بلندی سو ہاتھ ہے۔ یہ خوبصورت کلس ایک بالش ایک بالشت بلندی کے اوپر لگا ہُوا دُور سے دکھائی دیتا ہے۔ گنبد کے بیرونی رُخ پر پیتل کے جلا کئے ہُوئے پترے ہیں اور اندر کی عمارت، فرش، دیواریں اور لداؤ سب اندر باہر سے سنگِ مرمر کے ہیں۔ اور ان پر طرح طرح کے نقش و نگار بنے ہیں۔ گنبد کی چھتری کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اندر کے حصے میں آرائشی گولے لگائے ہیں۔ اس کے بعد لوہے کے شہتیروں کی قینچیاں ہیں، جو سرے سے کھلی ہیں۔ تا کہ تیز ہوا گولے کو جگہ سے نہ ہلا دے۔ پھر تیسرا حصہ چوبی بنایا ہے۔ جس کے اُوپر کے رُخ پیتل جڑا ہے۔ چھتری میں نیچے سے اوپر تک راستہ چھوڑ دیا ہے تا کہ مرمت یا دیکھ بھال کے لیے کاریگر کلس تک جا سکے۔ طلوعِ آفتاب کے وقت جب سورج کی روشنی چھتری پر پڑتی اور اس کی کرنیں پھیلتی ہیں۔ تو اس وقت یہ عمارت قابلِ دید اور ایسی شان دار ہوتی ہے کہ دنیائے اسلام میں اس کی نظیر میں نے نہیں دیکھی۔ نہ میں نے کسی سے سنا کہ عہدِ جاہلیت میں کہیں کوئی ایسی عمارت بنی ہو۔ جو حُسن و شان میں قبۃ الصخرہ کا مقابلہ کر سکے۔"

مقدسی کی اس تحریر کے قریباً ۲۱ سال بعد یعنی ۴۰۷ھ (۱۰۱۶ء) میں زلزلہ سے گنبد گر پڑا اور اس عمارت کو نقصان پہنچا۔ چنانچہ فاطمی خلیفہ الظاہر (واضح رہے کہ ۹۶۹ء سے یہ شہر فاطمی خلفاء مصر کے قبضے میں آ گیا تھا) کے حکم سے ۴۱۳ھ (۱۰۲۲ء) اور ۴۱۸ھ (۱۰۲۷ء) میں اس کی مرمت ہوئی۔ اس مرمت کی یاد میں جو کتبے لگائے گئے۔ ان میں سے ایک کی عبارت یہ ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط بلا شبہ اللہ کی مسجدیں وہی لوگ بحال و درست کرتے ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس گنبد کی بحالی اور مرمت

کا حکم امام ابوالحسن علی الظاہر الاعزاز الدین اللہ ابن الحاکم بامر اللہ امیر المؤمنین
نے دیا۔ اللہ تعالیٰ اس پر اور اس کے اجداد مطہرین پر رحمتیں نازل فرمائے۔
یہ خدمت اس کے ملازم امیر معین الامت حافظ دوست علی بن احمد
انابت اللہ نے ۴۱۳ھ میں انجام دی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے آقا امیر المؤمنین
کے اقبال و استقامت کو دائم قائم رکھے اور مشرق و مغرب پر اس کی
حکومت وسیع کرے۔ ہم سب کاموں کے آغاز و انجام میں اسی کی حمد
کرتے ہیں۔"

ناصر خسرو کی تحریر جو ۱۰۴۷ء میں بیت المقدس آیا۔ صلیبیوں کی آمد سے قبل، زمانہ
کی آخری تحریر ہے اور اس کی دی ہوئی پیمائش موجودہ قبۃ الصخرہ کے طول و عرض سے
حیرت انگیز مطابقت رکھتی ہے، لیکن ستون اور پائے ناصر خسرو کے بیان سے مختلف
ہیں، اس کے بیان کے مطابق اندرونی دور میں چار پائے اور ہر پائے کے درمیان دو ستون
اور بیرونی دور میں آٹھ پائے اور ہر پائے کے درمیان تین ستون تھے۔ ناصر خسرو لکھتا
ہے کہ اس کی دیواریں مربع پتھروں کی بنائی ہوئی اور چالیس چالیس فٹ بلند ہیں، قبۃ ال
کا گنبد ایک فرسخ کے فاصلے سے پہاڑی کی چوٹی کی طرح اٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ گنبد کی
بنیادوں سے کلس تک اس کی بلندی ۶۰ فٹ ہے اور وہ چبوترہ جس پر یہ عمارت
ہے وہ صحن حرم شریف سے ۲۴ فٹ اونچا ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ حرم شریف
کے صحن سے گنبد کے کلس تک کل بلندی ۱۲۴ فٹ ہے۔" چٹان زمین سے قد آدم
ہے۔ اس کے چاروں طرف سنگ مرمر کا محجر بنا ہوا ہے تاکہ کوئی اسے ہاتھ نہ لگا
چٹان کا جھکاؤ قبلے کی سمت (یعنی جنوب کو) ہے۔

" قبۃ الصخرہ کے مکان میں ہر وقت زائرین اور عبادت گزاروں کا مجمع رہتا
عمارت میں ریشم اور دوسری قسم کے نفیس قالینوں کا فرش ہے، گنبد کے وسط میں چاند
اور پر نقرئی زنجیر میں چاندی کا فانوس آویزاں ہے، اور دوسرے حصوں میں بھی کثرت
چاندی کے فانوس لگے ہوئے اور ہر ایک پر اس کا وزن کندہ ہے۔ یہ سب فانوس
خلیفۂ مصر کے عطیہ ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہاں کے مختلف نقرئی ظروف
مجموعی

"لوگ کہتے ہیں کہ معراج کی شب حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے پہلے قبۃ الصخرہ میں چٹان پر دست مبارک رکھ کر دعا فرمائی، اور جس وقت آپ تشریف لے جانے لگے تو چٹان تعظیم کے لیے بلند ہوئی لیکن حضور نے دست مبارک سے روک دیا۔ اور وہ وہیں رک گئی، جہاں تھی۔ چنانچہ آج تک کسی قدر زمین سے اوپر اٹھی ہوئی ہے۔
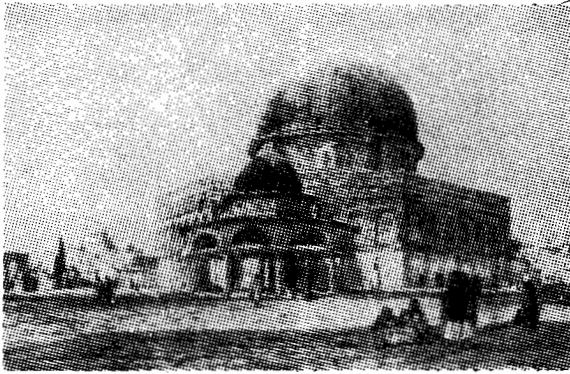
پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس گنبد میں تشریف لائے۔ جو اب تک آپ کے نام سے منسوب ہے۔ اور یہاں مرکب (براق) پر سوار ہوئے۔ اسی لیے یہ گنبد مبارک محترم ہے۔"

صاحب مثیر الغرام نے لکھا ہے کہ ۱۰۶۰ء میں قبۃ الصخرہ کا بڑا جھاڑ جس میں پانچ سو فانوس تھے، نیچے گر پڑا، مسلمانوں نے اسے بدشگونی سمجھا اور کہنے لگے:

"عالم اسلامی میں ضرور کوئی بڑا حادثہ پیش آنے والا ہے۔"

اور اس واقعہ کے ۳۹ سال بعد ۱۰۹۹ء میں واقعی وہ بڑا حادثہ پیش آیا جس سے مسلمانوں کے سر ندامت سے جھک گئے۔ صلیبیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ اور قبۃ الصخرہ کو ہیکل مسیح سمجھ کر معارِبین دیر کے حوالے کر دیا۔ چونکہ یہ لوگ اسے خانۂ خدا TEMPLE DOMINI سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے اس کی تصویر اپنے جنگی طغرے میں شامل کی۔ اور یورپ کے مختلف گرجاؤں میں اس کے نقشے اور رو کار کی نقل کی گئی۔ لفٹیننٹ کونڈر رائل انجینئر لکھتا ہے کہ صلیبیوں نے صخرہ مقدس کو موجودہ شکل میں تراشا اور سنگ مرمر کے چوکے بچھا کر اس پر قربان گاہ بنائی۔ یہ کام ۱۱۱۵ء سے ۱۱۳۶ء تک ہوتے رہے۔ اور چبوترے پر جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی قربان گاہیں بنائیں اور قبۃ الصخرہ کی بیرونی دیوار کے اندرونی حصہ پر تصویریں

نقش کیں۔ علی ہروی نے جو صلیبیوں کے دور میں، صلاح الدین کے شہر کو دوبارہ تسخیر کرنے سے پندرہ سال قبل یعنی ۱۱۷۳ء میں یہاں آیا تھا۔ لکھا ہے کہ صلیبیوں نے چٹان کے گرد سنگ مرمر کے محجر کی جگہ، جس کا ذکر ناصر خسرو نے کیا ہے، آہنی جنگلہ لگا دیا تھا اور اس کے اندر حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰؑ کی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔

۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس پر قبضہ کیا۔ تو اس نے حرم شریف کے احاطے کو پھر کامل طور پر اصلی حالت میں واگزاشت کیا اور فرنگیوں کے جوشِ تبرک گیری نے چٹان کی جو حالت کر دی تھی۔ اس کی بھی اصلاح کی۔

ابنِ اثیر لکھتے ہیں: "فرنگیوں نے چٹان پر سنگِ مرمر کی ایک تہہ چڑھا دی تھی۔ صلاح الدین نے اسے حکماً اُتروا دیا۔ اس تہہ بندی کا سبب یہ تھا کہ ابتدا میں فرنگیوں کے مذہبی پیشوا چٹان کے ٹکڑے توڑ کر فرنگی زائرین کے ہاتھ بیچا کرتے تھے، جو ان ٹکڑوں کو نہایت بابرکت سمجھ کر ان کے ہم وزن سونا دے کر خوشی سے خرید لیتے تھے۔ بعض لاطینی بادشاہوں کو اندیشہ ہوا ہے کہ اس طرح کہیں ساری چٹان غائب نہ ہو جائے چنانچہ انھوں نے اسے محفوظ رکھنے کے لیے اسے سنگ بستہ کرنے کا حکم دیا۔ صلاح الدین نے تزئین نو میں بتوں کی تصویروں کو صاف کرا دیا اور قبۃ الصخرہ کی مرمت کر کے نقش و نگار میں سنہری رنگ بھروایا۔ یہ کام رجب ۵۸۶ء بمطابق ۱۱۹۰ء میں ہوا۔ جیسا کہ ایک کتبہ سے ظاہر ہے۔

> "ہمارے آقا سلطان الملک الناصر العالم العادل صلاح الدین یوسف بن ایوب نے (خدا ان پر رحمت فرمائے) ۵۸۶ء میں اس مقدس گنبد کی تجدید یا اور اس پر سونا چڑھانے کا حکم دیا۔"

خاندان ایوبی کے اکثر فرماں رواؤں نے اس عمارت کی تجدید یا مرمت یا تزئین و آرائش میں حصہ لیا۔ ان میں الملک العادل سیف الدین، الملک المظفر تقی الدین، الملک الافضل نورالدین، الملک العزیز عثمان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر کے حکم سے آہنی جالی دار جنگلہ کے علاوہ ایک خشتی جنگلہ بھی چٹان کے گرد تعمیر ہوا۔ یہ تمام تاجدار اپنے ہاتھوں سے مسجد میں جھاڑو دیا کرتے، اس کے فرش کو عطر گلاب سے دھوتے اور پھر غرباء و مساکین میں خیرات تقسیم کیا کرتے تھے۔

مملوک سلاطین مصر کا دور آیا تو انھوں نے اس کی خدمت گزاری کو فلاحِ دارین جانا۔ ان کے دور میں قبہ کی بیرونی دیواروں کے بالائی حصے کی روغنی اینٹیں جو شکستہ وخستہ ہو گئی تھیں، تبدیل کی گئیں، الملک الظاہر بیبرس کے دور میں بڑے پیمانے پر مرمت ہوئی۔ سلطان محمد بن الملک المنصور قلاؤن نے گنبدِ صخرہ کی عمارت اور بالائی گنبد پر جلا کرنے اور اس کو جست کی چادروں سے ڈھانپنے کی سعادت ۱۹-۱۳۱۸ء میں حاصل کی۔ اس کام کی نگرانی امیر صوابی نے کی تھی۔ اس سے قبل ۱۲۹۴ء میں الملک العادل زین الدین کے حکم سے ان شہرۂ آفاق قدرتی مناظر کی رنگین و دلکش تصاویر از سرِ نو بنائی گئیں۔ جو اس عمارت کے لیے قابلِ فخر ہیں۔

ابن بطوطہ ۱۳۵۵ء بیت المقدس آیا تھا، وہ تفصیلات نہیں بتاتا البتہ عمارت کی تحسین میں رطب اللسان ہے اور چٹان و قبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ گنبد میں لوہے کی ایک بڑی سپر لٹکی ہوئی ہے، لوگ اسے حمزہ کی ڈھال بتاتے ہیں۔

۱۳۸۷ء میں الملک الظاہر برقوق نے محمد الصفی بہادر کے زیرِ نگرانی وہ خوبصورت منبر نصب کرایا۔ جو اس گنبد کے جنوبی دروازے سے نظر آتا ہے۔ یہ منبر تمام کا تمام سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اور دس مرمریں ستونوں پر قائم ہے۔

۱۴۳۲ء میں الملک الاشرف برس بائے نے اپنے نائب شہزادہ ارکاس جلیمانی کو حکم دیا کہ متعدد دیہات اور دوسری جائیداد خرید کر اس مقدس عمارت کی دیکھ بھال کے لیے وقف کر دی جائے۔ یہ سب سے پہلا وقف ہے، جو ایک سلطان کے حکم سے قبۃ الصخرہ کے اخراجات پورا کرنے کے لیے قائم ہوا۔ اس کی یادگار کے طور پر مشرقی دیوار پہ ایک کتبہ کندہ کیا گیا جو آج بھی شیشہ اور مہین جالی کے نیچے محفوظ ہے۔

مجیر الدین بیان کرتا ہے کہ ۸۵۱ھ (۱۴۴۸ء) میں آگ لگنے یا برق گرنے سے قبۃ الصخرہ کی چھت جل کر تباہ ہو گئی اور سلطان الملک الظاہر نے اسے دوبارہ اس طرح تعمیر کرایا کہ "وہ پہلے سے بھی زیادہ خوش نما ہو گئی" اس مرمت پہ ڈھائی ہزار دینار (موجودہ ڈیڑھ لاکھ روپے) خرچ ہوئے اور ۲۶ ٹن جست کام میں آیا۔

۱۴۷۰ء میں علامہ سیوطی اس چٹان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہاں جو نقوش پا ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔

(واضح رہے کہ چٹان کے ایک گوشے میں پاؤں کے نشان ہیں) جبکہ آنحضورؐ آسمان پر جاتے وقت براق پر سوار ہوئے۔ صلیبی دور میں انھیں مسیحؑ کے نقش پا بتایا جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت عمرؓ تشریف لائے تو چٹان کو گویائی عطا ہوئی۔ اور اس نے آپ کو مرحبا کہا۔ چٹان پر حضرت جبریلؑ کی انگلیوں کے بھی نشان ہیں۔ کیونکہ جب چٹان نے رسول اللہؐ کی آسمان پر جاتے وقت معیت کرنا چاہی ـــــ تو حضرت جبریلؑ نے اسے دھکا دے کر اپنی جگہ پر قائم کیا۔ اور یہ نشان باقی رہ گئے۔ آجکل یہ قدم شریف چٹان سے الگ ایک پتھر پر اور اس کے مقابل میں دوسری یعنی جنوب مغرب کی طرف نظر آتے ہیں، چٹان بجز جنوبی حصے کے دیوار پر کھڑی ہے۔ لوگ جنوبی حصہ میں واقع زینے سے اتر کر غار میں جاتے ہیں۔ زینے میں ایک جگہ چھوٹی سی الماری ہے۔ جس کے قریب ٹھہر کر زائرین چٹان کی زبان کی زیارت کرتے ہیں ـــــ اس جگہ سنگ مرمر کا ایک ستون ہے۔ جس کا نچلا حصہ الماری کے جنوبی سرے پر ٹکا ہوا اور اوپر کا رخ چٹان کے بالمقابل نکلا ہوا ہے، جبریل کی انگلیاں چٹان کے مغربی جانب ہیں"۔ قبۃ الصخرہ میں لوگ آج بھی یہ عجائبات دیکھتے ہیں۔ وہ انہی مقامات پر ہیں۔ جہاں سیوطی نے انہیں دیکھا تھا آخری بار مملوک سلطان الملک الاشرف قایتبائی نے ۱۴۶۷ء میں قبۃ الصخرہ کے تمام چوبی دروازوں پر نہایت خوبصورت کام کی تانبے کی چادریں چڑھوائیں جس سے ان کی مضبوطی اور دلکشی میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

سولھویں صدی کے ربع اول میں بیت المقدس ترکمان عثمانی کے قبضہ میں آ گیا۔ اور ۱۵۳۸ء میں سلطان سلیم اول کے نامور فرزند سلطان سلیمان اعظم کے حکم سے حرم القدس کی تزئین و آرائش پر توجہ دی گئی تو مسجد کی بیرونی دیواروں میں نئی ٹائلیں لگانے اور گول گنبد کے زیریں حصے میں سنہری کھڑکیاں نصب کرنے کے ساتھ ساتھ قبۃ الصخرہ کے گول ستونوں پر سنگ مرمر لگایا گیا۔ اور قبہ کی تجدید و مرمت ہوئی۔ سلطان کے نام کا کتبہ ابھی تک گنبد صخرہ کے باب الجنۃ کے اوپر لگا ہوا ہے "خدا کا شکر ہے کہ سلطان اعظم اور خاقان اکرم دلیل و برہان کے ساتھ خلافت کے وارث ـــــ ابوالفتوحات سلیمان خاں بن سلطان صاحب سخا سلیم خاں مظفر و منصور صاحب مناخر ابن سلطان بایزید ابن سلطان مجاہد الامجد سلطان محمد بن عثمان کے سایۂ دولت میں بیت المقدس کے آثار

عالی شان گنبدِ صخرہ کی مرمّت عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی لحدوں پر رحمت کی بارش فرمائے۔ پس ماہر انجینئروں نے ۹۵۱ھ میں اس عمارت کو پہلے سے بھی زیادہ شان و شوکت کے ساتھ بحال کیا۔ کتبہ لکھنے کی سعادت عبداللہ تبریزی کو حاصل ہوئی۔"

۸۴۰ء میں سلطان محمود نے اس کی مرمریں سلوں کو تبدیل کیا جنھیں موسم کے باعث سخت نقصان پہنچا تھا۔ ۱۸۵۳ء میں سلطان عبدالمجید کے حکم سے ایک ایرانی انجینئر کے زیرِ نگرانی قبۃ الصخرہ کے متعدد حصّوں کی مرمت ہوئی، اس کے بعد ۱۸۷۳ء میں سلطان عبدالعزیز کے عہد میں چوبی چھت کی مرمت کی گئی، جو مرورِ زمانہ سے بوسیدہ ہوگئی تھی۔ گنبد کی چھت پر لگی ہوئی چادریں بھی تبدیل کی گئیں، اور جنوبی دروازہ کے اندر بلور کا ایک نفیس اور بڑا جھاڑ آویزاں کیا گیا۔ جس سے عمارت کی خوبصورتی دوبالا ہوگئی۔

۱۸۷۵ء میں سُلطان عبدالحمید ثانی نے بیش قیمت ایرانی قالین منگوا کر فرش پر بچھوائے۔ یہ خوبصورت قالین جن کی مالیت لاکھوں روپے ہے۔ جنگ جون ۶۷ء تک اس گنبد کی زینت بنے رہے، اسی کے زمانے میں وہ شاندار بلوریں جھاڑ بھی آویزاں کیا گیا۔ جو ۱۹۵۱ء تک عین چٹان کے اوپر لٹکا ہوا نظر آتا تھا۔ بعد میں اسے مسجدِ اقصیٰ میں منتقل کر دیا گیا۔ اسی سلطان کے حکم سے گنبد کی بیرونی دیواروں پر نہایت عمدہ خطِ نسخ میں سورۃ یٰسین لکھی گئی۔

مولانا شبلی (۱۸۹۲ء) میں لکھتے ہیں کہ:

صخرہ کا قبہ بلند چبوترہ پر ہے، اس مثمن برُج کی بلندی کم و بیش سو فٹ ہے۔ دیواروں پر نہایت عمدہ لاجوردی اور طلائی کام ہے۔ چمک اور روشنی سے آنکھ نہیں ٹھہرتی۔"

اور ۱۳۲۹ھ میں محمد عاشق الٰہی میرٹھی نے "زیارت الشام والقدس" میں لکھا ہے: کہ "صخرہ شریف کا صحن شمالاً جنوباً ۱۳۵ ہاتھ، شرقاً غرباً ۲۸۹ ہاتھ ہے۔ صحن مسجد سے سات ہاتھ اونچا ہے۔ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ نو زینے چڑھ کر صخرہ کے چبوترے میں داخل ہوتے ہیں۔ صحن میں چاروں طرف سات قبے ہیں۔ غرب شمال کے قبہ کو 'قبۃ الارواح'، اس کے پہلو میں قبۃ الخضر، تیسرا قبہ نج نج، اس کے پہلو میں قبۃ المعراج، جس کے متعلق مشہور ہے کہ شبِ معراج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اسی قبہ سے آسمان کی طرف صعود فرمایا۔ اس کے پہلو میں قبۃ الصلوٰۃ کہ یہاں حضورؐ نے تمام انبیاء و ملائکہ کی امامت فرمائی۔ قبۃ الصخرہ کے مشرقی جانب قبۃ السلسلہ اور آخر صحن میں جانب قبلہ، قبہ مریم ہے۔

وسط صحن میں قبۃ الصخرہ ہے۔ جو بیش قیمت سنگِ مرمر کے سولہ ستونوں پر قائم ہے، اکیاون ہاتھ اونچا اور رنگ برنگ کے شیشوں سے آراستہ ہے، فرش کا دور (قطر) دوسو چالیس ہاتھ ہے۔ اوپر نیچے دو چھتیں ہیں۔ سقفِ زیریں لکڑی کی ہے اور طلائی روغن سے نہایت خوش نما آراستہ ہے۔ بالائی چھت میں رانگ، سیسہ اور دوسری دھات ملی ہے۔ چار سمت چار دروازے ہیں، شمالی باب الجنہ کہلاتا ہے، زائرین اسی دروازہ سے داخل ہوتے ہیں۔

اس کی ہموار سطح میں قبلہ رُخ سیڑھیاں ہیں۔ ان سیڑھیوں میں داہنی جانب ایک مقام لسان الصخرہ ہے، لکھتے ہیں معراج کی شب اللہ تبارک وتعالیٰ نے صخرہ کو قوتِ گویائی دی۔ اور اس مقام سے رسول اللہ کو سلام کی آواز آئی۔ اس لیے اس کا نام لسان صخرہ پڑ گیا۔ یہ سیڑھیاں صخرہ کے نیچے غار میں جاتی ہیں، یہاں سیڑھیوں سے اُتر کر داہنے ہاتھ محراب ہے۔ جو سیدنا سلیمانؑ سے منسوب ہے۔ اس کے قریب ایک محراب رسول اللہ سے منسوب ہے۔ اس سے متصل زمین سے ایک ہاتھ اونچی سیّدنا خضرؑ کی محراب ہے۔ اس کے قریب مسند سیدنا جبریلؑ اور محراب سیدنا ابراہیمؑ ہے۔ سیدنا ابراہیمؑ کی محراب سے سیدنا داؤدؑ کی محراب متصل ہے۔"

۱۹۱۷ء میں ترکوں نے احترام شہر کی بنا پر لڑے بغیر شہر خالی کر دیا۔ تو ۱۹۱۹ء میں یہ شہر برطانوی انتداب میں آگیا۔ ۱۹۲۰ء میں مسلم مقامات و آثار کی حفاظت و نگہداشت کے لیے ایک اعلیٰ مجلس اسلامی (سپریم مسلم کونسل) قائم کی گئی۔ اس مجلس کو ان مقامات کے اوقاف سے حاصل ہونے والی پوری آمدنی کے صرف کا مجاز قرار دیا گیا۔ اس مجلس کے قیام کے بعد ایک جائزہ سے معلوم ہوا کہ نکاسی آب کے راستے مسدود ہو جانے کی وجہ سے بارش کا پانی قبۃ الصخرہ کی دیواروں میں رستا رہا ہے۔ جس سے دیواریں کمزور ہو گئی ہیں، چنانچہ کونسل نے پرانے بوسیدہ پائپوں کی جگہ نئے جستی پائپ لگائے، کئی شکستہ ٹائیلوں کو بدلا۔ ان کے علاوہ ایسے اقدامات کیے کہ عمارت کے بیٹھنے کا خطرہ ٹل گیا۔

۱۹۲۷ء میں کونسل نے گنبد صخرہ کی مرمت وسیع پیمانے پر کروائی۔ الحاج مولانا الیاس برنی کے الفاظ میں اس کے لیے اکثر ممالک اسلام سے چندہ کیا گیا، گنبد کی درستی میں ترکی انجینئروں نے انتہائی کمال وفن کا مظاہرہ کیا۔ قدیم گنبد اپنی جگہ معلق رہا۔ اور اس کے نیچے کی دیواریں تعمیر ہوئیں۔ اور نقش و نگار کی تجدید کی گئی۔

۱۹۴۸ء میں نازک ترین لمحات آئے، جب یہود نے بیت المقدس پر قبضہ کی کوشش کے دوران قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصےٰ کو بھی اپنا نشانہ بنایا۔ جس سے مسجد اقصیٰ کے ساتھ ساتھ قبہ کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ اس کی تلافی شاہ اردن کے محدود وسائل سے ناممکن تھی اس لیے عالم اسلام سے اپیل کی گئی جس پر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے مسلمانوں نے لبیک کہا۔ حکومتِ پاکستان نے بھی کئی کروڑ روپے کا عطیہ دیا۔ ۱۹۵۸ء میں سعودی عرب کے مشہور تاجر اور صاحب ثروت شیخ محمد بن سدون مرحوم کو تعمیر و مرمت کا ٹھیکہ دیا گیا اس فرم نے ماہرین تعمیرات، انجینئروں اور مہندسوں کی نگرانی میں تعمیر و مرمت کا کام شروع کردیا۔ جو اپریل ۱۹۶۴ء میں بخیر و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس پر تین لاکھ بتیس ہزار پونڈ صرف ہوئے۔ حکومتِ اردن نے اس خوشی میں ایک جشن منایا اور جملہ ممالکِ اسلامیہ کے نمائندے شریک ہوئے۔

مولانا شیر علی، جو اس تعمیر کے بعد القدس گئے تھے، لکھتے ہیں:

"مسجد صخرہ کی حسین و جمیل عمارت پر سنہری گنبد ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا نیلم سورج کی شعاعوں کے اثرات سے جھلمل کر رہا ہے۔ مسجدِ صخرہ، مسجدِ اقصیٰ کے جانب شمال تقریباً ۲۵۰ قدم اور دس فٹ اونچی سطح پر واقع ہے۔ یہ مسجدِ مثمن (ہشت کونہ) شکل میں ایک گول بلند عمارت ہے، جس کی بلندی اندازاً اسّی فٹ ہوگی۔ اس کا ہر کونہ بتیس قدم ہے۔ گویا تمام عمارت کی گولائی (لپیٹ) ۱۶۰ گز ہے۔ صخرہ عربی زبان میں ایک بڑے پتھر کو کہتے ہیں۔ اس مسجد کے درمیان میں زرد رنگ کی ایک بہت بڑی چٹان ہے۔ اس لیے اس کو مسجد صخرہ کہتے ہیں۔ جانب قبلہ یعنی جنوب کی طرف اس چٹان کے نیچے اترنے کی سیڑھیاں ہیں، لوگ نیچے اتر کر نوافل پڑھتے اور تلاوت کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں رحمتِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے نوافل پڑھے ہیں۔ اس پتھر کے نیچے کُشادہ جگہ (غار) ہے، جس میں بیک وقت پچاس آدمی بخوبی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ عام لوگوں میں مشہور

اخبارات سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ اس عظیم اسلامی عمارت کو شدید نقصان پہنچا۔ اب اس مقدس مقام پر اسلام اور پیغمبر اسلام کے بدترین دشمن یہود کا قبضہ ہے اور لندن ٹائمز کی اطلاع کے مطابق یہودیوں نے مسجد اقصےٰ کے نیچے گہری کھدائی کے بعد گنبد صخرہ اور مسجد اقصیٰ کی جگہ تیسرے ہیکل کی تعمیر کے منصوبہ پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے۔ خدا کرے کہ ہمیں یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہو۔

مشہور ماہرِ فنِ تعمیر جیمز فرگیسن لکھتا ہے کہ قبۃ الصخرہ کی مسجد غیر معمولی طور پر خوب صورت ہے۔ میں نے ہندوستان، یورپ اور دنیا کے دیگر مقامات میں بہت سے محلات اور شاندار عمارات دیکھی ہیں۔ لیکن جہاں تک میرے حافظہ کا تعلق ہے میں نے کوئی عمارت شان و شوکت میں قبۃ الصخرہ کے برابر نہیں پائی۔ ایسا عمدہ تناسب اور رنگوں کا ایسا حسین امتزاج کسی اور عمارت میں نہیں دیکھا۔ ایک یہودی مؤرخ پروفیسر ہیئر لوئیس اپنی تالیف "یروشلم کے اماکن مقدسہ" میں رقمطراز ہے کہ:-

"اس میں کوئی شک نہیں کہ گنبدِ صخرہ دنیا کی حسین ترین عمارت ہے۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ تاریخ میں جن یادگار عمارتوں کا ذکر ہے۔ ان میں یہ عمارت سب سے زیادہ خوبصورت اور شاندار ہے۔"

بزمی انصاری اس گنبد کی شان و شوکت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

گنبدِ صخرہ قدیم اسلامی فنِ تعمیر کی بے نظیر مثال ہے۔ اس کی کرسی ۱۲ فٹ بلند ہے جونہی کوئی زائر حرم شریف کے کسی دروازے سے احاطہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی نظریں نازک لیکن بے حد مضبوط محرابوں پر پڑتی ہیں۔ جن تک سیڑھیوں کے ذریعے پہنچا جاتا ہے۔ ان محرابوں کو اہلِ قدس موازین کہتے ہیں، اور یہ گنبد صخرہ کے چاروں سمتوں میں بنی ہوئی ہیں۔ ان کے بعد سنگی چوکوں کا فرش ہے۔ جس کے درمیان میں گنبدِ صخرہ کی ہشت پہلو عمارت ہے۔ اس کا ہر ضلع ۲۳ ہاتھ ۲۰۰۱۵ میٹر ہے۔ بلندی چھتیس فٹ ہے۔ دیواروں کی اونچائی ۹۰۵۰ میٹر ہے۔ جن کے اوپر ۲۰۶۰ میٹر بلند منڈیر بنی ہوئی ہے۔ اس منڈیر کے اوپر ایک نہایت شاندار گنبد ہے، جس پر ہلال نصب ہے۔ گنبد کی عمارت کے زیریں حصہ میں دھاری دار سفید سنگِ مرمر لگا ہوا ہے اور بالائی حصہ میں کاشی کاری کی گئی ہے۔ جا بجا نہایت دیدہ زیب اور جاذبِ نظر رنگوں

میں قدرتی مناظر بنے ہوئے ہیں۔ اور قدیم کوفی خط میں قرآن پاک کی آیات کندہ ہیں۔ جو نیلے اور سفید رنگوں سے مزین ہیں۔ گنبد کا اندرونی حصہ ستونوں پر ایستادہ ہے جو بیحد خوبصورت ہیں۔
گنبد صخرا کا صحن سنگِ رخام سے اور فرش سنگِ مرمر سے بنا ہے، جس پر پُر قیمت قالین بچھے رہتے ہیں، جنوبی دروازہ کے آگے، جو مسجد اقصیٰ کی سمت کھلتا ہے، سنگِ مرمر کی ایک غلام گردش بنی ہوئی ہے، جو آٹھ ستونوں پر قائم ہے۔
صخرہ کا خوب صورت گنبد سنگِ مرمر کے بارہ ستونوں اور سنگِ خارا کے چار چوکور استوانوں پر قائم ہے۔ پورے گنبد میں رنگین شیشوں سے مزین سولہ دریچے ہیں۔ جن میں سے چھن چھن کر ہلکی سکون آور روشنی عمارت میں آتی رہتی ہے۔ ان میں بیشتر دریچے اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے ہیں۔ نیچے کی عمارت ۵۶ دریچوں سے مزین ہے اور ہر ضلع میں سات سات دریچے ہیں۔ ان میں چالیس جو گنبد کے بالکل نیچے ہیں، روشنی کے لیے ہیں۔ اور باقی سولہ صرف زینت کے لیے، کیونکہ ان میں سے روشنی اندر نہیں آسکتی۔ پوری عمارت کی چھت جس پر گنبد واقع ہے سنگِ مرمر کے آٹھ اور رنگین پتھر کے سولہ ستونوں پر ایستادہ ہے۔

صخرہ کا قطر ۲۰ء۴۴ میٹر ہے اور یہ ۳۱ میٹر بلند ہے، بیت المقدس میں اس سے اونچی کوئی عمارت نہیں۔ یہ شہر کے ہر حصہ اور بیرونِ شہر سے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ قدس کا مسافر جدھر سے بھی آتا۔ اس کی نظر سب سے پہلے اسی گنبد پر پڑتی ہے۔ فی الحقیقت یہ گنبد دہرا ہے۔ بیرونی اور اندرونی دونوں گنبد لکڑی کے بنے ہوئے ہیں، باہر کے گنبد پر جست کی چادریں چڑھی ہوئی ہیں۔ گویا اس طرح اس عمارت کو ایئر کنڈیشنڈ کیا گیا ہے۔ اس ترکیب سے سخت گرمی کے ایام میں بھی عمارت کا اندرونی حصہ جسے بطورِ مسجد استعمال کیا جاتا ہے۔ ٹھنڈا اور موسمی اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ پوری عمارت گوناگوں قدرتی مناظر اور بیل بوٹوں سے آراستہ ہے۔ ان کا رنگ شوخ اور چمکدار ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کاریگر ابھی ابھی پاڑ سے اترے ہیں۔ اندرونی دیواروں پر جا بجا آیاتِ قرآنی کندہ ہیں۔ جو پھول پتی اور گل بوٹوں سے گھری ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں نیلی زمین پر سفید ستارے بنے ہوئے ہیں۔ جو شام کے دھندلکے میں عجیب بہار دیتے ہیں اور یہودی پروفیسر ہیری موسلر کے الفاظ میں "جتنی سیاہ عمارات میں نے دیکھی ہیں، ان سب

میں گنبدِ صخرہ بلا تصنّع عبادت اور ریاضت کے لیے بہترین جگہ ہے۔ حدیثِ رسولؐ میں ہے کہ اس مقام پر جو نماز ادا کی جائے۔ اس کا ثواب ۲۵ ہزار نمازوں کے برابر ہے۔

—— ؞ ——

باب ہفتم

قبۃ الصخرہ

چبوترہ اور سیڑھیاں

احاطۂ حرم شریف کے اس چبوترہ کا طول وعرض جس پر قبۃ الصخرہ واقع ہے۔
ابن الفقیہہ کے دور (۹۰۳ء) میں ۴۰۵ فٹ × ۲۱۰ فٹ، ناصر خسرو کی زیارت القدس
کے وقت (۱۰۴۷ء) ۶۶۰ فٹ × ۴۰۰ فٹ تھا۔ آج کل یہ چبوترہ ۵۴۰×۴۶۵ فٹ
ہے اور ابن الفقیہہ اس کی بلندی ۱۴ فٹ اور ناصر خسرو ۲۴ فٹ۔ بتاتا ہے لیکن آجکل
یہ چبوترہ حرم شریف کی سطح سے صرف دس فٹ اونچا ہے اور موجودہ پیمائشیں پندرھویں
صدی عیسوی میں مجیرالدین کے بیان کے عین مطابق ہیں۔
ابن الفقیہہ تحریر کرتا ہے کہ چبوترے پر چڑھنے کے لیے چھ زینے ہیں لیکن اس
کے اسی برس بعد مقدسی لکھتا ہے کہ چبوترے کے ہر چہار پہلو پر ایک ایک زینہ تھا۔
جبکہ ۱۰۴۷ء میں خسرو پھر ۶ زینے بتاتا ہے۔ ناصر خسرو ان کی تفصیلات بیان کرتے
ہوئے لکھتا ہے:

"قبلے (یعنی جنوب) کی طرف اوپر جانے کے دو زینے ہیں، ان کی درمیانی منڈیر
کے بیچ میں جنوب رو کھڑے ہو کر دیکھیں تو ایک زینہ دائیں اور ایک بائیں ہوگا۔ دائیں
زینہ کو مقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ آپ شب معراج اسی طرف سے چبوترے
پر تشریف لائے تھے۔ بایاں زینہ مقام غوری کہلاتا ہے، مقام النبیؐ ۲۰ ہاتھ عریض
ہے اور اس طرح بنا ہے کہ گھڑسوار گھوڑے سمیت چبوترے پر چڑھ سکتا ہے زینے
کے اوپر سنگ مرمر کے چار پائے سنگ مرمر سے زمرد کی طرح سبز رنگ کے بنے ہوئے
ہیں۔ پایوں کی بلندی ۱۰ ہاتھ ہے۔ پایوں اور کمانوں پر سونے اور چینی کی ایسی میناکاری
ہے کہ اس سے بہتر قیاس میں نہیں آتی۔ چبوترے کے گرد کی منڈیر ہرے سنگ مرمر سے

بنی ہے۔ اور اس میں چٹنیاں اس طرح پڑی ہیں کہ جیسے سبزہ زار میں پھول کھلے ہوں۔

مقام غوری کے زینے میں تین رُخ سیڑھیاں بنی ہیں۔ ایک سامنے اور دو بازوؤں میں اور تینوں سیڑھیوں کے سرے پر کنگورہ اور محرابیں بنی ہیں۔ ہر زینہ پتھروں کو چوکور تراش کر کے ہنرمندی سے بنایا ہے۔ یہ زینہ ترک سالار امیر لیث الدولہ نوشتگین غوری نے بنایا تھا۔ جو غلام سے ترقی کر کے خلیفہ مصر الظاہر کے عہد میں شام کا والی تھا۔ اس کا دور ۱۰۲۸ء سے ۱۰۴۱ء تک رہا۔ چبوترے کے مغربی پہلو پر دو، مشرقی پر ایک، اور شمال کی جانب (مقام شامی) ایک زینہ ہے۔ مقام شامی دوسروں سے بلند اور چوڑا ہے۔"

ناصر خسرو مزید بتاتا ہے۔ کہ ان پر کم و بیش ایک لاکھ دینار (پچاس ہزار پونڈ) خرچ ہوئے ہوں گے۔ ۱۹۲۰ء میں ایک زنگی پیری لکھتا ہے کہ آجکل چبوترے پر چڑھنے کے لیے آٹھ چوڑی سیڑھیاں ہیں۔ دو دو شمالی اور جنوبی، تین مغربی اور ایک مشرقی سمت۔ ہر سیڑھی پر محرابیں ہیں، جنھیں مقامی لوگ موازین کہتے ہیں۔ کیونکہ روایت ہے کہ روزِ محشر ان لوگوں کی روحوں کا وزن کرنے کے لیے جو وادی کیدرون پر قائم پل صراط سے کامیابی سے گزریں گے، ترازو ان پر نصب کیے جائیں گے۔ پیری مزید لکھتا ہے۔ اس چبوترے کے شمال اور جنوب میں چھوٹی چھوٹی عمارتیں ہیں۔ جن میں مسجد کے متولی اور خدام رہتے ہیں۔

مغارۃ الارواح

قبۃ الصخرہ کے نیچے چٹان کی جنوبی سمت گیارہ سیڑھیاں ہیں ایک غار میں لے جاتی ہیں جسے مغارۃ الارواح اور راستہ کو باب المغارہ کہتے ہیں۔ تہہ خانے کا فرش سنگ مرمر کا ہے۔ دیواروں پر سفیدی کی گئی ہے۔ ابن حوقل اور اصطخری لکھتے ہیں کہ چٹان کے نیچے کا یہ کمرہ نہ مربع ہے نہ گول اور بلندی میں قدِ آدم اونچا ہے۔ علی ہروی بھی اس تہہ خانہ کو مغارۃ الارواح موسوم کرتا ہے۔ کیونکہ

"لوگ کہتے ہیں کہ تمام اہلِ ایمان کی روحیں حکم الٰہی سے اس مقام پہ جمع ہوں گی۔"

علی ہروی مزید لکھتا ہے۔ کہ یہاں سیڑھیاں اترنی پڑتی ہیں۔ اور لوگوں کا بیان ہے کہ زکریاؑ کی قبر بھی اس غار کے اندر ہے۔ غار کی بلندی قدِ آدم عرض شرقاً غرباً ۱۱ قدم اور

طول شمالاً جنوباً ۱۴ قدم ہے محیط میں ۵ ورع ہے"

کہتے ہیں کہ دورِ قدیم میں غار ایک خلا تھا اور چٹان کے نیچے ایک کنواں تھا جسے بیر الارواح کہتے تھے لیکن بعد میں بیر الارواح پر دیوار بنا دی گئی اور یوں چٹان کو سہارا مل گیا۔ روایت ہے کہ تمام انبیاء سابقون نے اس غار میں نماز ادا کی ہے۔ اس غار میں حضرت ابراہیمؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، خضرؑ (جسے نزنگی سینٹ جارج کہتے ہیں) کی جائے عبادت کو محرابوں سے متعین کر دیا گیا ہے۔ مقام خضر شمالی اور مقام داؤد جنوبی کہتے ہیں۔ ایک مقام کے بارے میں جسے مقام النبیؐ کہا جاتا ہے، روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ نوافل ادا کیے اور چونکہ حضورؐ بلند قامت تھے۔ اس لیے چٹان ان کی قامت کے برابر جگہ بنانے کے لیے اوپر اٹھ گئی۔ اس غار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار مبارک بھی موجود ہیں، جن میں موئے مبارک اور نقش پا شامل ہیں۔ اور یہ جنوب مغربی گوشے کی ایک مرمریں الماری میں محفوظ ہیں اس الماری کے بالمقابل ایک صندوق میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ کے علم محفوظ ہیں۔

ایڈورڈ ایس ولیلیس لکھتا ہے: کہ غار کا ایک راستہ وادی کیدرون میں کھلتا تھا۔ جسے سنگ مرمر کی سلوں سے بند کر دیا گیا۔ اور اب اس کی سخت حفاظت کی جاتی ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے۔ اس غار میں بیک وقت پچاس ساٹھ آدمی سما سکتے ہیں۔ اور سال میں ایک ہزار سے زائد سیاح اس کی زیارت کرتے ہیں۔

قبۃ السلسلہ

مقدسی لکھتا ہے کہ "حرم شریف کا صحن ہر جگہ پختہ ہے، اس کے وسط میں مدینہ شریف کی مسجد کی طرح ایک چبوترہ اٹھا ہوا ہے، جس کے چاروں طرف چوڑی چوڑی سیڑھیاں ہیں۔ اس چبوترے پر چار گنبد بنے ہیں ان میں قبۃ السلسلہ، قبۃ المعراج اور قبۃ النبی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ یہ دیواروں کے بغیر سنگ مرمر کے ستونوں پر قائم ہیں۔ ان پر سیسے کی چادریں چڑھی ہوئی ہیں" علی ہروی کا بیان ہے کہ:

"گنبد (قبۃ الصخرہ) کا مشرقی دروازہ قبۃ السلسلہ کی طرف کھلتا

ہے۔ اس کے اوپر ایک محراب بنی ہوئی ہے۔ اور محراب پر خلیفہ قائم بامر اللہ کا نام اور سورۂ اخلاص کندہ ہے۔ یہی مقام ہے جہاں حضرت سلیمانؑ بن داؤدؑ بیٹھ کر داد رسی فرماتے تھے۔

ابن الفقیہ کی روایت ہے کہ:

"قبۃ الصخرہ کے مشرق کی جانب قبۃ السلسلہ بیس ستونوں پر قائم ہے۔ اور چھت پر سیسے کی چادریں چڑھی ہیں۔ اس کے روبرو (مشرق ہی کی طرف) حضرت خضرؑ کا مقام عبادت ہے اور اس کے شمالی رخ پر قبۃ النبیؐ اور مقام جبریلؑ ہیں اور یہاں کے برابر قبۃ المعراج واقع ہے۔"

مختصر یہ کہ قبۃ الصخرہ سے چند قدم مشرق میں ایک چھوٹا سا گنبد صرف ستونوں پر قائم ہے۔ اور قبلہ رُو محراب کی دیوار کے سوا جسے دو ستونوں کے درمیان کی جگہ کو بند کرکے بنایا گیا ہے۔ اس کی کوئی دیوار نہیں ہے۔ ابن عبدربہ نے لکھا ہے کہ یہ وہ گنبد ہے جس میں بنی اسرائیل کے عہد میں ایک زنجیر لٹکتی رہتی تھی۔ جو ان کے مابین کذب و صدق کا فیصلہ کرتی تھی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت جبریلؑ نے حضرت داؤدؑ کو لوہے کا ایک لٹھ دیا تھا کہ عدالت گاہ کے ایک طرف سے دوسری طرف لگا کر اس پر گھنٹہ لٹکا دیا جائے۔ مدعی اور مدعا علیہ اس کو باری باری ہاتھ لگاتے۔ جو سچا ہوتا اس کے ہاتھ لگانے سے گھنٹہ بجنے لگتا لیکن اکثر جغرافیہ نویسوں نے زنجیر ہی لکھا ہے اور یاقوت اس گنبد کے بیان میں رقم کرتا ہے کہ یہی جگہ تھی جس میں زنجیر لٹکتی تھی جو صرف سچ بولنے والے کے ہاتھ آتی تھی اور جھوٹی گواہی دینے والا اس وقت تک اسے چھو نہیں سکتا تھا جب تک کہ فریب سے باز نہ آئے اور گناہ سے توبہ نہ کرے۔"

روایات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اتنی بات طے شدہ اور تاریخی طور پر ثابت ہے کہ خلیفہ عبدالملک نے جب قبۃ الصخرہ تعمیر کروایا تو اس نے پہلے نمونہ کے طور پر ایک قبہ بنوایا تھا۔ اور اسی کو قبۃ السلسلہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ زیادہ پائیدار اور مستحکم نہ تھا۔ اس لیے زلزلوں سے متاثر اور بار بار تعمیر ہوتا رہا۔ صلیبی جنگوں سے قبل ایرانی سیاح ناصر خسرو اس عمارت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"یہ گنبد سنگِ مرمر کے آٹھ ستونوں اور چھ سنگی پایوں پر قائم ہے سمت قبلہ کے سوا جہاں پتھر چُن کر خوبصورت دیوار بنادی گئی ہے۔ ہر طرف سے ستون کھلے ہوئے ہیں۔"

اور لیبی ۱۱۰۸ء میں مسیحی بیانات کی بنا پر اسے کلیسا ئے "حضیرۃ القدس" قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ: اس کا طول و عرض نہایت متناسب اور قابلِ داد ہے۔ اس کے مغربی دروازے کے بالمقابل ایک قربان گاہ بنی ہوئی ہے جس پر بنی اسرائیل نذر و نیاز لاکر رکھا کرتے تھے۔ سینٹ وِلزبرگ کا مصنف ۱۲۲۵ء میں لکھتا ہے کہ میرے زمانے میں یہ عمارت کنیسائے سینٹ جیمس فورڈ کہلاتی تھی، کیونکہ وہ ولی جنھیں یہود نے ہیکل کے اوپر سے پھینک دیا تھا اسی مقام پر شہید ہوئے۔ صلاح الدین نے بیت المقدس پر قبضہ کے بعد اسے دوبارہ مسلمانوں کی خطبہ گاہ بنا دیا۔ جیسا کہ وہ پہلے کام دیتا تھا۔ مجیر الدین کا بیان ہے کہ:

قبۃ السلسلہ کو مصر کے سلطان بیبرس نے از سرِ نو بنوایا اور اس کا عہدِ حکومت ۱۲۶۰ء تا ۱۲۷۷ء ہے۔ اور یہ قبہ محراب کے دو ستون چھوڑ کر سترہ ستونوں پر قائم تھا۔ آج کل محراب کے ستون سمیت اس گنبد کے سترہ ستون ہیں۔

مجیر الدین یہ بھی لکھتا ہے کہ "خلیفہ عبد الملک نے اپنے معماروں کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کیسا اور کس طرح کا قبہ (صخرہ) تعمیر کرانا چاہتا ہے۔ اور جب خلیفہ خود بیت المقدس آیا۔ تو ان کاریگروں نے وہ چھوٹا گنبد بنایا جو قبۃ الصخرہ کے مشرق میں اب بھی موجود اور "قبۃ السلسلہ" کہلاتا ہے۔" ایک جگہ اس نے بتایا ہے کہ عبد الملک نے مصر کا ہفت سالہ خراج جو گنبد کی تعمیر کے لیے جمع کرایا تھا، اس گنبد میں رکھوا دیا۔ جو قبہ صخرہ کے مشرق میں بنا ہوا تھا۔ مجیر الدین کے دور میں محراب کے دو ستون چھوڑ کر وہ سترہ ستونوں پر قائم تھا۔ لیکن لی سٹرینج لکھتا ہے کہ ۱۴۹۶ء کے بعد اس میں ترمیم ہوئی اور آجکل محراب کے ستون سمیت اس گنبد کے کل سترہ ستون ہیں۔

چھوٹے گنبد

اوپر مقدسی کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ قبۃ الصخرہ اور قبۃ السلسلہ کے علاوہ اس

سفرِ معراج کی یادگار ہیں، چونکہ یہ عمارتیں زیادہ مستحکم نہ تھیں۔ اس لیے زلزلوں سے پیہم نقصان اٹھاتی رہیں، اسی لیے مختلف زمانوں میں ان کے ناموں میں گڑبڑ ہوتی۔

نویں صدی عیسوی میں ابن الفقیہہ کی روایت کے مطابق چبوترے کے شمالی حصہ میں قبۃ النبی (قبہ) مقام جبریل اور قبۃ المعراج تھے۔ اور ابن عبدربہ انھیں یوں بیان کرتا ہے:

۱۔ وہ گنبد جہاں سے حضور اقدسؐ آسمان پر تشریف لے گئے۔

۲۔ اس مقام کے اوپر کا گنبد جہاں حضورؐ نے انبیاء سابقین کے ہمراہ نماز ادا فرمائی اور

۳۔ معبد جبریلؑ۔

مقدسی ۹۸۵ء میں قبۃ المعراج اور قبۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اور ناصر خسرو ۱۰۴۷ء میں قبۃ النبی اور قبۃ الجبریل کا ذکر کرتا ہے۔ صخرہ کے شمال مغرب میں جو دو گنبد واقع تھے۔ ان میں سے بعید تر ابن الفقیہہ کے زمانے میں قبۃ النبی کہلاتا تھا۔ اور ابن عبدربہ کا بیان ہے۔ کہ شب معراج، انبیاء سابقین کے ساتھ حضورؐ نے یہیں نماز ادا فرمائی تھی۔ آجکل اس جگہ جو گنبد موجود ہے اسے قبۃ المعراج کہا جاتا ہے۔

اس قبۃ المعراج اور قبۃ الصخرہ کے درمیان آجکل "قبۃ الجبریل" ہے جسے ابن الفقیہہ قبۃ المعراج اور ابن عبدربہ "وہ گنبد جہاں سے حضورؐ آسمان پر تشریف لے گئے" بتاتا ہے مقدسی اسے قبۃ المعراج اور ناصر قبہ جبریلؑ لکھتا ہے لیکن ابن عبدربہ اور ابن الفقیہہ، مقامِ جبریل کے نام سے جس قبہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کا آجکل کوئی وجود نہیں۔ ان دونوں گنبدوں کا ذکر کرتے ہوئے ناصر خسرو صلیبی جنگوں سے قبل ۱۰۴۷ء میں لکھتا ہے:۔

"پھر چبوترے پر بھی ایک اور گنبد ہے، جو چار کھمبوں پر قائم ہے۔ اس میں قبلے کی طرف [illegible] کہ نہایت خوبصورت محراب بنائی گئی اسے قبہ جبریلؑ کہتے ہیں۔ اس میں قالین بچھے ہوئے تھیں۔ کیونکہ فرش سنگِ رخام کا بنا ہے۔ اور اسے رگڑ رگڑ کر چکنا کر دیا ہے۔ روایت ہے کہ شب معراج مرکب براق کو اس مقام پر باندھا گیا تھا۔ [illegible] ایک اور گنبد قبہ جبریلؑ سے کوئی بیس ہاتھ کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسے قبۃ الرسولؐ کہتے ہیں اسے بھی چار پیل پایوں پر بنایا گیا ہے۔"

"مجاہدین دیرہ نے اپنے قیام کے دوران [illegible] حرمین کی اور اصلاح اور

نے قبضہ کے بعد نہ صرف انھیں بحال کیا بلکہ قبۃ المعراج کو از سرِ نو تعمیر کرایا، لیکن یہ تھوڑے ہی دنوں بعد گر کر کھنڈر ہو گیا اور موجودہ قبۃ المعراج والی بیت المقدس عزالدین عثمان بن علی الزنجیلی نے ۵۹۶ھ (۱۲۰۰ء) میں دوبارہ تعمیر کیا۔ وہ جگہ جہاں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ملائکہ وانبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔ روایت کے مطابق قبۃ المعراج کے باہر ہے۔ آج کل یہاں ایک خوبصورت محراب قائم ہے۔ جہاں ادائیگی نماز کے بعد رسول اللہ نے آگے قدم بڑھایا۔ اور آپ کے لیے سونے چاندی کا زینہ نصب کر دیا گیا۔ جس کے ذریعے آپ آسمان پر چڑھے" ـــــ یہ روایت سیوطی کی ہے۔ وہ قبۃ السلسلہ کو قبۃ الرسول قرار دیتا ہے۔ اور باب شرف الانبیاء کے قریب احاطہ حرم میں جو گنبد واقع ہے اور گنبدِ سلیمان کہلاتا ہے، اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہاں سلیمان سے مراد حضرت سلیمان نہیں بلکہ خلیفہ عبدالملک کا بیٹا سلیمان ہے۔ جس نے یہ گنبد بنوایا تھا۔

۱۹۲۰ء میں پٹیری لکھتا ہے کہ چبوترے کے باہر شمال مغربی کونہ میں سیڑھیوں کے اوپر قبۃ الخضر اور اس سے آگے قبۃ الارواح۔ اس کے جنوب میں قبۃ الرسول اور قبۃ الجبریل ہیں۔ قبۃ الصخریٰ کے جنوب میں کوئی گنبد نہیں۔

ـــــ ٭ ـــــ

باب ہشتم

حرم شریف میں دیگر زیارتیں

مہدِ مسیحؑ

احاطۂ حرم کے جنوب مشرقی گوشے میں قدیم آثار پر ایک چھوٹی سی زمین دوز مسجد (۲۰ گز × ۵ ۴۵ گز) "مہدِ مسیحؑ" کے نام سے مشہور ہے۔ ابن عبدربہ نے "محراب مریم بنت عمران" اور مقدسی نے "محراب مریم و زکریاؑ" کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے۔ محراب مریم میں فرشتے حضرت مریم کے واسطے گرمیوں میں سردی کے اور سردی میں گرمیوں کے پھل لایا کرتے تھے۔ محرابِ زکریا، اس کے ساتھ ہی ہے۔ جہاں فرشتوں نے انھیں ولادتِ حضرت یحییٰؑ کی بشارت دی جبکہ وہ نماز میں کھڑے تھے۔ مہدِ مسیح میں زمانۂ قدیم سے حضرت مسیحؑ کا پنگھوڑا رکھا ہے۔ یہ پنگوڑا پتھر کا اور اتنا وسیع ہے کہ ایک آدمی اس میں نماز پڑھ سکتا ہے۔ یہ پنگوڑا زمین میں گڑا ہوا ہے۔ حضرت مسیحؑ اسی میں لٹائے گئے اور انھوں نے شیر خوارگی میں لوگوں سے گفتگو فرمائی۔ اسی پنگوڑا کو مسجد کی محراب بنا دیا گیا ہے۔ محراب مریم اور محرابِ زکریا اس کے مشرقی پہلو میں ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ اسی جگہ پیدا ہوئے تھے۔ ایک ستون پر انگلیوں کے نشان ہیں، جس کے بارے میں لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت مریمؑ نے دردِ زہ کی شدت میں اس پتھر کو زور سے پکڑا تھا۔ اور یہ انہی کی انگلیوں کے نشان ہیں، ناصر خسرو کے الفاظ میں "اس میں چاندی اور پیتل کے بہت سے فانوس لٹکے ہوئے ہیں، جنہیں ہر رات روشن کیا جاتا ہے۔"

صلیبیوں نے اپنے دَور میں حرم شریف کے اندر زمین دوز مقامات سے اصطبل کا کام لیا۔ اس لیے لاطینی وقائع نویس اور علی ہروی اس کا ذکر اصطبل سلیمان کے طور پر کرتے ہیں۔ آجکل "اصطبلِ سلیمان" مہدِ عیسیٰ کے مغرب میں ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک دروازہ کھلتا ہے۔ صلیبیوں کے قبضہ سے قبل حرم شریف کے شمالی پہلو

میں واقع محراب داؤد ختم ہو گئی۔ البتہ اس کے قریب کرسی سلیمان، جو قدِ آدم بلند چٹان ہے باقی رہی۔ لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت سلیمان ہیکل کی تعمیر کے زمانے میں اسی پر نشست فرماتے تھے۔ سیوطی لکھتا ہے کہ ایک روایت کے مطابق ہیکل کی تکمیل کے بعد حضرت سلیمان نے اس مقام پر تین ہزار بچھیاں اور سات ہزار بھیڑیں قربان کیں۔

سیوطی محراب داؤد کے بارے میں لکھتا ہے کہ محراب داؤد قلعۂ بیت المقدس کے اندر ہے۔ مگر جب وہ حرم میں تشریف لاتے تو محراب کلاں (مسجد اقصےٰ کے منبر کے برابر) میں نماز ادا کرتے اور حضرت عمرؓ نے حضرت داؤدؑ کی پیروی میں یہاں نماز ادا کی، اس روز سے یہ محراب عمرؓ مشہور ہو گئی۔

منبر داؤدؑ (جسے مجیر الدین قبۂ سلیمان کہتا ہے) حرم شریف کی جنوبی دیوار میں فرابستہ محراب ہے، اور باب العتم کے سامنے، اور اس دروازے کے قریب ہی جنوب مغرب میں واقع ہے۔ ناصر خسرو نے حرم شریف کے شمالی حصہ میں منبر داؤد کے علاوہ دو اور گنبدوں (۱) قبۂ یعقوبؑ اور (۲) محراب زکریا کا ذکر کیا ہے۔ اور لی سٹرینج کہتا ہے کہ قبۂ یعقوب سے غالباً وہ گنبد مراد ہے، جو آجکل قبۂ سلیمان کہلاتا ہے اور محراب زکریا کا کوئی اثر آثار باقی نہیں۔

مجیر الدین لکھتا ہے کہ باب السلسلہ کے مقابل قبۂ موسیٰ بنا ہوا ہے لیکن اس کو حضرت موسیٰ سے کوئی نسبت نہیں۔ ۶۴۹ھ (۱۲۵۱ء) میں ازسرِ نو تعمیر ہوا اور اس سے پہلے قبۃ الشجرہ کہلاتا تھا۔ قبۃ الطومار جنوب مشرقی کونے پر چبوترے کے کنارے بنا ہوا تھا۔ مجیر الدین کے الفاظ میں حرم شریف کے چاروں مینار اسی مقام پر قائم ہیں۔ جہاں عبدالملک کے زمانے میں تھے۔ پہلا حرم شریف کے جنوب مغربی گوشے میں، دوسرا باب السلسلہ کے شمال میں، تیسرا شمال مغربی زاویہ میں ماذنۃ الغوانمہ (۱۲۹۸ء میں ازسرِ نو تعمیر ہوا) اور چوتھا باب الاسباط اور باب الحطہ کے درمیان، جو ۱۳۶۷ء میں نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔

صلیبی جنگوں سے قبل کے مصنفوں نے بعض ایسے مقامات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جو آج موجود نہیں ہیں۔ اور اس کی وجہ غالباً وہ تبدیلیاں ہیں جو صلیبیوں نے کیں۔ ناصر خسرو نے حرم شریف کے شمال مغربی گوشے میں ایک محراب زکریاؑ کا ذکر کیا ہے۔ جس کا آج نشان نہیں ملتا۔ اسی طرح ابن الفقیہ کا کہف ابراہیمؑ اور ابن عبدربہ کا مینار ابراہیم معدوم

ہے۔ مقدسی، مقام النساء، مقام النار، مقام کعبہ اور محراب یعقوب کا ذکر کرتا ہے ناصر خسرو گنبد یعقوب کی کیفیت لکھتا ہے۔ جو شمالی حصہ میں تھا۔ لیکن ان سب کے آثار نہیں ملتے۔

سیدنا سلیمانؑ کا مُصلّٰی یا کرسی

باب حطہ میں داخل ہو کر داہنی طرف مسجد کے شمالی دروازہ شرف الانبیاء پر نگاہ پڑتی ہے۔ باب حطہ اور اس باب کے درمیان چار ستونوں پر یہ قبلہ قائم ہے۔ جس میں قبلہ رو محراب بنی ہوئی ہے اسے سیدنا سلیمان کا مُصلّٰی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان معبد کی تعمیر کے وقت یہیں بیٹھ کر فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔

روضہ سیدنا سلیمانؑ

یہ روضہ حرم شریف میں مسجد صخرہ کے جانب مشرق تین سو قدم کے فاصلے پر بیرونی دیوار کے متصل ایک مقفل کمرے میں واقع ہے۔ کمرے کے دونوں جانب جالی دار کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں۔ جن سے قبر دیکھی جا سکتی ہے۔ قبر کی لمبائی سات گز ہو گی۔ قبر شمالاً جنوباً ہے اور کمرے کے متصل حبس سلیمانؑ (جیل خانہ) ہے۔ جہاں شریر جنات کو قید و بند رکھا جاتا تھا۔ اصطبل یہاں سے ذرا فاصلے پر ہے۔

دیوارِ براق

وہ جگہ ہے، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات بُراق یہاں باندھا تھا۔ اس کے علاوہ حرم میں عورتوں کے لیے ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہے۔ جس میں ظہر، عصر اور مغرب کی نماز ایک اندھا امام عورتوں کو پڑھاتا ہے۔

مزار مولانا محمد علیؒ جوہر

مولانا محمد علی جوہر کا مزار مسجد صخرہ کے بالمقابل جانب مغرب ایک بند کمرے میں ہے۔ کتبہ پر عربی عبارت لکھی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

"اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کی جان و مال کے صدقے جنت دے گا یہ مجاہد عظیم مولانا محمد علی ہندی کی قبر ہے (اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت میں جگہ دے)"

پندرہ شعبان کو لندن میں وفات پائی اور جمعہ کے دن پانچ رمضان ۱۳۴۹ھ کو قدس میں دفن کیے گئے[۱]

دیوارِ گریہ

حرم شریف کی مغربی دیوار میں پچاس فٹ کے ایک ٹکڑے کے بارے میں یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ ہیکل سلیمانی کے باقیات میں سے ہے۔ چنانچہ اس مقام پر آتے اور گریہ و بُکا کرتے ہیں اور اسی نسبت سے اس کا نام دیوارِ گریہ پڑ گیا[۲] اس مقام کو مسلمان البراق کہتے ہیں۔ کیونکہ شب معراج سرورِ کائنات[۳] اسی جگہ براق سے اُترے اور براق کو باندھا اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس جگہ کی نشان دہی کرنے کے لیے یہاں ایک گول کڑا لگا ہوا ہے۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب حضرت عمرؓ بیت المقدس میں داخل ہوئے دیوارِ گریہ کا کوئی وجود نہ تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے معبد کو تباہ ہوئے صدیاں بیت چکی تھیں اور ہیرودس نے اس کی جگہ جو عمارت تعمیر کرائی تھی اسے بھی ۷۰ء میں طیطس رومی مکمل طور پر تباہ کر چکا تھا۔ اور اس کے جو آثار باقی رہ گئے تھے، اسے ملکہ ہیلنا نے مٹا دیا۔ خلیفہ عبدالملک نے قبۃ الصخرہ اور خلیفہ ولید نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کرائی۔ حرم شریف کی موجودہ چاردیواری تو کاں عثمانی کے دور میں تعمیر ہوئی۔ جو بعض قدیم آثار پر اٹھائی گئی تھی۔ سر رابرٹ ونڈرھم اپنی کتاب "مشرق قریب میں طوفانی مرکز" میں لکھتا ہے کہ فتح بیت المقدس کے بعد جب سلطان سلیم اول مسجد اقصیٰ کی زیارت کے لیے آیا تو اس نے مسجد کے نواح ہی میں قیام کیا۔ ایک صبح اس نے اس مقام پر جہاں آج کل دیوارِ گریہ ہے۔ ایک عیسائی خاتون کو غلاظت پھینکتے دیکھا۔ اور اس کی طبیعت پر مسجد کے قریب یہ ڈھیر گراں گزرا۔ دریافت حال پر معلوم ہوا کہ عیسائی، اکثر کوڑا کرکٹ اسی مقام پر ڈالتے ہیں اس پر سلطان سلیم نے مسجد کے قریب کوڑا کرکٹ پھینکنے کی کُلّی ممانعت کر دی۔ اور سلیمان اعظم کے دور میں شہر[۱] کی فصیل کے ساتھ حرم شریف کی چاردیواری بھی ۱۵۴۲ء میں مکمل ہوئی۔

مزید برآں تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ شاہ ہیڈرین نے ۱۳۵ء میں یہودیوں کو بیت المقدس

۱۴۱۰ء میں وہ عیسائی حکمرانوں سے یہ اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ نواحی
پہاڑیوں سے بیت المقدس کو دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ جب فاتح بن کر آئے اور عیسائیوں
سے جو معاہدہ صلح ہوا۔ اس میں عیسائیوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو پابند کیا تھا کہ یہودی
ان کے ساتھ شہر میں آباد نہیں ہوسکیں گے۔ گو بعد کے حالات میں اس معاہدہ پر بہت کم
پابندی ہوسکی، مگر اس کے باوجود شہر بیت المقدس میں یہودی کبھی آباد نہیں ہوئے البتہ
جب تحریک صیہون شروع ہوئی تو انھیں ہیکل کا خیال آیا اور صیہونی رہنماؤں نے انھیں
دیوارِ گریہ کی زیارت کے لیے [illegible] اور یہ انیسویں صدی کی بات ہے۔ جب یہودی
ربیوں نے ترکوں سے درخواست کی کہ ان کا مذہب انھیں حرم کے باہر گریہ وزاری کا
حکم دیتا ہے۔ فراخ دل ترکوں نے ان کے "مذہبی احساسات" کا احترام کرتے ہوئے
انھیں مغربی دیوار کے باہر اس کی اجازت دے دی لیکن حکم ہوا کہ وہ دیوار سے تیس فٹ
پیچھے رہیں۔ یہ اجازت حاصل کرنے کے لیے بھی یہودیوں نے انتہائی مکروفریب سے کام
لیا اور طویل جدوجہد کی۔ یہ اجازت انھیں کب ملی؟ تاریخ اس بارے میں قطعاً خاموش ہے۔
البتہ اتنا بتاتی ہے کہ انیسویں صدی تک مقدس مقامات کے خادموں اور سربراہوں کے
سوا کسی غیر مسلم کو شہر کی فصیل کے اندر قیام کی اجازت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ کوئی سفارتی نمائندہ
بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ البتہ سال کے ایک مقررہ وقت میں سیاحوں اور زائرین کو اندر جانے
کی اجازت دے دی جاتی۔ مگر انیسویں صدی کے اوائل میں اولاً سپین اور بعد ازاں وسطی
اور مشرقی یورپ کے یہودی مہاجرین کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ جو انتہائی بے بسی
اور افسوس کی حالت میں یہاں پہنچے اور اپنے یہودی رشتہ داروں کی خیرات پر گزارہ کرتے لیکن
۱۸۳۱ء میں جب فلسطین اور شام پر حاکم مصر قابض ہوگیا۔ تو قدیم بیت المقدس کی ہیئت
میں تبدیلی کی رفتار کسی قدر تیز ہوگئی۔ ملک میں ابتری پھیل گئی اور فلسطین کے دروازے
یہودی تاجروں، مشنریوں اور سیاحوں پر وا ہوگئے۔ مصری انتظامیہ نے یہودیوں اور
عیسائیوں کے بارے خاصی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا، اور بیت المقدس میں پہلا برطانوی
قونصلیٹ قائم ہوا جس کا ایک حق "یہودیوں کی نگرانی و حفاظت" تھا۔ برطانیہ نے یہودیوں
کو عیسائی بنانے کے لیے ایک مخصوص بشپ کا تقرر کیا اور مصری انتظامیہ پر زبردست
دباؤ ڈال کر شہر میں نئے پروٹسٹنٹ چرچ کی تعمیر کی اجازت حاصل کرلی۔ یہ عہد اسلامی

میں غیر مسلموں کا پہلا نیا معبد تھا جو شہر کے اندر تعمیر ہوا۔ مصر کے دورِ اقتدار میں بیت المقدس میں یہودیوں کے دو گروہ تھے، جو ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ سفاردم، جن کی اکثریت سپین سے آنے والوں پر مشتمل تھی، جو عثمانی مملکت کی رعایا تھے۔ جنہوں نے انتہائی محتاط انداز اور عیاری سے متصلہ عمارتوں کو چار کنیسوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن ان کی چھت ایک ہی تھی۔ ترک حکام نے ان کی نمائندگی کے لیے ایک ربی کو تسلیم کر لیا تھا جسے بعد ازاں چیف ربی بنا دیا گیا، دوسرا گروہ اشکنازیوں کا تھا۔ جو حال ہی میں پروشیا، آسٹریا، پولینڈ اور روس سے آئے تھے۔ اور جن کی حفاظت و نگرانی برطانوی قونصلیٹ کے ذمہ تھی۔ انھوں نے چونکہ اپنی غیر ملکی شہریت برقرار رکھی۔ اس لیے وہ عثمانی قوانین سے مستثنیٰ تھے۔ انھوں نے غیر ملکی تحفظ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر میں نئے کنیسے کی تعمیر اور مقدس مسلم جائداد پر قبضہ کرنے اور خرید زمین کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ عثمانی قوانین کے تحت کسی غیر ملکی کو فلسطین میں جائیداد خریدنے کا کوئی حق نہ تھا۔ اور مصری انتظامیہ نے عثمانیوں سے بغاوت کے باوجود ان قوانین کو نہیں بدلا تھا۔ اس لیے علی پاشا کو انھیں اجازت دینے سے انکار میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ البتہ جیسا کہ مسجد اقصیٰ کے ضمن میں آچکا ہے۔ انھوں نے برطانوی قونصلیٹ کی وساطت سے مصری کمانڈر ابراہیم پاشا کو مقام گریہ کو پختہ کرنے کی اجازت پر رضامند کر لیا تھا لیکن شہر کی مشاورتی کونسل اور شیخ المغاربہ کی مخالفت نے ان کا یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ باب المغاربہ کے باہر کی زمین جس میں مقام گریہ کی جگہ بھی شامل تھی۔ سلطان صلاح الدین کے بیٹے الافضل نے مسلم اوقاف قرار دے دیا تھا۔ جو بالآخر شمالی افریقہ کے زائرین، علماء اور صوفیا کے لیے وقف ہو گیا تھا۔ ۱۳۰۳ء میں اس جگہ زائرین کے لیے ایک زاویہ تعمیر ہوا۔ بعد ازاں ۱۳۲۰ میں شعیب ابومدین مغربی نے اس وقف میں شمالی و مغربی افریقہ کے زائرین اور طلباء کے زاویہ اور رہائشی مکانات تعمیر کئے۔ افریقی مسلمانوں کی مسجد اقصیٰ سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ سلطان مراکش علی ابن عثمان المرینی نے ۱۳۵۲ء میں اپنا کتابت کردہ قرآن مجید مسجد اقصیٰ کے لیے بھجوایا۔ اور ۱۶۳۰ء میں الومدین کی نگرانی میں باب المغاربہ کے باہر کی تمام زمین از سرنو ایک مسلم وقف کی حیثیت سے رجسٹر کرائی گئی۔ اس طرح ۱۸۳۹ء میں جب انھیں یہودی

عیاری کا سامنا کرنا پڑا۔ شمالی افریقہ کے مسلمان اس زمین پر تہرا استحقاق رکھتے تھے زاویہ ابو مدین کے شیخ نے افریقی مسلمانوں کی طرف سے لکھا۔ کہ ان کے مقبوضات دیوارِ حرم سے متصل ہیں اور یہی وہی دیوارِ حرم ہے جہاں سرورِ کائنات ؐ شب معراج کی رات براق سے اترے اور جہاں براق کو باندھا گیا۔ اس نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ یہود کو بلا جواز ان علاقہ میں دخل کا حق دیا گیا لیکن یہ اجازت اس سے مشروط تھی کہ وہ کوئی شور نہیں کریں گے اس میں شک نہیں کہ پچھلے چند سالوں سے ان کی تعداد میں قدرے اضافہ ہو گیا ہے اور وہ اپنی آواز کو ایسے بلند کرتے ہیں۔ جیسے کنیسا میں ہوں۔ لیکن اس کے باوجود انھیں مقام گریہ کو پختہ کرنے یا اس تک پختہ سڑک بنانے کی اجازت نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ" ان کے کسی انتہائی مقصد کی ابتدا ہے" مشاورتی کونسل نے اس بیان میں یہ اضافہ کیا۔ کہ مقام گریہ زاویہ کے ساتھ ساتھ ایک تنگ گلی ہے۔ یہ گلی اور نواحی مکانات ابو مدین کے وقف میں شامل ہیں۔ یہ معاملہ بالآخر محمد علی پاشا کے سامنے پیش ہوا اس نے ۲۶ مئی ۱۸۴۰ء مطابق ۲۴ ربیع الاول ۱۲۵۶ھ کو گورنر بیت المقدس کو لکھا کہ:

"مشاورتی کونسل کی رپورٹ سے واضح ہے کہ یہود جس جگہ کو پختہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ حرم شریف سے متصل اور وہ جگہ ہے جہاں سرورِ کائنات ؐ کے براق کو باندھا گیا۔ اس کے علاوہ وہ ابو مدین ؒ کا وقف ہے۔ نیز اس سے قبل یہود نے کبھی اس جگہ کی مرمت نہیں کی۔ مزید براں شرع اسلامی کے تحت بھی ان کی درخواست قابلِ قبول نہیں، اس لیے یہود کو اس جگہ کو پختہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ انھیں اس جگہ شور مچانے یا اپنی آوازیں بلند کرنے پر بھی سرزنش کی جائے اور واضح کر دیا جائے کہ انھیں صرف اس جگہ کی زیارت کی اجازت ہے۔"

یہ دیوارِ گریہ پر یہود کی حاضری کا پہلا مستند تذکرہ ہے کہ انھیں کسی مسلم مقدس مقام کی عقیدت کے طور سے زیارت کی اجازت دی گئی۔ جہاں تک انیسویں صدی کے باقی سالوں کا تعلق ہے۔ اس میں تارکینِ وطن یہود نے دو مرتبہ شاہی حکم سے فائدہ اٹھایا۔ ۱۸۵۴ء میں انھوں نے برطانوی قونصلیٹ کی مدد سے ایک تباہ شدہ عمارت کی تعمیر کی اجازت حاصل کی یہ پہلا موقع تھا، حالانکہ کسی قدیم

مسیحی، یہودی یا اسلامی مصنف نے اس مقام پر کسی "معبد" کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے جو دستاویزات پیش کیں وہ جعلی تھیں اور ان کی زبان بجائے خود مشکوک تھی لیکن برطانوی سفیر نے اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کرکے یہود کو "قدیم معبد" کی تعمیر نو کی اجازت دلوا دی۔ اور یوں شہر قدس میں یہود کے دو معبد بن گئے۔

اس وقت یہود کی تعداد کتنی تھی۔ اس کے بارے میں ترک ریکارڈ خاموش ہے کیونکہ خود یہود نے ممتاز یہودی مصنف سر موسس مونٹی فوری کے مطابق (١٨٤٩ء) مردم شماری سے گریز کیا۔ البتہ برطانوی قونصل نے ١٨٤٠ء میں ان کا اندازہ تین ہزار بتایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک یہود کی فلسطین میں آمد انتہائی بے کسی کے عالم میں تھی۔ صرف معمر یہودی اپنی زندگی کے آخری دن سرزمین موعود میں گزارنے کے لیے آتے تھے لیکن ١٨٨١ء میں جب روس سے یہودیوں کا انخلاء شروع ہوا، یہود کی آمد نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ آخر اپنی تمام فراخ دلی اور انسانیت کے باوجود عثمانی خلافت کو ١٨٨٨ء میں ایک حکم جاری کرنا پڑا۔ جس کے تحت یورپی یہودیوں کی فلسطین میں آبادکاری اور زمین حاصل کرنے پر پابندی لگانا پڑی۔ لیکن ناقص انتظامیہ کی وجہ سے بیرونی یہود کی آمد اور فلسطین و بیت المقدس میں جائیداد کی خریداری اور آبادکاری بدستور جاری رہی۔ حتیٰ کہ دس سال کے مختصر عرصہ میں یہود نے بیت المقدس میں سخت معاشی بحران پیدا کر دیا۔ جس سے مسلمان بری طرح متاثر ہوئے۔ مسلمانوں نے ١٨٩٠ء میں وزیر اعظم سے زبردست احتجاج کیا۔ اس کے باوجود آئندہ بیس سال میں کوئی مؤثر کارروائی نہ ہوئی اور اس کا ثبوت ایوانِ نائبین کی کارروائی سے ملتا ہے۔ جہاں ١٩١١ء میں "صیہونیت کے طوفان" پر شدید بحث ہوئی۔

١٩١١ء بیت المقدس کی تاریخ میں اس لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ یہود نے دیوارِ گریہ کی زیارت کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو جانے والے راستہ پر قبضہ جمانے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا اور وہ مقام گریہ پر کرسیاں سا تھ لے جانے لگے۔ اس پر ابو مدین وقف کے نگران نے احتجاج کیا لیکن ترک حکام کی ممانعت کے باوجود یہود کی روش میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ آخر حکومت کو ١٨٤٠ء کی طرح کا ایک نیا حکم نامہ جاری کرنا پڑا [illegible] نے بیت المقدس کے [illegible]

کو حسب ذیل مسودہ برائے حکم پیش کیا۔
شعیب ابومدین (خدا اس کی یاد ہمیشہ باقی رکھے) کے وقف کے نگران نے شکایت کی ہے کہ یہود، جو حرم الشریف کی دیوار البراق کے مغربی حصّہ کی زیارت کے عادی ہیں بشرطیکہ وہ زیارت کے دوران کھڑے رہیں، انھوں نے اب اس روایت کے برعکس زیارت کے دوران بیٹھنے کے لیے کرسیاں لانا شروع کر دی ہیں۔ چونکہ یہ جگہ اس وقف کی ملکیت اور بنا گلی ہے، اس لیے نگران نے درخواست کی ہے کہ یہود کو اس سے روکا جائے۔ کہیں وہ مستقبل میں اس پر ملکیت کا دعویٰ نہ جتا دیں ——— نگران کی اس درخواست پر قابلِ احترام مفتیٔ اعظم، مذہبی اوقاف کے محکمہ اور دینی عالموں نے غور کیا ہے۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جگہ ان رہائشی مکانات سے متعلق ہے جو مسجد الاقصیٰ سے متصل مغربی جانب ہیں۔ یہ ایک بند کوچہ ہے جو کہ ابو مدین وقف کی ملکیت ہے اور اسلامی قوانین کے تحت اس جگہ یہود کا کرسیاں رکھنا، پردے لگانا یا کوئی ایسی شئے لانا یا کوئی ایسی ایجاد کرنا، جو بالآخر اقصیٰ کی مبارک مسجد کی دیوار پر ملکیت کا باعث بنے، غیر قانونی ہے۔ اس لیے یہود کو ان اختراعات سے روکنے کے لیے مناسب اقدام کیے جائیں۔
انتظامی کونسل نے تفصیلی غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ کسی ایسی شئے کو اس جگہ رکھنے کی اجازت نہ دی جائے، جو اس جگہ یا مسجد اقصیٰ کی دیوار پر ملکیت کا حق جتانے کا باعث بنے۔ لہٰذا حکم دیا جاتا ہے کہ اس قسم کی اختراع کا کوئی موقعہ نہ دیا جائے۔ بلکہ قدیم روایت ہی کو برقرار رکھا جائے۔"
پہلی جنگِ عظیم کے آغاز میں جو فلسطین پر مسلمانوں کے صدیوں پرانے دورِ حکومت کے خاتمہ اور برطانوی قبضہ کا باعث بنی۔ یہ پوزیشن تھی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں صورتِ حال بالکل بدل گئی، عرب ترکوں سے باغی ہو گئے۔ اور برطانیہ نے انھیں "آزادی" کا کچھ ایسا فریب دیا کہ بیت المقدس میں ترک کمانڈر جمال پاشا کی ہر اپیل بے کار ثابت ہوئی، جو اس نے اس شہر مقدس کو عیسائی قبضہ سے بچانے کے لیے تمام مسلمانوں سے مشترکہ دفاع

کے بیٹے کی۔ جنرل ایلن بی شہر میں داخل ہو گیا اور اس نے اعلان کیا کہ:

"تینوں مذاہب کی ہر مقدس عمارت، یادگار اور عبادت کی روایتی جگہ کو خواہ وہ کسی صورت میں بھی ہو۔ اس مذہب کے پیروکاروں کے موجودہ عقائد کے مطابق برقرار رکھا جائے گا۔" لیکن نصف فلسطین پہ ابھی ترک قابض تھے۔ اور برطانیہ کی قطعی فتح میں ایک سال باقی تھا کہ صیہونیوں نے اس اعلان کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ اور ۳۰ مارچ ۱۹۱۸ء کو برطانوی فوج کی دو یہودی بٹالینوں کا جو پہلا دستہ شہر میں داخل ہوا اس نے دیوارِ گریہ پر نہ صرف اجتماعی طور پر آہ و بکا کیا۔ بلکہ شور و ہنگامہ مچایا۔ اور دس دن بعد ویزمین کے صیہونی کمیشن نے اس حرکت کو دہرایا۔ صیہونی کمیشن کی آمد نے مسلمانوں اور عربوں میں سخت خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا ایک طرف مصر کے حاکم نے برطانوی حکام کو مسلمانوں کے خوف سے آگاہ کیا تو دوسری طرف لبنان کے مسیحی عرب مصنف ڈاکٹر فارس نمر نے کمیشن کے برطانوی رابطہ افسر کو عیسائیوں کے خوف و ہراس سے باخبر کیا۔ مگر انھیں "یہود دشمن" پراپیگنڈہ کا اثر قرار دے کر نظر انداز کر دیا گیا۔ آخر ۳۰ مئی ۱۹۱۸ء کو خود ویزمین نے لارڈ بالفور کے نام اپنے خط میں اس کا انکشاف کر دیا۔ اس نے لکھا:

> "دیوارِ گریہ فوراً حوالے کر دی جائے۔ فلسطین میں یوں تو ہمارے کئی مقدس مقامات ہیں لیکن دیوار گریہ ہمارے قدیم ہیکل کا حصہ ہے۔ جس سے ہمارا کچھ تعلق اب تک باقی ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام مقامات عیسائیوں اور مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔ اس کے گرد بھی انتہائی غیر صحت مندانہ ماحول ہے۔ جو یہود کے لیے ذلت و ندامت کا باعث ہے ہمارے مقدس ترین شہر میں ہماری مقدس ترین یادگار ایک مشکوک مغربی مذہبی فرقہ کے تصرف میں ہے۔ ہم اسے اس کے معاوضہ میں گرانقدر رقم دینے کے لیے تیار ہیں۔ کیونکہ ہم اس جگہ کو صاف ستھری، باوقار اور قابلِ احترام بنانا چاہتے ہیں۔"

اس پر بیت المقدس کے فوجی گورنر رونالڈ سٹورس نے انتہائی محتاط انداز سے مغربی دیوار سے متصل مکانات کی خریداری کے لیے مفتیٔ اعظم کامل الحسینی سے رابطہ پیدا کیا۔ لیکن اُن کا جواب صرف ایک ہی تھا۔ کہ کسی مسلم اوقاف کی کوئی جگہ کسی بھی قیمت

پر فروخت نہیں کی جا سکتی۔ خواہ خریدار مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ سٹورس نے ترغیب و تحریص کے تمام ہتھکنڈے آزمائے۔ مگر لاحاصل ـــــ یہود نے براہِ راست تحریک کی اور ایک مراکشی یہودی کو گراں قدر رقم کی پیشکش کے ساتھ ابو مدین وقف کے شیخ کے پاس بھیجا۔ لیکن اس پر مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ مظاہروں کے علاوہ مسلمانوں نے رونالڈ سٹورس کو دو تحریری احتجاج پیش کیے۔ ایک احتجاج پر عارف پاشا دجانی اور شہر کے چودہ ممتاز خاندانوں کی اہم شخصیتوں نے دستخط کیے تھے، اس میں ایلن بی کے اعلان کا حوالہ دیتے ہوئے اس تحریک کو "نامناسب" قرار دیا گیا تھا۔ دوسرا احتجاج شہر کی تین تعلیمی سوسائیٹیوں کی طرف سے تھا، جنھیں فوجی حکام نے تسلیم کر رکھا تھا۔ اس میں ایلن بی کے اعلان کا حوالہ دینے کے علاوہ انتباہ کیا گیا تھا کہ

"مسلمان اس قدر مقدس مقام کو کسی بھی قیمت پر فروخت کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

اس پر یہ مسئلہ ایلن بی کے سیاسی مشیر نے اس انتباہ کے ساتھ بالفور کو واپس بھجوا دیا۔ کہ اس پر "عمل کا نتیجہ خطرناک ہوگا" لیکن یہود اپنے منصوبہ کو مکمل کرنا چاہتے تھے۔ اعلان بالفور کی پہلی سالگرہ پر انھوں نے بیت المقدس میں مظاہرہ کیا اور دیوارِ گریہ پر قبضہ کرنا چاہا۔ اس کے علاوہ فلسطین میں دو یہودی بٹالینوں کا رویہ دیوارِ گریہ کی زیارت کے وقت اس قدر قابلِ اعتراض ہوتا تھا۔ کہ فوجی حکام کو ان کے شہر میں داخلہ پر پابندی لگانا پڑی لیکن ایک افسر نے اپنے جوانوں سمیت اس حکم کی خلاف ورزی کی اور انھیں مارچ کراتے ہوئے دیوارِ گریہ تک لے گیا۔ اس پر ان سب کا کورٹ مارشل ہوا۔ ۵۸ افراد کو قید کی سزا دی گئی اور صیہونی دستوں کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔

اپریل ۱۹۲۰ء میں مسلمانوں اور یہودیوں میں پہلا تصادم ہوا۔ جب یہود نے بزور مسجد اقصیٰ کے اس حصہ پر قبضہ کی کوشش کی۔ چند دن بعد مفتیِ اعظم پر فائرنگ کی گئی۔ برطانوی فوجی منتظم کو یقین تھا۔ کہ مجرم کالعدم صیہونی دستہ کے رکن ہیں۔ اس لیے اس نے صیہونی ایجنسی سے مجرموں کی گرفتاری کے لیے تعاون مانگا۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اپریل کے اواخر میں جب فلسطین کا انتداب برطانیہ کے حوالے ہوا ــــ اور برطانیہ نے ایک صیہونی سر ہربرٹ سیموئیل کو اپنا پہلا ہائی کمشنر مقرر کیا۔ تو عربوں میں اضطراب، اور یہود

میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ فوجی گورنر نے وزارتِ خارجہ کو اس غیر معمولی صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ لیکن برطانوی حکومت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ۱۶ مئی کو اسے ویزہ ملین کے نائب کی طرف سے خط موصول ہوا کہ

"دیوارِ گریہ دنیا بھر کے یہود کی ملکیت ہے"

۳ مئی کو چیف ربی نے اسے لکھا:

"دیوارِ گریہ دیکھ بھال اور انتظام کے لیے یہودی نمائندوں کے حوالے کر دی جائے۔"

یہ برطانوی انتداب کا انتہائی ناخوش گوار آغاز تھا کہ جب ایک معمولی اقلیت، جو آبادی کا بمشکل آٹھ فیصد تھی، برطانوی سنگینوں کے سہارے سے عرب اکثریت پر تسلط حاصل کرنے کی خواہاں تھی۔ اور بعد کے سالوں میں انھوں نے "البراق" پر اپنا حق جتانے کیلئے کرسیاں، بنچ اور پردے لانے کی رفتار تیز تر کر دی۔ ابو مدین وقف کے سرپرست نے بار بار مفتی بیت المقدس سے شکایت کی جنھوں نے اسے برطانوی حکومت تک پہنچایا۔ جس نے ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۸ء میں دو اہم موقعوں پر اس قسم کی اشیاء لانے کی ممانعت کے لیے احکامات جاری کیے۔ اور آخر ۱۹۲۸ء میں پولیس کو حکم دیا کہ اگر یہود خلاف ورزی سے باز نہ آئیں تو ان اشیاء کو جبراً ہٹا دیا جائے۔ اس پر یہودیوں اور صیہونیوں نے ہنگامہ مچا دیا۔ اور اس حکم کو "مذہبی معاملات میں مداخلت" قرار دیا۔ اس طرح صیہونی سیاست بروئے کار آنے لگی۔ اس سے قبل یہ رسم کتنی مذہبی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ۱۹۰۱ء میں جو یہودی انسائیکلوپیڈیا شائع ہوا۔ اس میں دیوار کا عبرانی یا کسی اور نام سے قطعاً کوئی تذکرہ نہیں، البتہ ۱۹۳۹ء میں جو انسائیکلوپیڈیا شائع ہوا۔ اس میں "دیوارِ گریہ" کے نام سے ذکر ہے اور عبرانی نام متن میں دیا گیا ہے۔

دیوارِ گریہ کے نواح کی زمین پر یہودیوں کے تصرف کی خواہش نے مسلمانوں میں جو خوف پیدا کر دیا تھا۔ اس کے پیشِ نظر مفتیٔ اعظم نے حکومتِ فلسطین کو یہودیوں کے پروپیگنڈہ کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا۔ کہ یہودیوں کا یہ پروپیگنڈہ "برطانیہ" اور دوسری حکومتوں کے علاوہ مجلسِ اقوام کو متاثر کرنے کے لیے ہے تاکہ وہ مسجدِ اقصیٰ کی مغربی دیوار جسے البراق کہا جاتا ہے پر قبضہ کر سکیں یا اپنا حق جتا سکیں۔"

نومبر ۱۹۲۸ء میں برطانوی حکومت نے ایک قرطاس ابیض میں دیوارِ گریہ سے متصل کوچہ سے کرسیوں اور بنچوں کو ہٹانے کے سلسلہ میں مقامی حکومت کے حکم کو صحیح قرار دیدیا۔ لیکن یہودیوں کا پراپیگنڈہ شدت اختیار کرتا گیا۔ آخر ۱۹۲۹ء کے شروع میں حکومت فلسطین نے دونوں فریقوں سے اپنے موقف کی تائید میں ثبوت پیش کرنے کے لیے کہا۔ سپریم مسلم کونسل نے فوراً جواب بھجوا دیا اور اپنے موقف کی تائید میں ۱۸۴۰ء اور ۱۹۱۱ء کی دستاویز بھی پیش کیں جن کا اوپر ذکر آچکا ہے لیکن چیف ربی بار بار کی یاد دہانی کے باوجود جواب بھجوانے میں ناکام رہا۔ ۱۹۲۹ء کی گرمیوں میں پراپیگنڈہ کی بنا پر عربوں اور یہودیوں کے جذبات انتہائی شدت اختیار کر چکے تھے اور اگست میں یہودیوں کی فلسطینی کونسل نے انتظامیہ کو دھمکی دے دی کہ

" دیوارِ گریہ کے مسئلہ پر یہودیوں کے جذبات قابو سے باہر ہو رہے ہیں"

انہی دنوں سولھویں صیہونی کانفرنس زیورخ میں ہوئی۔ اس نے ایک قرارداد پاس کی جس میں کوتھل معاروی (دیوارِ گریہ) پر عبادت کو صدیوں پرانی روایت، اس پر قبضہ کو یہودیوں کا " ناقابلِ انتقال حق" قرار دیتے ہوئے دنیا بھر کے یہودیوں پر زور دیا کہ وہ اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھیں جب تک دیوارِ گریہ پر ہمارا حق تسلیم نہ کر لیا جائے۔" یہود کے ہفتہ وار " فلسطین ویکلی" اور عبرانی اخبار " دیر ہیوم" میں اس کی تائید میں انتہائی اشتعال انگیز مضامین لکھے گئے۔ دو دن بعد، ہیکل کی تباہی کے دن کی یاد میں، تل ابیب میں ہجانہ اور دوسری نیم عسکری تنظیموں کے چھ ہزار جوانوں نے مظاہرہ کیا اور ایک قرارداد میں " دیوارِ گریہ پر قبضہ" کے تہیہ کا اعلان کر دیا۔ اس کے تین دن بعد کئی سو جوان تل ابیب سے بیت المقدس پہنچے اور ایک جلوس کی شکل میں عرب بازاروں سے گزرتے ہوئے دیوارِ گریہ تک گئے۔ یہاں انھوں نے دیوارِ گریہ پر صیہونی پرچم لہرا کر یہود کا قومی ترانہ گایا اور " دیوار ہماری ہے" کے نعرے لگائے۔

اس پر مسلمانوں میں اشتعال کا پھیلنا لازمی امر تھا۔ لیکن مفتئ شہر نے عوام کو بھڑکنے نہ دیا۔ البتہ دوسرے روز کہ جمعہ اور یوم میلاد النبی ؐ تھا۔ نماز جمعہ کے بعد مسجد اقصیٰ کے شیوخ کی قیادت میں ایک احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ ۲۳ اگست کو شہر اور فلسطین میں وسیع پیمانہ پر ہنگامے ہوئے، بعد ازاں ان ہنگاموں کی تحقیقات کے لیے شا کمیشن بیت المقدس آیا تو اس نے دیوارِ گریہ کو بھی دیکھا اور یہ لکھا کہ یہود، جس جگہ پر کھڑے ہو کر دیوارِ گریہ کے سامنے " عبادت"

کرتے تھے۔ وہ ۱۱ فٹ چوڑی ہے۔ اور اس کا رقبہ ۱۲۰ مربع گز تھا۔ یہ جگہ تین طرف سے رہائشی مکانوں سے گھری ہوئی تھی۔ اور یہود اس تک شمال کی تنگ گلی سے آتے تھے۔
۱۹۲۹ء میں ہنگاموں سے قبل، دیوار گریہ اور حرم کے باب المغاربہ کے درمیان ابومدین زاویہ بحال کر دیا گیا اور دیوار گریہ اور حرم کے دروازے تک پہنچنے کے لیے نیا راستہ دیا گیا ——— اگرچہ شا کمیشن کی سفارشات سیاسی مصلحتوں اور مفادات پر مبنی تھیں۔ اس کے باوجود یہود مطمئن نہ تھے۔ جس پر برطانیہ نے مجلس اقوام کی منظوری سے ایک بین الاقوامی کمیشن قائم کیا۔ جس کے سربراہ سویڈن کے سابق وزیر خارجہ الٹیل لوٹ گرین تھے کمیشن نے عربوں اور یہودیوں کے موقف کی سماعت کے بعد دسمبر ۱۹۳۰ء میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہود نے رسمی طور پر کمیشن سے کہا کہ وہ المغاربہ محلہ کے مکانات کو خالی کرانے اور متاثرین کو دوسری جگہ آباد کرنے کی سفارش کرے۔ انہوں نے اس کے لیے کوئی دلیل پیش کیے بغیر ۱۹۱۸ء کی وِیزمین کی اس پیش کش کو دُہرایا۔ کہ وہ اس اراضی کو خریدنے کے لیے تیار ہیں۔ کمیشن نے ایسی کوئی سفارش نہ کی۔ بلکہ دیوار کے مسئلہ پر اور دیوار کے قریب ہر قسم کے مظاہروں اور تقاریر پر پابندی لگانے پر زور دیا۔ اور اس مسئلہ کے بارے میں ہزاروں شہادتوں سنتے اور سینکڑوں دستاویزات کو دیکھنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ اس پر یہود کا کوئی حق نہیں، مغربی دیوار قطعاً" ایک مسلم وقف کی ملکیت اور مسلمانوں کے ایک مقدس مقام الحرم الشریف کا حصہ ہے۔ دیوار کے سامنے کی گراؤنڈ، اور المغاربہ کی عمارات سب مسلم وقف کا حصہ ہیں اور قانونی طور پر دینی اوقاف ہیں۔ کمیشن نے یہ بھی لکھا کہ ۶۳۲ء میں حضرت عمرؓ اور عیسائی راہب صفرونیوس کے درمیان جو معاہدہ طے پایا تھا۔ اس میں عیسائیوں نے یہ پابندی بھی لگائی تھی کہ مسلمان یہودیوں کو شہر میں داخل ہونے اور رہنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ترکان عثمان کے آخری حکمرانوں نے بطورِ استحقاق نہیں بلکہ استحسان یہود کو مسجد اقصیٰ کی مغربی دیوار کی زیارت کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے لیے انھیں باقاعدہ ترک حکام سے اجازت حاصل کرنا پڑتی تھی اور ان پر یہ شرط عائد کی جاتی تھی۔ کہ وہ وہاں "عبادت" نہیں کریں گے اور نہ ہی شور مچائیں گے۔ بعد کے دور میں اگرچہ انھیں دیوار گریہ پر عبادت کے لیے گراؤنڈ تک

پہنچنے کا حق دے دیا گیا۔ لیکن یہ بھی مخصوص مواقع پر اور مشروط تھا۔ اس طرح گویا کمیشن نے اس جگہ کو قانونی طور پر مسلمانوں کی ملکیت تسلیم کرتے ہوئے یہودیوں کو یہاں تک مخصوص زیارت بنا ہنے کے لیے پہنچنے کی اجازت دینے کی سفارش کی۔ چنانچہ برطانیہ اور مجلس اقوام نے اسے تسلیم کر کے ایک عالمی دستاویز کی حیثیت دے دی اور ۱۹۳۱ء میں انتظامی کونسل کے حکم سے فلسطین میں اسے قانون کی شکل دے دی گئی۔

اس کے بعد بھی یہود اور صیہونی کی سازشوں میں کوئی کمی نہ آئی، بلکہ جرمنی سے یہود کے اخراج کے بعد ان میں شدت آتی گئی۔ ہر سال ہزاروں یہودی فلسطین پہنچنے لگے۔ آخر عرب اُٹھ کھڑے ہوئے، لیکن عربوں سے انصاف کی ہر کوشش کو صیہونیت برطانیہ کے بااثر سیاست دانوں جن میں ونسٹن چرچل بھی شامل تھا اور امریکہ کے بااثر گروہ کی متحارہ قوت نے ناکام بنا دیا۔ بعد ازاں یہود نے برطانیہ کے بجائے امریکہ کو اپنا سرپرست بنایا اور یوں تقسیم فلسطین کی سازش سامنے آئی۔ اس کے تحت بیت المقدس، بیت لحم اور نواحی علاقوں کو بین الاقوامی علاقہ بننے کا منصوبہ طے پایا۔ لیکن اس سے یہود اور عربوں میں جنگ چھڑ گئی اور ۱۹۱۷ء میں ترکوں نے جس مقدس شہر کو جرمنی کے ولیم ثانی کے قریب میں آ کر، مقدس مقامات کے احترام میں لڑے بغیر خالی کر دیا تھا۔ وہاں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ اس دوران میں یہاں عرب لیگ نے شہر مقدس کے تقدس کو برقرار رکھنے کی ہر تجویز کو قبول کر لیا۔ وہاں یہود نے ریڈ کراس کی اس تجویز کو بھی قابلِ اعتنا نہ سمجھا کہ شہر قدس کو ہسپتال قرار دیا جائے، اور ۱۵ مئی ۴۸ء کو شہر پر تین طرف سے حملہ کر دیا۔ آخر شرق اردن کے شاہ عبداللہ آگے بڑھے اور اس آگ میں کود گئے۔ بیت المقدس کے احترام کے مدعی یہودیوں نے مشین گنوں اور توپوں سے حرم پر بار بار حملے کیے۔ صرف ایک حملہ میں حرم پر ۶۰ گولے گرے۔ جس سے چار نمازی ہلاک اور پانچ زخمی ہوئے۔ جن میں ایک شیخ حرم بھی شامل تھے۔ یہود نے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ ہی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ بلکہ عیسائیوں کے معبد بھی ان سے محفوظ نہ رہے۔ آخر جنگ بند ہو گئی۔ قدیم شہر اردن کے قبضہ میں رہا۔ لیکن اسرائیل نے کبھی بھی یروشلم پر قبضہ کی خواہش کو مخفی نہیں رکھا بلکہ وہ ہمیشہ اس کی تاک میں رہا۔ آخر اسے موقعہ مل گیا۔ اور ۵ رجون ۶۷ء کو انتہائی صیہونی دوست ونسٹن چرچل کے لڑکے رنڈولف چرچل کو اعتراف

باب نہم

مُتفرّقات اور زیارتیں

حوض اور تالاب احاطۂ حرم کے نیچے چٹانوں میں مختلف مقامات پر بہت سے حوض بنے ہوئے ہیں۔ جو پانی جمع رکھنے کے کام آتے تھے، روایت ہے کہ عہدِ سلیمانؑ میں حبرون کے قریب وادی اوتاس سے چشموں کا پانی ایک بند کے ذریعے ان حوضوں میں پہنچایا جاتا تھا۔ ناصر خسرو لکھتا ہے کہ حرم شریف کی سطح کے نیچے چٹانوں میں حوضوں کی اتنی تعداد ہے کہ خواہ کتنا ہی مینہ برسے پانی کا بہہ کر بیکار ہو جانا ناممکن ہے۔ کیونکہ سب کا سب حوضوں میں آ کر جمع ہو جاتا ہے۔ اور پانی کو حوضوں تک لے جانے کے لیے سیسے کی نالیاں بنی ہوئی ہیں۔ احاطۂ حرم کے نیچے کے حوضوں کو مرمت کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ سب پکی چٹانوں میں ترشے ہوئے ہیں۔ ان کی چھتوں یا ڈھکنوں کی صورت نانبائی کے تنور کی طرح ہے۔

بیت المقدس کا سب سے بڑا حوض جس کا ایک حصّہ خود مسجد اقصیٰ کے نیچے کھودا گیا۔ بئر ورقہ کہلاتا ہے اور سیوطی کے بیان کے مطابق "جب ہم محراب کی جانب مُنہ کر کے مسجد اقصیٰ میں داخل ہوتے ہیں تو بئر ورقہ کا مُنہ دروازے کی بائیں ہاتھ پڑتا ہے۔" سیوطی نے اس کی وجہ تسمیہ میں ایک عجیب روایت لکھی ہے، وہ لکھتا ہے کہ:-

"اس کے متعلق بہت سے بیانات ہیں، اول ابوبکر بن ابی مریم، عطیہ ابن قیس کے واسطے سے بیان کرتا ہے کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ تحقیق میری امت میں سے ایک شخص اپنے دو پاؤں پر جنّت میں داخل ہو گا اور واپس آئے گا اور وہ زندہ یعنی دنیا کا رہنے والا ہو گا۔" اب روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ایک کارواں بیت المقدس آیا۔ کہ حرم شریف کی زیارت سے مشرّف ہو۔ ان میں بنی تمیم

کرنا پڑا۔ کہ ۸ بجے صبح جنرل نارکس کے حکم سے بیت المقدس پر یہودیوں نے حملہ کر دیا اور نو بج کر دس منٹ پر یروشلم کے اسرائیلی سیکٹر کے میئر کو جنرل نارکس نے ٹیلیفون پر بتایا۔ کہ وہ "بیت المقدس کے میئر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار رہے" چرچل کی کہانی اسرائیل کے فوجی ذرائع پر مبنی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اردنی شہر قدس کی مقدس زیارات کے دفاع کے لیے شیروں کی طرح لڑے، آخر انھیں اپنے سے کئی گنا طاقتور دشمن کے سامنے مقدس مقامات کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے پسپا ہونا پڑا اور ۷ جون کو جب اسرائیلی وزیر دفاع موشے دایان دیوارِ گریہ کے سامنے پہنچا تو اس نے وہی قدیم نعرہ لگایا "دیوار ہماری ہے" پھر چند یوم بعد دیوار پر عبرانی زبان کی ایک تختی لگادی گئی "بیت، کنشت" (معبد) اور آج ابو مدین اوقاف کی تمام عمارتیں ہموار کی جا چکی ہیں اور ان کے باسی جبراً شہر سے نکال دیئے گئے ہیں۔
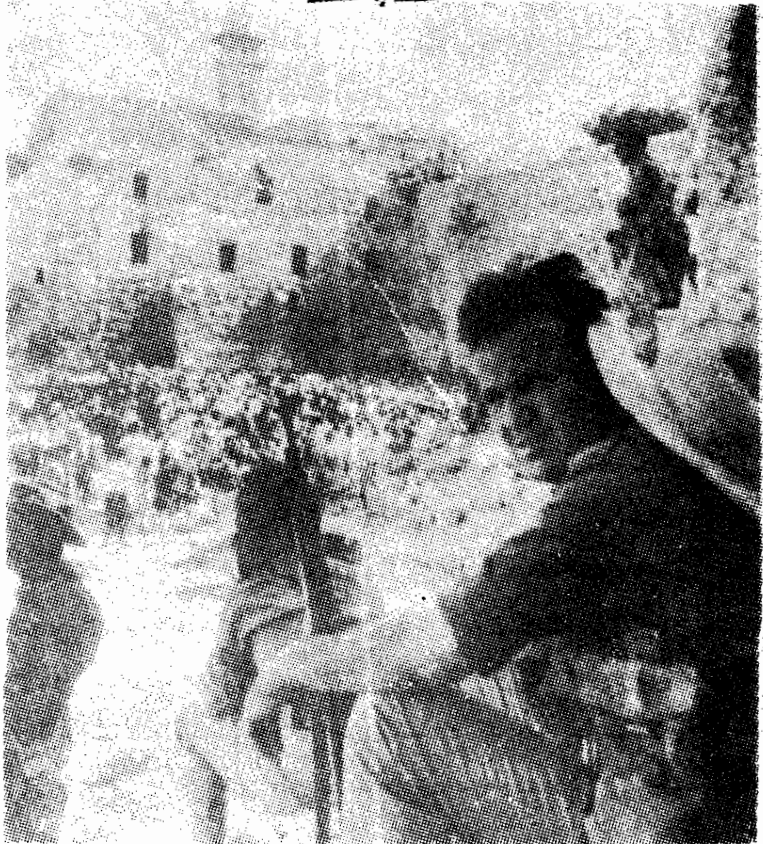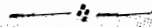
کا ایک شخص شریک ابن حباشہ کوئیں سے پانی لینے گیا۔ اور اتفاق سے ڈول نیچے گر گیا۔ وہ اسے نکالنے کے لیے خود نیچے اترا، اندر اسے ایک باغ کا دروازہ نظر آیا۔ اور وہ اس میں داخل ہو گیا۔ باغ کی سیر کے دوران اس نے کسی درخت کا پتہ توڑ لیا، اور اسے کان کے پیچھے رکھ کر کنوئیں سے نکل گیا۔ پھر یہ شخص حاکم شہر کے پاس گیا اور جو کچھ دیکھا تھا سب بیان کیا۔ تب حاکم شہر نے بہت سے آدمی اس کے ساتھ کیے، لیکن جب وہ کنوئیں میں اترے تو کچھ نظر نہ آیا۔ حاکم نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں یہ سب واقعہ لکھ بھیجا اور وہ حدیث یاد دلائی کہ

"میری امت میں سے ایک شخص جنت میں داخل ہو گا . . . ."

جواب میں امیر المومنین نے تحریر فرمایا کہ اس پتے کو دیکھا جائے اگر وہ سرسبز رہے اور پژمردہ نہ ہو تو بے شک وہ "جنت کا پتہ" ہے۔ جہاں کے پتے کبھی نہیں مرجھاتے اور مذکورہ حدیث میں بھی رسول اللہ کا یہ ارشاد سنا گیا ہے۔ کہ اس پتے میں کوئی خرابی واقع نہیں ہو گی اور جب دیکھا گیا تو اسے سرسبز پایا۔

مقدسی لکھتا ہے کہ بیت المقدس میں پانی بافراط ہے۔ چنانچہ یہ ضرب المثل عام ہو گئی ہے کہ بیت المقدس میں کوئی جگہ ایسی نہیں . . . . جہاں اذان کی آواز اور پانی نہ ہو۔ شہر میں شاید ہی کوئی مکان ہو۔ جس میں ایک یا زیادہ حوض نہ ہوں۔ شہر میں تین بڑے حوض، برکہ بنی اسرائیل، برکہ سلیمان اور برکہ عیاض ہیں۔ مسجد اقصیٰ کے حرم میں بلیس نہایت وسیع و عریض حوض ہیں۔" مزید برآں بیت المقدس سے ایک منزل کے فاصلے پر ایک وادی میں پانی کا بند باندھا گیا ہے جہاں دو تالاب بنے ہیں۔ جن میں موسم سرما کی بارشوں کا پانی پہاڑوں سے بہہ کر جمع ہو جاتا ہے۔ ان سے شہر میں پانی لانے کے لیے نہریں بنی ہیں، جو موسم بہار میں پہنچا دی جاتی ہیں۔" برکہ بنی اسرائیل حرم شریف کے شمال مشرقی گوشے کے باہر آج بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ بخت نصر نے اسے بنی اسرائیل کے بریدہ سروں سے بھر دیا تھا۔ اسی روز سے یہ برکہ بنی اسرائیل کہلاتا ہے۔ برکہ سلیمان جسے حضرت سلیمان نے کھدوایا تھا، آجکل معدوم ہے۔ البتہ برکہ عیاض جسے صحابی رسول حضرت عیاضؓ بن اغنم نے کھدوایا تھا۔ برکہ حمام البطرق کے نام سے یافہ گیٹ کے قریب موجود ہے۔

وادیٔ ساہرہ و میدان جہنم

ناصر خسرو لکھتا ہے کہ جامع مسجد سے آگے ایک

بڑا مسطح میدان ہے، جسے ساہرہ کہتے ہیں، مشہور ہے کہ یہی میدانِ قیامت ہے اور یہی محشرِ خلائق ہوگا۔ اس جنگل کے کنارے بڑا مقبرہ اور بکثرت مقدس مقامات ہیں جہاں لوگ دُعا کرتے ہیں۔

"اے خدا! ہماری مرادوں کو پورا کر، ہمارے گناہوں اور بداعمالیوں کو معاف فرما اور اے سب سے بڑے رحیم! اپنی رحمت سے ہم پر رحم فرما"

مسجد اور دشت ساہرہ کے درمیان نشیب میں ایک وادی ہے۔ اس وادی کو جو بطور خندق کے ہے، حضرتِ عمرؓ نے وادیٔ جہنم کا نام دیا تھا اور آج بھی یہ اسی نام سے معروف ہے۔ یہ گھاٹی بیت المقدس کے پرانے شہر سے مشرق میں ہے۔ لی سٹرینج کا بیان ہے کہ یہودنے بیت المقدس کے جنوب و جنوب مغرب میں واقع ایک گھاٹی کو "جے بن ہنون" یعنی جہنم کے نام سے منسوب کیا تھا۔ اور مسلمانوں نے جس گھاٹی کو وادیٔ جہنم کہا ہے" وہ یہود میں وادیٔ کیدرون یا جیہوشیفٹ کہلاتی تھی اور اس کی روایت وہ جوئیل نبی کے صحیفہ سے لیتے اور اسے میدانِ حشر قرار دیتے تھے۔ مقدسی کے بیان کے مطابق وادیٔ جہنم احاطۂ حرم کے جنوب مشرقی گوشے سے شہر کے مشرق میں انتہائے شمال تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں باغ، تاکستان، حجرے، مقابر وغیرہ بہت سے مقدس مقامات آتے ہیں اور کنیسہ مزارِ مریم بھی اسی میں ہے۔ اور اوپر کے رُخ وادی کی ڈھلوان پر اصحابِ رسولؐ شداد بن اوس بن ثابت اور عبادہ ابن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مدفن بھی ہیں۔" یہ میدان وادیٔ ساہرہ اور مسجدِ اقصےٰ کے درمیان واقع ہے۔ اسی وادی میں وہ عمارت ہے جسے ناصر خسرو نے "فرعون کا گھر" قرار دیا ہے۔ جو اپنی ساخت کے لحاظ سے متحیر کن ہے۔

میدانِ ساہرہ کے بارے میں یاقوت نے لکھا ہے کہ وہی میدانِ حشر ہوگا۔ کوہِ زیتون وادیٔ جہنم کے مشرقی پہلو سے مسجدِ اقصیٰ پر چھایا ہوا ہے اور پہاڑی کے پہلو پر بلند جگہ پر وہ قبرستان واقع ہے۔ جہاں ہر ملک کے مسلمان اپنے مُردے دفن کرتے ہیں۔ اسے مقام الساہرہ بھی کہا جاتا ہے۔

وادیٔ جہنم یا کیدرون کے نشیبی علاقہ میں عین (چشمہ) ایوبؑ ہے جو دیوارِ حرم شریف سے تقریباً کچھ فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ اسے سولھویں صدی سے نصاریٰ

"ویل آف شمیاہ" کے نام سے پکارنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ اس چشمہ میں حضرت ایوبؑ نے غسل فرمایا تھا۔ اس میں پانی ۸۰ ذرع گہری ایک چٹان سے آتا ہے اور ہر سال موسم سرما میں کناروں سے اُبل پڑتا ہے۔ چشمۂ ایوب سے دو فرلانگ آگے عین سلوان آتا ہے مقدسی لکھتا ہے کہ عرفات کی رات زمزم کا پانی اندر ہی اندر عین سلوان آتا ہے۔ اس شام یہاں میلا لگتا ہے۔ ناصر خسرو لکھتا ہے: یہ چشمہ ایک چٹان سے پھوٹتا ہے۔ اس کے پانی میں کوئی سر سے پاؤں تک نہائے تو اسے ہر قسم کے درد سے نجات مل جاتی ہے اور بقول علی ہروی، یہ قبۃ الصخریٰ کے نیچے سے بہتا اور وادی جہنم میں بالائے سطح نمودار ہوتا ہے۔ اس کا پانی موسم سرما میں بہت گرم اور موسم گرما میں بہت سرد ہوتا ہے۔ یہودی روایات کے مطابق اسے حضرت سلیمانؑ کے پوتے ملک حذقیا نے کھودا تھا۔ لی سٹرینج کا بیان ہے۔ کہ عین صلوان، چشمہ نہیں، حوض ہے اور ایک سو تیس گز دور عین ام الدرج سے ایک نہر بنا کے ذریعہ پانی یہاں لایا گیا ہے۔ یہ نہر زیر زمین ہے اور اس سرنگ کے راستے انسان اندر ہی اندر اس کے منبع تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کے نواحی باغات حضرت عثمانؓ نے مساکین شہر کے لیے وقف کر رکھے تھے۔ یہودیوں نے ترکی عہد حکومت میں اس چشمہ کے ارد گرد زمین پر قبضہ کرنا چاہا تھا، لیکن سلطان ترکی نے ان کی کوششوں کو ناکام بنا کر یہاں ایک مسجد تعمیر کرا دی، جو اب بھی قائم ہے۔

غارِ قارون

مقدسی نے بیت المقدس کے عجائبات میں ایک بڑے غار کا ذکر کیا ہے جسے قرآن شریف کی سورۂ قصص کے حوالے سے قارون سے منسوب کیا گیا مقدسی کا بیان ہے کہ یہ شہر سے باہر ہے۔ یہاں سے ایک دروازہ اس مقام پر لے جاتا ہے۔ جہاں حضرت موسیٰ کے مقتولین مدفون ہیں، لیکن اس بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ بظاہر یہ ایک پتھر کی کان ہے۔ جس میں اندر جانے کے راستے بنے ہوئے ہیں اور ان میں آدمی مشعل کی مدد سے آگے جاتا ہے۔

جامع عمرؓ

کے عین مقابل ہے مسجد اقصےٰ اور قبۃ الصخرہ کے علاوہ شہر میں

پینتیس مساجد ہیں، جن میں سب سے اہم اور قابلِ دید جامع عمرؓ ہے مشہور ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے شہر کو امان دے دی۔ تو راہب اعظم نے حضرت عمرؓ کو کنیسہ کمامہ دیکھنے کی دعوت دی، حضرت عمرؓ وہاں تشریف لے گئے، جب وہاں سے نکلنے لگے، تو مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ پادری نے وہیں نماز پڑھنے کی درخواست کی۔ مگر آپ نے فرمایا۔ نہیں، پھر آپ نے سیڑھیوں پہ نماز ادا کی۔ نماز ادا کر چکے تو آپ کو خیال آیا۔ مبادا مسلمان اس کو روایت بنا لیں۔ تو عیسائیوں کی عبادت گاہیں محفوظ نہیں رہیں گی، آپ نے فوراً ایک کاغذ منگوایا اور اس پہ تحریر دے دی کہ کوئی مسلمان میری ادائیگی نماز کو مثال بنا کر اس گرجا پر تصرف نہ کرے، چنانچہ عیسائیوں نے اس رواداری اور انصاف کے اعتراف ہیں، گرجا کے سامنے بیس قدم کے فاصلے پہ ایک مسجد تعمیر کرنے کی اجازت چاہی۔ جسے مسلمانوں نے قبول کر لیا۔ چنانچہ آج یہی مسجد جامع عمرؓ کے نام سے مشہور ہے۔

مسجد فاروقی

یہ مسجد، جبل زیتون پر کنیسہ صعود کے قریب واقع ہے۔ کہتے ہیں حضرت عمرؓ جب بیت المقدس تشریف لائے۔ تو انہوں نے لشکر کے ساتھ اسی جگہ قیام کیا۔ اور یہاں آجکل مسجد فاروقیؓ ہے۔ مسلمانوں نے ان کی امامت میں نماز ادا کی۔ بعد میں مسلمانوں نے اس جگہ ایک مستقل مسجد تعمیر کر دی۔ جو مسجد فاروقی کہلائی۔

مآثرِ نصاریٰ

القیامہ یا کمامہ

یہ وہی قیامت زا مقام ہے، جس کو "کافروں" سے نجات دلانے کے لیے سارا یورپ اُمڈ آیا اور مدتوں حشر برپا رہا۔ کنیسہ کمامہ ایک نہایت وسیع گرجا ہے، جسے نصاریٰ نہایت محترم سمجھتے ہیں۔ عیسائی روایات کے مطابق حضرت عیسٰیؑ یہیں مصلوب اور مدفون ہوئے، اور یہیں دوبارہ زندہ ہوئے۔ اس گرجے میں انہوں نے ایک صلیب بنا رکھی ہے۔ جو سر تا سر سنگِ مرمر کے ایک مستطیل چبوترہ پر کھڑی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی ہتھیلیوں میں آہنی میخیں ٹھکی ہیں۔ پاؤں کو اوپر تلے لکڑی پر رکھ کر
کیل اس طرح ٹھونکی گئی ہے کہ پاؤں کو توڑ کر لکڑی سے نکل گئی ہے۔ اسی کے

مزار حضرت مریم علیہا السلام

قریب ایک طرف حضرت مریمؑ غمگین کھڑی ہیں، حضرت مریمؑ کا مجسمہ نہایت شاندار

ہے۔ ساری مورت سونے کی ہے۔ کہتے ہیں اس جگہ مریم غم کی وجہ سے بیہوش ہو کر گر پڑی تھیں۔ اسی جگہ وہ چٹان بھی بتاتے ہیں جو ان کی روایت کے مطابق لوٹ گئی تھی اور حضرت آدمؑ اس میں سے برآمد ہوئے تھے کیونکہ عیسائی روایات کے مطابق وہ صلیب پیٹے جلانے کے مقام کے نیچے تھی۔ یہ نہایت خوبصورت اور رفعت و شان میں شہرۂ آفاق ہے۔ اس میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور ان کے فرزندوں اور حضرت عیسےٰؑ اور ان کے گدھے کی تصویریں اور جنت و دوزخ کے نقشے بنے ہوئے ہیں۔ اسی کنیسہ میں "آگ کا معجزہ" پیش آیا تھا جس سے ایک عرصہ تک عقیدت مند مسیحیوں کو راہب دھوکہ دیتے اور لوٹتے رہے۔ یہ گرجا سطح شہر سے نیچا اور بیت المقدس کے مغربی دروازہ یافہ کے اندر ایک گلی میں ایسی تنگ جگہ واقع ہے کہ اندر جانے والا مجبوراً سجدے کی حالت میں ہو جاتا ہے۔

اسے ۳۲۵ء میں پہلے پہل قسطنطین اعظم نے بنایا۔ ۶۱۴ء میں خسرو پرویز نے اسے تاخت و تاراج کیا اور ۶۲۹ء میں موڈس ٹس نے دوبارہ تعمیر کیا۔ بعض مؤرخین کے مطابق گیارھویں صدی کے پہلے عشرہ میں فاطمی خلیفہ مصر الحاکم بامر اللہ نے عیسائی زائرین کی مجرمانہ سرگرمیوں اور لوٹ مار سے تنگ آ کر اسے مسمار کرا دیا تھا۔ لیکن اس کے بیٹے المستنصر نے دوبارہ تعمیر کی اجازت دے دی۔ اور رومی شہنشاہ قسطنطین مونا کس نے ۱۰۴۸ء میں اسے تعمیر کرایا۔ اسی مقدس گرجا میں مشرقی سمت وہ قید خانہ ہے جہاں حضرت عیسےٰؑ مقید رہے۔ یہ جگہ عہد مسیح میں فصیل شہر سے باہر تھی۔ مسیحی اسے "القیامہ" کہتے ہیں لیکن بقول یاقوت "اصل نام قیامہ نہ تھا، بلکہ کمامہ تھا کیونکہ شہر والے اس جگہ اوپلے تھاپتے اور مجرموں کو یہاں لا کر پھانسی دیتے اور ان کے ہاتھ کاٹتے تھے" اور مسعودی لکھتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا محل یہیں تھا۔

اس گرجا کی چابیاں سلطان صلاح الدین کی فتح بیت المقدس سے سقوط خلافت تک مسلمانوں کی تحویل میں رہی ہیں۔ کیونکہ عیسائیوں کے مختلف فرقے متفق نہ تھے کہ اس کی چابیاں کس فرقہ کے لوگوں کے پاس رہیں۔ لی سٹرینج نے کنیسۃ الکمامہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بعض عیسائی مصنفین کے اس دعوے کو لغو قرار دیا ہے کہ کنیسہ الکمامہ پہلے کبھی ...

کلیسائے گتسمنے

بجض سمین کا باغ، جبلِ زیتون کے دامن میں حرم شریف کی شمال مغربی دیوار سے ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسی خوشنما گرجا میں ایک غار ہے، جہاں حضرت عیسےٰؑ اپنے شاگردوں کے ساتھ عبادتِ خداوندی میں مصروف رہا کرتے تھے۔
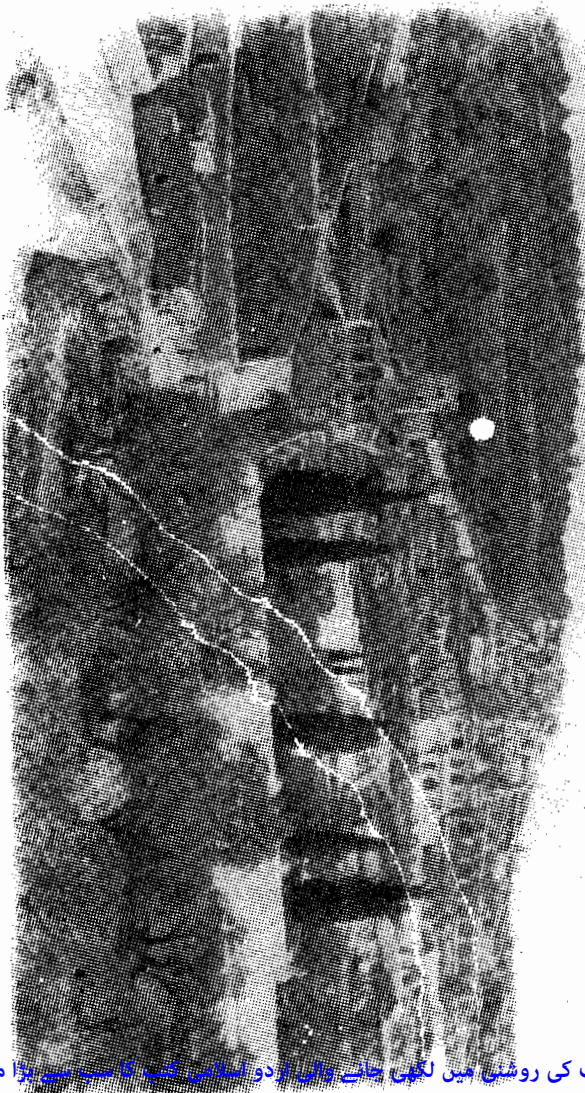
کلیسائے گتسمنی اور جبلِ زیتون

اس سے آگے حضرت مریم کا روضہ ہے، جو ایک وسیع و عمیق مکان میں ہے۔ لوگ اس تاریک مکان میں موم بتی جلا کر جاتے ہیں۔ مریمؑ کی قبر بہت ہی تنگ کمرے میں ہے جس میں پانچ چھ آدمی بمشکل سما سکتے ہیں۔ اس عمارت کی تمام دیواریں حضرت عیسٰےؑ کی زندگی کے مختلف ادوار کی تصویروں سے مزین ہیں۔ عیسائی ان تصویروں کو دیکھ دیکھ کر روتے ہیں۔

کنیسۂ صعود

کوہ زیتون پر واقع ہے، جہاں حضرت عیسٰےؑ رات کو عبادت کیا کرتے تھے، اور جب یہودیوں نے قتل کے ارادہ سے اس مکان کا محاصرہ کیا تو اللہ تعالےٰ نے آپ کو اٹھا لیا۔ ادریسی کنیسۂ صیہون کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس میں وہ ضیافت خانہ ہے، جس میں سیّدنا عیسٰےؑ نے اپنے شاگردوں کے ساتھ کھانا تناول فرمایا۔ اور وہ میز یا مائدہ جو آسمان سے اُترا تھا، آج تک موجود ہے۔ عین صلوان کے کنارے حضرت عیسٰےؑ نے ایک اندھے کا روگ کھو دیا۔ کوہ زیتون ہی پر پیٹر نوسٹر کا گرجا ہے۔ العاذر کی قبر ہے، جسے حضرت عیسٰےؑ نے زندہ کر دیا تھا۔ وہ گرجا ہے۔ جہاں تقرب الٰہی کے لیے عیسائی مرد و زن اپنے آپ کو قید کر لیتے ہیں، مختصر یہ کہ کنیسۃ القمامہ کے علاوہ اندرون و بیرون شہر عیسائیوں کی متعدد زیارت گاہیں ہیں۔

جس مقام پر حضرت عیسیٰ کے خلاف مقدمہ چلایا گیا تھا۔ آجکل وہاں ایک گرجا بنا ہوا ہے اور اس میں وہ حصہ جہاں پنطس پیلاطس کی عدالت تھی۔ اب ایک تہہ خانہ کی شکل میں واقع ہے اور اس کے پتھر وہی ہیں۔ جو رومن عہد میں تھے۔ اس گرجا سے ایک راستہ کنیسۃ القمامہ کو جاتا ہے۔ اس راستہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عدالت سے سزائے موت پانے کے بعد حضرت عیسٰےؑ صلیب اپنے کندھے پر رکھ کر اس مقام کی طرف گئے جو صلیب دینے کے لیے مقرر تھا۔ بنایا جاتا ہے کہ راستہ اپنے

سینٹ ہیلینا کا گرجا۔ عیسائی روایات کے مطابق یہاں صلیب اصلی دفن تھی۔

میں بارہ مقامات پر حضرت عیسٰیؑ تھک کر دم لینے کے لیے ٹھہرے تھے۔ ان تمام مقامات پر عیسائیوں کے مختلف فرقوں نے گرجے بنا رکھے ہیں۔

باب دہم

بیت المقدس اور مسجدِ اقصےٰ

یہودی قبضہ کے بعد

یہود نے یروشلم کے نئے شہر پر قبضہ کے فوراً بعد اعلان کر دیا تھا کہ ان کی جنگ اسلام اور اس کے مقدس مقامات کے خلاف ہے۔ چنانچہ جنگ ۶۷ء میں جب وہ پرانے شہر میں داخل ہوئے جو مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ تو انھوں نے اس شہر پر خوفناک بمباری کی۔ مسجد اقصیٰ کا مرکزی دروازہ مسمار کر دیا۔ مسجد کا ایک مینار گرا دیا۔ مسجد کے گنبد اور قبۃ الصخرہ کو شدید نقصان پہنچایا۔

حقیقت یہ ہے کہ صیہونی تحریک روزِ اوّل ہی سے مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کے مذموم ارادے رکھتی ہے۔ جو صیہونی دعووں کے مطابق دو ہزار سال قبل مسجد کی جگہ کھڑا تھا۔ اور جسے ۷۰ء میں مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ صیہونی تحریک کی طویل تاریخ میں یہودی ربّی اور تالمود کے فضلاء اس ہیکل کی جزئیات پر غور کرتے رہے ہیں۔ اور ۱۹۴۹ء میں یہودی ماہرینِ تعمیرات کی ایک کمیٹی نے ہیکل کا ایک تعمیراتی ڈیزائن اور خاکہ تیار بھی کر لیا تھا۔

۱۹۶۵ء میں جو عالمی میلہ نیویارک میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں یہودی تنظیموں کے پویلین میں مسجد الاقصیٰ کی جگہ تعمیر کئے جانے والے ہیکل کی نمائش کی گئی۔ اور جب ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ تو عالمی صیہونی تنظیم نے مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل تعمیر کرنے کے لیے ایک خصوصی فنڈ کا اجرا کیا اور مختصر سی مدت میں بیس کروڑ ڈالر جمع ہو گئے۔ بیت المقدس پر یہودی قبضہ کے ساتھ ہی مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حرم شریف میں یہودیوں کے اجتماع ہونے لگے، جن میں رقص و سرود اور غیر اخلاقی
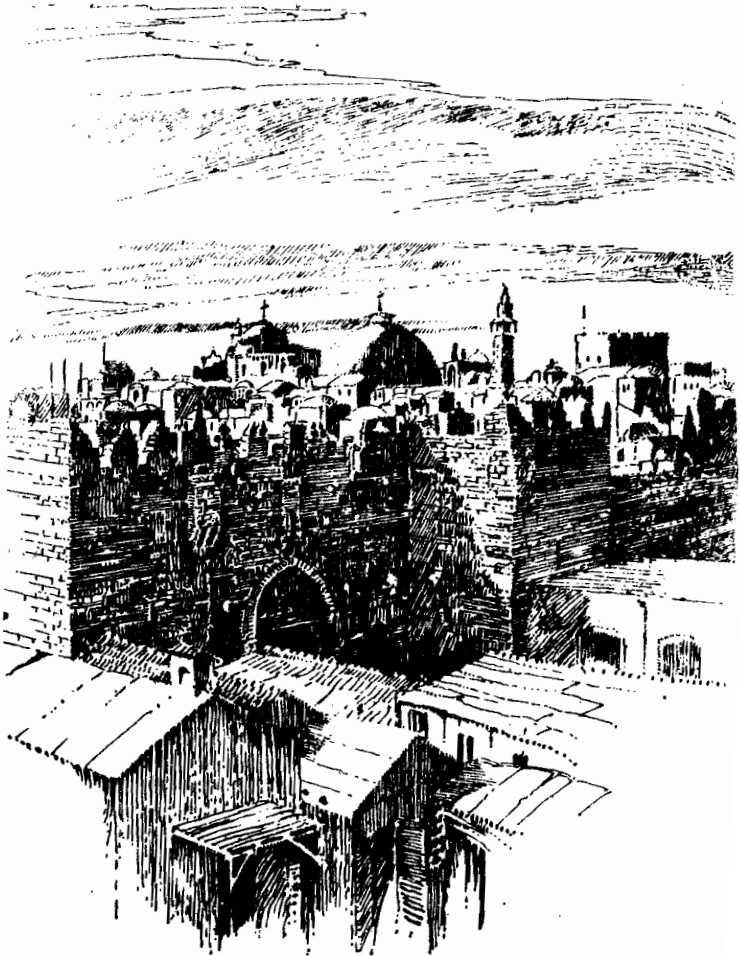
بیت المقدس کا تاریخی دروازہ —— باب دمشق

فتح قدس کے بعد حضرت عمرؓ اسی دروازہ سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔

آج پھر یہ کسی غازیٔ اسلام کا منتظر ہے

حرکات کے شرمناک مظاہرے ہوتے ہیں، مسجدِ اقصیٰ کے دروازے یہودی سیاحوں کے لیے کھلے ہیں۔ وہ اپنے کتوں کے سا تھ جوتے پہنے حدود مسجد میں گھومتے پھرتے ہیں اور قبۃ الصخرہ اور مسجد کی حدود میں یہودی جوڑے کھلے بندوں بوس و کنار میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہودیوں نے ایک ماہ کے اندر اندر" البراق شریف" کے سامنے والے چوک تک ایک نیا اور کشادہ راستہ تعمیر کرنے کے لیے مسلم اوقاف کی ایک مسجد اور ۱۳۵ عمارتوں کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا۔ البراق الشریف" مسجد اقصےٰ کی مغربی دیوار سے ملحق ہے۔ یہ وہی مقام ہے۔ جہاں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج اپنے راکب کو باندھا تھا۔ یہودی اس جگہ کو" دیوارِ گریہ" کہتے ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ دیوارِ گریہ پر یہودی دعویٰ کو ۱۹۳۰ء میں مجلس اقوام کی مقرر کردہ عالمی کمیٹی رد کر چکی ہے۔

اسرائیل نے مارچ ۱۹۶۸ء میں اپنے ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو مسجد اقصےٰ کے نیچے اور اس کے نواحی علاقے میں کھدائی پر مامور کر دیا تاکہ یہودی ہیکل کے آثار تلاش کئے جا سکیں۔ وہ حرم الشریف کی حدود میں بھاری مشینری کے ساتھ داخل ہوئے اور جگہ جگہ سے اس مقدس مقام کی کھدائی ہونے لگی۔ اور یہودیوں نے مسجد کے نیچے ایک سرنگ نکال لی۔ چنانچہ ۔ ار جون ۱۹۶۸ء کو یروشلم سنڈے پوسٹ نے ان ماہرین اور مشینوں کو حرم الشریف میں کھدائی کرتے ہوئے دکھایا اور دو صفحات پر پھیلے ہوئے اس تصویری فیچر کا عنوان "ہیکل کی دیواروں کی تلاش" قائم کیا۔ یروشلم پوسٹ نے لکھا ہے کہ

سنہ ۷۰ء میں ٹیٹوس کی آگ نے ہیکل کا کوئی نشان نہیں چھوڑا صرف ہیرود کی تعمیر کردہ دیواروں کے آثار باقی ہوں گے یا جیسا کہ ماہرین آثارِ قدیمہ کا کہنا ہے کہ ایک صدی قبل مسیح میں ہیکل کے گرد اگرد چاروں طرف جو فٹ پا تھ تھا۔ اس کے آثار ملنے کی توقع ہے۔ اور موجودہ مہم کا مقصد ہیکلِ ہیرود کے آثار یا اس فٹ پاتھ کی دریافت ہے۔ اِس مہم کی نگرانی پروفیسر بنجامین مازار (BENJAMIN MAZAR) کر رہے ہیں۔ پروفیسر مازار کے کاریگروں کی پوری توجہ دیوارِ گریہ اور اس سے متصل جنوبی دیوار کے ساتھ سیر کا [illegible]

پروفیسر بنجامین نے پوسٹ کے نمائندے کو بتایا کہ

"ہم تیرھویں چودھویں صدی کی سطح سے ہیرود کے عہد کی گہرائی تک کھدائی کریں گے۔ بعدازاں پہلے ہیکل کی بنیادیں تلاش کی جائیں گی"

پندرہ اگست ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں نیویارک ٹائمز نے بھی اپنے نمائندے کے حوالے سے ایک خبر شائع کی۔ کہ پروفیسر بنجامین جو عبرانی یونیورسٹی کے سابق صدر ہیں نے کھدائی کے سات مرحلوں میں سے پہلا مرحلہ مکمل کر لیا ہے۔ اور وہ ہیرود کی گہرائی تک پہنچ گئے ہیں۔ جنوبی دیوار کے بالمقابل کئی کھائیاں کھودنے کے بعد پروفیسر بنجامین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہیکل کے سامنے ایک مرتفع ڈیوڑھی تھی۔ جوسیفس کی روایت بھی اس کی تصدیق کرتی ہے کہ ہیکل کا مرکزی دروازہ جو جنوبی دیوار میں تھا۔ دوہرا تھا۔ پروفیسر مازار نے امید ظاہر کی ہے کہ وہ اس دروازے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے لیے انھیں بیت المقدس کے مسلمانوں کی مدافعت کا مقابلہ کرنا ہو گا کیونکہ یہ دروازہ نقرئی گنبد کی مسجد اقصیٰ کے نیچے ہے۔ اور یہ مسجد مسلمانوں کی مقدس ترین مساجد میں سے ہے۔ الاقصیٰ، اسلامی میوزیم اور مسجد النسا جنوبی دیوار پر واقع ہیں۔ اور ہیکل ان کے بالمقابل تھا۔ جس جگہ آج قبۃ الصخرہ ہے"

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ صیہونیوں نے اپنی اس سیاسی اور مذہبی آرزو کو کبھی نہیں چھپایا۔ کہ وہ مسجد اقصیٰ کو گرا کر اس جگہ ہیکل تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ خواہش اتنی ہی قدیم ہے۔ جتنی صیہونی تحریک ہے۔ وہ ہمیشہ کہتے رہے ہیں کہ

"یروشلم کے بغیر صیہون اور یہودی ہیکل کے بغیر یروشلم کا تصور نہیں کیا جا سکتا"

یہودیوں نے برطانوی دور انتداب میں خطیر رقوم خرچ کر کے مسجد اقصیٰ کا قبضہ لینے کی کوشش کی تھی مگر عربوں کی مزاحمت نے انھیں ناکام بنا دیا۔

جولائی ۱۹۲۰ء میں فلسطین کی برطانوی انتظامیہ کے ڈائرکٹر جنرل، جنرل لی بونہ نے ایک رپورٹ میں بتایا کہ:

فلسطین کے ربی اعظم ابراہام اسحاق کک، عالمی صیہونی تنظیم

کے نائب صدر مسٹر اوسچکن (USSICHKIN) اور دوسرے ربیوں کے ایک وفد نے ان سے ملاقات کرکے سرکاری طور پر درخواست کی کہ فلسطین کی برطانوی حکومت اور برطانوی انتظامیہ، مسجد اقصیٰ کا تمام علاقہ ان کے حوالے کر دے۔

۱۹۲۲ء میں برطانوی کابینہ کے یہودی رکن ملشیٹ (MELCHET) (اس وقت سر الفریڈ مونڈ تھے) نے ایک بیان میں کہا کہ "وہ دن قریب ہے، جب مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل تعمیر کیا جائے گا۔ اور میں اپنی باقی ماندہ زندگی اس مقدس کام کے لیے وقف کر رہا ہوں"۔ ۱۸؍ اگست ۱۹۲۹ء کو سوسائٹی برائے تحفظ دیوار گریہ کے صدر کوسنر (KLOSNER) نے فلسطین ویکلی میں لکھا کہ

"اقصیٰ قربان گاہوں کی قربان گاہ ہیکل پر تعمیر ہے اور یہودیوں کی ملکیت"

دو روز بعد ۱۸؍ اگست کو یروشلم کے یہودی روزنامہ دور ہیوم (DOWAR HAYYUM) میں چیف ربی اسحاق کک کی تقریر شائع ہوئی۔ اس نے یروشلم میں ایک یہودی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"دنیا کے تمام یہودی نوجوانوں نے اپنے قومی جذبے اور میکابی فوجی طاقت کا اظہار کر دیا ہے۔ وہ اپنے مقدس ہیکل پر جہاں آجکل مسجد اقصیٰ ہے، قبضہ کرنے کے لیے جانیں قربان کر دیں گے"

اس کے بعد دنیا بھر میں پھیلے ہوئے یہودیوں کے متعدد رہنماؤں نے اس بات کو یکے بعد دیگرے دہرایا کہ

"یروشلم کے بغیر صیہون اور ہیکل کے بغیر یروشلم کا تصور ناممکن ہے"

پھر اسی سال یہودیوں نے مسجد اقصیٰ پر زبردستی قبضہ جمانے کی کوشش کی مگر مجاہدین قدس نے انھیں پسپا کر دیا۔

اس کے باوجود ان کی کوششیں جاری رہیں اور انھوں نے اب نئے نئے فریب کھیلنا شروع کیے۔ چنانچہ ۲۰ نومبر ۱۹۳۰ء کو رومانیہ کے "ربی اعظم" ابراہام روزنباش (ROSENBACH) نے مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی کو ایک خط لکھا جس میں اس نے مسجد اقصیٰ یہودیوں کے حوالے کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ تاکہ یہودی مذہبی عبادات ادا کرسکیں۔ اس قسم کا ایک خط اس نے حکومت فلسطین کے

سیکرٹری جنرل کو لکھا مگر دال نہ گلی۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء کی جنگ میں انھوں نے دوبارہ مسجد اقصیٰ پر زبردست بمباری اور مسجد کے گنبد اور قبۃ الصخرہ کو نشانہ بنا کر گولہ باری کی جس سے مسجد کی دیواروں، قبۃ الصخرہ اور گنبد اقصیٰ کو شدید نقصان پہنچا۔ یہودیوں نے اپنے حصول مقصد کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ ہزاروں افراد اس غرض کی خاطر جنگ میں جھونک دیئے لیکن فلسطینی ہائی کمان کے مسلح دستوں الجہاد، المقدس اور الاخوان نے ان کے ہر حملہ کو پسپا کر دیا۔ ہزاروں یہودی قتل ہوئے، آخر پسپا ہو گئے۔ اور اقوام متحدہ کی تحریک پر فریقین میں جنگ بند ہو گئی۔ تاہم تل ابیب میں ربّی اعظم نے اعلان کیا:

"اسرائیل کا دارالحکومت تل ابیب نہیں، بیت المقدس ہوگا، کیونکہ ہیکل سلیمانی اسی شہر میں تھا۔"

صیہونیت ایک سیاسی و مذہبی تحریک ہے اور اس کا داعی اسرائیل مسلسل اپنے پوسٹ کارڈوں پر مسجد اقصیٰ اور دوسرے مسلم مقامات کی تصاویر چھاپتا رہا۔ ان پر یہودی پرچم لہراتا نظر آتا۔ اور یہ تاثر دیا جاتا کہ یہ یہودی مقامات ہیں۔ آخر جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں یہود نہ صرف مسجد اقصیٰ پر قابض ہوئے۔ بلکہ حبرون میں سیدنا ابراہیم الخلیلؑ کا حرم شریف بھی ان کے تصرف میں چلا گیا۔ حرم خلیل اللہ پر قبضہ کے فوراً بعد انھوں نے اس پر یہودی پرچم لہرا دیا۔ اور عبرانی زبان میں جگہ جگہ تختیاں نصب کر دیں کہ یہ "یہودی ملکیت ہے" مسلمانوں کا داخلہ اس مقدس مسجد میں بند کر دیا گیا۔ اُن سے کہا گیا کہ وہ صرف جمعہ کی نماز یہاں ادا کر سکتے ہیں، اس کے ساتھ ہی اسے ایک "یہودی عجائب گھر" میں بدل کر کے یہودی سیاحوں کی سیرگاہ میں تبدیل کر دیا۔ مسلمانوں نے اس پر شدید احتجاج کیا۔ لیکن بالآخر اُن کی قوتِ مدافعت جواب دے گئی۔ اور یہودی اس پر اپنا قبضہ مستقل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہودی جب بیت المقدس پر قابض ہوئے تو اس وقت انھوں نے جس بربریت کا مظاہرہ کیا۔ اس کا اندازہ بیت المقدس کے سابق میئر روحی الخطیب کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۳ رمئی ۱۹۶۸ء کو سلامتی کونسل میں کی۔ انھوں نے بتایا کہ بیت المقدس پر یہودی قبضہ کو ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ شہر کے مغربی حصّہ کو

اپنے ستم کا نشانہ بنایا۔ اس علاقے میں مراکش، الجزائر، تیونس اور لیبیا سے آئے ہوئے مسلمان رہتے تھے۔ اسرائیل نے مسلم اوقاف کے ۱۳۵ مکانات کو بل ڈوزروں سے زمین کے برابر کر دیا۔ یہ وقف جنوبی افریقہ کے ایک دیندار بزرگ ابو مدین الغوث کے نام پہ قائم ہے۔ دو دن کے اندر اندر ان مکانوں کو مسمار کر کے ان کا ملبہ تک اٹھا دیا گیا اور ان کے مکینوں کو اٹھارہ گھنٹے روزانہ کے کرفیو میں صرف دو تین گھنٹوں کی مہلت دی گئی انہیں انتہائی بے کسی کے عالم میں اپنے گھروں کو خیرباد کہنا پڑا۔ یہ دل گرفتہ خانماں برباد ملحقہ گلی کوچوں میں بکھر گئے اور بعد ازاں نواحی دیہات میں پناہ گزین ہوئے۔ اس ایک مہم سے ساڑھے چھ سو خاندان متاثر ہوئے۔ مسمار ہونے والی ان عمارتوں میں دو مسجدیں بھی تھیں۔ چند یوم بعد اسی علاقے میں ایک جدید پلاسٹک فیکٹری کو جلا کر راکھ دیا گیا اور اس طرح ۲۰۰ مزدور جو دو سو خاندانوں کے کفیل تھے۔ بے روزگار ہو گئے اور فیکٹری کے مسلمان مالک کو کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔

دوسرے ہفتے اسرائیلی حکام اور یہود کی مذہبی تنظیموں نے مسجدِ اقصیٰ کی مغربی دیوار (جسے یہود دیوارِ گریہ کہتے ہیں) کے نواح میں ایک اور مہم کا آغاز کیا۔ اس مہم کا دائرہ کار آہستہ آہستہ وسط شہر کے مسلم علاقوں تک پھیل گیا۔ یہاں کے تین ہزار مکینوں کو تین دن کے اندر اندر اپنے گھر بار خالی کر دینے کا حکم دیا گیا۔

تیسرے ہفتے کے اختتام تک اسرائیل نے بیت المقدس کے عربوں پر سب سے زیادہ تباہ کن حملہ کیا۔ ۲۷ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیلی پارلیمنٹ نے بیت المقدس کی عرب حیثیت کو ختم کر کے اسرائیل کا جزو قرار دے دیا۔ اس کے ایک روز بعد وزارت داخلہ نے شہر کے تمام میونسپل اداروں کو ختم کر کے نظم و نسق عملاً یہودیوں کے حوالے کر دیا۔ یہ تمام اقدامات بین الاقوامی قانون اور اقوامِ متحدہ کے فیصلوں کے منافی تھے۔ ۲۹ جون کو ان احکامات کی عرب میونسپل حکام سے اسرائیلی فوجیوں کی نگرانی میں تعمیل کرائی گئی اس کے بعد یہودیوں نے مسجدوں اور کلیساؤں کی کھلی بے حرمتی شروع کر دی۔ اور عبادت کے اوقات میں یہودیوں کو سیر و تفریح کے لیے عبادت گاہوں کے اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ جس سے مسلمانوں اور عیسائیوں کو شدید جذباتی صدمہ پہنچا۔ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء کو "ھاآرتس" کی ایک خبر کے مطابق بریگیڈیئر شلومو غدرین

کے بریگیڈ نے مسجد اقصیٰ کے بیرونی حصہ میں عبادت کی اور اعلان کیا کہ اس جگہ یہودی معبد تعمیر کیا جائے گا۔ دنیا کے سب سے بڑے گرجا، کلیسائے نشور میں کھلی لوٹ کھسوٹ ہوئی۔ اور حضرت مریم کے مجسمہ سے انتہائی قیمتی موتی چرا لیا گیا۔ پادریوں کو زدوکوب کیا گیا۔ اور سب کچھ یہودی حکام کے سامنے ہوا۔

۸ر اگست کو "اسرائیل" کی وزارت مذاہب نے طے کیا کہ مغربی دیوار کے گرد جو رکاوٹ ہے اسے گرا دیا جائے۔ اور ۱۵ر اگست کو اسرائیلی افواج کا چیف ربی بریگیڈیر گورن اپنے ۵۰ سنے اور کچھ دوسرے یہودیوں کے ہمراہ قبۃ الصخرہ پر چڑھ گیا۔ ان سب کے ہاتھوں میں مذہبی کتابیں تھیں۔ وہ دو گھنٹے قبۃ الصخرہ میں رہے اور یوں مسلمانوں کے مقدس ترین مقام کی بے حرمتی کے مرتکب ہوئے۔ اسرائیل کے وزیر مذہبیات نے اعلان کیا کہ مسلمانوں کی یہ مسجد یہودیوں کی ملکیت ہے۔ اس پر جلد یا بدیر ہیکل تعمیر کر کے رہیں گے۔ صخرہ کو داؤد نے الیبوسین سے خریدا تھا۔ مسجد سے ملحقہ اسلامی اوقاف کی عمارتوں کو اس لیے مسمار کیا گیا ہے کہ یہودی معبد تعمیر ہو سکے۔ ۳۰ر جون ۶۷ء کو اسرائیل نے قدیم و جدید بیت المقدس کے درمیان حائل تمام فصیلوں کو ختم کر دیا۔ یہودی انجینئروں نے یافہ گیٹ کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا اور حصاروں کو بل ڈوزروں سے زمین کے برابر کر دیا۔

اگست ۷۰ء میں اسرائیلی فوجیوں نے مسجد اقصیٰ کے ایک دروازے کی چابیاں چھین کر اپنے قبضہ میں لے لیں۔ اور اسے یہودی سیاحوں کے لیے مستقل طور پر کھول دیا۔ مئی ۶۸ء میں بیت المقدس کے سابق میئر نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ: ۱۸ر اپریل ۱۹۶۸ء کو اسرائیلی حکام نے ایک نیا قانون جاری کیا جس کے تحت مزید مسلم املاک ضبط کر لیں۔ یہ املاک حرم شریف کی جنوب مغربی دیوار اور آرمینی محلہ کے درمیان ہیں۔ اور ان میں البراق، تمام مغربی محلہ اور باب السلسلہ کے سامنے کا علاقہ اور شرف محلہ شامل ہے۔ اور یہ قریباً ۲۰ ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں کل ۵۹۵ عمارتیں شامل ہیں۔ اور ان کی ضبطی سے ۶ ہزار مسلمان افراد بے گھر اور ۷۰۰ خاندان اپنی کاروباری جگہوں سے محروم ہو گئے۔ گارجین لندن کے نامہ نگار نے لکھا۔ یہ وشلم کے قدیم شہر سے متصل

ایکڑ اراضی پر تعمیراتی منصوبہ کے تحت قبضہ کرکے اسرائیلی حکمرانوں نے اقوام متحدہ کے منشور کی کھلی خلاف ورزی کی ہے۔ اقوام متحدہ نے گزشتہ سال جار رجولائی کو ہدایت کی تھی۔ کہ کوئی ایسا کام نہ کیا جائے، جس سے بیت المقدس کی عرب حیثیت متاثر ہو۔ لیکن اسرائیلیوں نے اسے قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔"

عیسائی مشن "یسوع کے حواری" کی رکن مسٹر میری تھیرلیس نے جو پانچ جون ۶۷ء کو بیت المقدس کے احسن کانونٹ میں موجود تھیں جسے زخمیوں کے لیے ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ یہود کے ظلم و ستم پر تفصیل روشنی ڈالی ہے۔ وہ ۷ر جون کو اپنی ڈائری میں لکھتی ہے:

"ہم زخمیوں کو فوری طبی امداد دینے کے سلسلہ میں گلیوں میں نکلے۔ ہر چہار سو طرف گولہ بارود کی بو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ اور ہر طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ معصوم و بے گناہ بچوں کی لاشیں —— خواتین کی لاشیں —— پانچ معصوم بچے بمباری سے مارے گئے تھے۔ اور ان کی نعشیں ٹکڑے ٹکڑے تھیں۔ ایک اور خاندان کے تین بچے ابھی زندہ تھے۔ ہم سٹریچر پہ لے کر انھیں ہسپتال کی طرف بڑھے لیکن انہوں نے دم توڑ دیا کئی مرتبہ ایسا ہی ہوا کہ ہم ہسپتال پہنچتے معصوم بچے دم توڑ دیتے ہیں خواب میں چل رہی تھی۔ ایک جگہ غیر مانوس بو نے ہمارے قدم روک لیے۔ بو کہاں سے آرہی تھی؟ میں نہیں جانتی —— میں نے ایک بند دروازہ کھولا۔ اور خوف سے پیچھے کی طرف گر گئی۔ لاشوں کا انبار —— ایک کے اوپر دوسری لاش —— میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اور اس کے باہر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگی۔"

"اسی دوران ایک یہودی سپاہی، جس میں انسانی ہمدردی کا جذبہ باقی تھا۔ ہمیں ملا۔ اس کا چہرہ پژمردہ تھا۔ میرے ساتھ آؤ، وہاں کچھ شدید زخمی لوگ ہیں۔" وہ ہمیں ہیرودگیٹ کے قریب الزاویہ الہند لے گیا —— یہ پاکستانی زائرین کا ہوسٹل تھا۔ بمباری نے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اور عمارت جل چکی تھی۔ تین خستہ کمروں میں ایک درجن سے زائد افراد شدید زخمی حالت میں پڑے تھے۔ ان کے جسم عجب انداز سے جل گئے تھے پیٹ پھٹے ہوئے

اور بازو کٹ گئے تھے، آہ —— اسرائیلیوں نے شہر میں مسلمانوں کی غریب ترین آبادی پر باب زریق کے قریب بھی خوب بم برسائے تھے —— اس علاقہ میں سینٹ این کا گرجا بھی تباہ ہو گیا تھا۔"

جمعہ، نو جون، ۶۷ء: "ہمارے پاس کوئی گاڑی اور ایمبولینس نہ تھی۔ ہم مُردوں کو دفنانا چاہتے تھے۔ آخر ہمیں ایک چھکڑا مل گیا۔ تین مرد نرسوں کے ساتھ میں اسے دھکیل کر ہسپتال کے دروازے تک لائی، اور ابھی ہم مسلم قبرستان نہیں پہنچے تھے کہ یہودی حکام چیف ربی وایان اور لیوی اشکول ایک کار میں آتے دکھائی دیئے۔ یہودیوں نے انھیں دیکھ کر تالیاں بجائیں۔ اور موٹروں کا یہ دستہ تیزی سے حرم شریف تک چلا گیا۔ عین اس موقعہ پر میں نے نعشوں سے چادر ہٹا دی۔ ایک یہودی سپاہی مشین گن سیدھی کرتے ہوئے چلایا: "انھیں ڈھانپ دو۔" اور میں نے نعشوں کے احترام میں کپڑا چھوڑ دیا۔ جب ہم قبرستان سے واپس لوٹے، میرے کپڑے خون آلود تھے، اور یہودی لڑکیاں ہاتھوں میں ریوالور لیے فتح کے نشہ میں لڑکھڑا رہی تھیں۔ اور قدامت پسند یہودیوں کا ایک گروپ تیزی سے ہیکل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس میں سے ایک نے رُک کر فرانسیسی میں ہمیں سلام کیا۔ اور فادر پال سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

> "میں آپ سے بہت باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان یہودیوں سے مایوس ہو چکا ہوں۔ یہ وحشی ہیں۔ دو سپاہیوں نے محض زیورات کے لیے میرے سامنے دو عورتوں کو گولی مار دی۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن پھر کبھی —— اور وہ اس ریلہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔"

ہم اپنے رفقاء برناڈٹ اور مونا کی خیریت دریافت کرنے کے لیے بیت لحم پہنچے۔ وہ دونوں بخیریت تھے۔ یہود نے بیت لحم پر آدھ گھنٹہ بمباری کی۔ اور مونا جس ہسپتال میں کام کرتی تھی۔ وہ بھی بمباری سے محفوظ نہیں رہا۔ تیس افراد مارے گئے۔ شہری خوف زدہ تھے اسرائیلیوں نے پہنچتے ہی کاروں پر لاؤڈ اسپیکروں سے اعلان کرنا شروع کر دیا۔

> "تمہارے پاس صرف دو گھنٹے ہیں۔ جریکو اور عمان کی طرف نکل جاؤ۔ ورنہ تمہارے گھروں پر بمباری کی جائے گی۔"

اور شہری بھاگ گئے تھے۔ واپسی پر ہمیں سڑک کے کنارے دو عرب زخمیوں نے بتایا۔۔

دو تین دن سے دھوپ میں پڑے تھے۔ اسرائیلی گاڑیاں ان کے پاس سے گزر رہی تھیں۔ لیکن کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ انھیں ہم ہسپتال لے آئے۔"

۱۲، ۱۳، اور ۱۴ رجون — ہم برادر زا اور سسٹرز کی خیریت دریافت کرنے کے لیے ناصرہ، جنین، نابلس اور نواحی دیہات میں گئے۔ ہر جگہ ایک ہی سا منظر تھا۔ تباہی، خوف، اذیت۔ نابلس پر یہود نے نیپام بم برسائے تھے۔ یہودی سپاہی اور جوان ہر جگہ لوٹ مار کر رہے تھے۔ چور، لٹیرے اور قاتل — نابلس میں زیتون کے درختوں کے جھنڈ میں کئی سو خاندانوں کو دیکھا۔ یہ سب قلقیلیہ کے تھے۔ بیس ہزار افراد جنھیں قلقیلیہ واپس جانے سے روک دیا گیا تھا۔ ہم نے قلقیلیہ جانے کا فیصلہ کر لیا — قلقیلیہ — ایک دردانگیز منظر، قصبہ کو ڈائنامیٹ کیا جا رہا تھا۔ اسرائیلی شہر کو لوٹنے کے لیے پل پڑے تھے۔ اور چند قدم آگے، اسرائیلی فوجی نواحی دیہات کے باسیوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم نے واپسی ہی میں عافیت سمجھی — یروشلم میں چار سو خاندانوں کو بے گھر کیا جا رہا تھا۔ یہ بتائے بغیر کہ ان کا مستقبل کیا ہے۔"

قلقیلیہ کی آبادی کسی طور ۱۶ ہزار سے کم نہیں تھی۔ اس میں ۷ ہزار افراد ۱۹۴۸ء کی جنگ کے مہاجر تھے۔ جنگ کے دوران اس کی کچھ آبادی قصبہ سے چلی گئی تھی۔ اور صرف پانچ فیصد عمارات کو نقصان پہنچا تھا۔ لیکن ۷ رجون کو ۴ بجے شام ایک اسرائیلی افسر قصبہ میں داخل ہوا اور لوگوں کو فوراً شہر خالی کرنے کا حکم سنایا۔ ۳۰، ۴۰ اسرائیلی بسیں اس کے پیچھے تھیں۔ وہ سب کو چند کلومیٹر دور ازون لے گئیں۔ لیکن جب قلقیلیہ کے میئر الحاج حسین صابری نے جنرل دایان سے مل کر واپس جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو "اسرائیل ریڈیو" نے اس درخواست کی منظوری کی خبر سنائی۔ اور جب چار ہزار شہری گھروں کو واپس آئے "تو شہر لٹ چکا تھا۔ دو تہائی قصبہ کو ٹینک اور بل ڈوزر پیوند خاک کر چکے تھے۔ اور ایک تہائی کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا گیا تھا۔

۴ رجولائی کو باوجود اس کے کہ ہمارے پاس اسرائیلی وزارت خارجہ کے اجازت نامے تھے۔ کہ ہمیں کہیں نہ روکا جائے۔ کئی کوششوں کے بعد لطرون کے راستہ پر جانے میں کامیاب ہو گئے۔ لطرون کے نواح میں تین دیہات بیت نوبا۔ یالو اور عمواس کو بارود بلڈوزروں سے پیوند زمین کر دیا گیا تھا، ۶ رجون کو یہودیوں نے دیہات خالی کرنے کا حکم دیا۔ اور سات

کی شام کو باقی ماندہ افراد کو آخری انتباہ کیا۔ کہ وہ ساڑھے چار بجے تک نکل جائیں۔ ورنہ انہیں زندہ جلا دیا جائے گا۔ اس علاقہ کا قصور صرف یہ تھا۔ کہ ۱۹۴۸ء میں یہاں ۸۰۰ یہودی مارے گئے تھے۔ دیہاتیوں نے احتجاج کیا تو انہیں کہا گیا "حسین کے پاس جاؤ"۔ دیہات کو بارودی سرنگوں اور ڈائنامیٹ سے اڑا دیا گیا۔ اور ۲۶ اور ۲۷ جون کی درمیانی شب بلڈوزروں سے پیوندِ خاک کر دیئے گئے۔ اس طرح چار ہزار افراد بے گھر ہو گئے۔

حبرون کے علاقہ میں سوریف کے گاؤں کو یہ کہتے ہوئے خالی کر دیا گیا "حساب چکانے کا وقت آ گیا ہے۔ تم بدمعاش ہو، دس منٹ کے اندر گاؤں خالی کر دو۔" پانچ ہزار افراد کا یہ گاؤں دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہو گیا۔ ایک بزرگ پیچھے رہ گیا اسے سب مشین گنوں کی بوچھاڑ سے مار گرایا گیا۔

۱۷ جون کو چار بجے صبح دیوارِ گریہ کے نواحی علاقہ المغاربہ کے چار سو خاندانوں کو جو دو ہزار افراد پر مشتمل تھے۔ کہا گیا۔ کہ وہ فوراً علاقہ خالی کر دیں۔ بلدیہ نے ان کی آبادکاری کا مطالبہ کیا۔ لیکن بلدیہ توبے اثر کر دی گئی تھی اس لیے اُن میں سے ماسوا اُن کے جو بعض دوسرے علاقوں میں رشتہ داروں کے گھر پناہ لے سکے باقی سب کھلے آسمان تلے پڑے رہے اور آخر دریائے اردن کے مشرق کنارے سے ہجرت کر گئے۔ اور یہودیوں نے وقف الموحدین کی عمارات کو بتدریج بلڈوزروں سے پیوندِ خاک کرنا شروع کر دیا۔ فادر پال گوتھیئر نے اسرائیلی حکام کے نام ۱۸ جون ۱۹۶۷ء کو جو یادداشت بھیجی۔ اس میں اس نے کہا تھا۔ "مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلیوں کے داخلہ کے دن سے تمام موٹر کاریاں چوری ہو چکی ہیں۔ سینکڑوں دکانیں لٹ گئی ہیں۔ کتنی ہی نجی دکانات کو تباہ کر دیا گیا ہے اور سپاہیوں نے گھڑیوں، ٹرانسسٹروں کے لیے افراد کو بے دریغ قتل کیا ہے۔ اُن کی وحشت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ نابلس میں جب ایک شخص نے لوٹ مار میں مزاحمت کی، تو میاں بیوی دونوں کو شدید زخمی کر دیا گیا عیاں کے پیٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن سپاہیوں نے اسے مجبور کیا۔ کہ وہ اپنی بیوی کو اٹھائے اور اپنے بچوں سمیت گھر سے نکل جائے۔ مگر وہ بیوی کو کندھوں پر اٹھا کر کھڑا ہی ہوا تھا۔ کہ گر گیا اور اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ اس نے بچوں کو اپنے گرد بلایا اور سپاہیوں سے کہا۔ "ہمیں گولی مار دو"۔ ایک اردنی بچہ چاکلیٹ لیے جا رہا تھا۔ یہودی سپاہیوں نے اس سے چھیننا چاہا۔ وہ خوف زدہ ہو کر بھاگا لیکن ایک سپاہی نے پیچھے سے

اس کی گردن کا نشانہ لیتے ہوئے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اسی قسم کے واقعات یروشلم میں لاطینی مشن کی کیتھولک ننز نے اپنی یادداشت میں لکھے ہیں جو انھوں نے ۲۴ر جون کو اسرائیل کے حکام کو بھجوائی۔ جبکہ یروشلم کی کیتھولک آرچبشپ انفارمیشن نے ۲۱ر جولائی کو جو رپورٹ پبلش کی اس میں بتایا گیا ہے کہ اسرائیلی سپاہ نے مذہبی مقامات کے تقدس کو پامال کر دیا ہے — کلیسائے نشور اور مقدس گرجا میں وہ سگریٹ نوشی کرتے ہیں اور نوجوان بوڑھے عشق و محبت کی داستانیں دہراتے ہیں۔ شہر کی صفائی کے بہانے شامی کیتھولک گرجا، ٹیرا سانتا سکول، سینٹ لوئی ہسپتال اور کرسچین برادرز سکول کو تباہ کر دیا گیا ہے اور عرب عیسائی اپنے اپنے مقدس گرجاؤں کی بے حرمتی دیکھ کر کڑھتے اور دعائیں مانگتے ہیں کہ مسلمان واپس آ جائیں کیونکہ انھیں "تقدس کا احساس تو تھا"

جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل چار جولائی ۶۷ء کی قرارداد کی کئی بار توثیق کر چکی ہے کہ بیت المقدس کی سابقہ حیثیت میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ لیکن یہودی اس موقعہ کو غنیمت اور سنہری قرار دے رہے ہیں۔ اور اسلام کے خلاف بین الاقوامی یہودیت اور صیہونیت کی اسرائیل کو پوری حمایت حاصل ہے۔ چنانچہ جنگ کے فوراً بعد دس ہزار یہودی رضا کار تل ابیب پہنچے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں امریکہ نے بھی اس بات کا اعتراف کیا کہ اکثر امریکی یہودی اسرائیل کی باقاعدہ افواج میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ عالمی صیہونیت ایک ارب امریکی ڈالر سرمایہ جمع کر چکی ہے۔ جون ۶۷ء کی جنگ کے بعد سے تل ابیب اور یروشلم میں بیس کے قریب کانفرنسیں ہو چکی ہیں۔ جن میں دنیا کے ہر کونے سے صیہونی نمائندے شریک ہوئے اور انھوں نے مشرق وسطیٰ میں صیہونی مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ذرائع و وسائل پر غور کیا۔ یہود کے مذہبی رہنما دنیا بھر میں منتشر یہودیوں کو یہ بشارت دے رہے ہیں کہ "اللہ تعالےٰ نے فرات سے نیل" تک کی موعودہ زمین ان پر کھول دی ہے اور مسیح موعود کی آمد کا وقت آ گیا ہے۔ واضح رہے کہ اب تک یہود کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ ہیکل دوبارہ اس وقت تعمیر ہوگا۔ جب مسیح موعود کا ظہور ہوگا۔

جولائی ۶۸ء کے پہلے ہفتے مشہور برطانوی جریدہ اکنامسٹ نے اپنے نامہ نگار متعینہ اسرائیل کا ایک خصوصی مقالہ شائع کیا، جس میں بتایا گیا کہ "بیت المقدس میں واقع تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ یہودی کی عبادت کی جہاں دیوار گریہ کے سامنے سے ہٹ ہوئے

اور مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ اور عرب دُور کھڑے سب کچھ خاموشی اور بے بسی سے دیکھتے رہتے ہیں مُبصرین کا کہنا ہے کہ قدیم و جدید بیت المقدس کے درمیان جو دیوار اب بظاہر مٹ گئی ہے۔ عربوں اور یہودیوں کے دلوں میں از سرِ نو تعمیر ہو رہی ہے عرب جب نماز ادا کر رہے ہوں۔ یہودیوں کے نفرت انگیز قہقہے خلل انداز ہوتے اور اس شہر کے صدیوں پرانے شہری عربوں اور یہودیوں کے درمیان رنجش کے جذبات گہرے کر جاتے ہیں۔ اس وقت شہر میں یہودیوں کی تعداد دو لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے۔ جبکہ ستّر ہزار عربوں میں سے پچیس ہزار بے گھر ہو کر ترکِ سکونت کر چکے ہیں، جن میں عیسائی بھی شامل ہیں۔ شہر چھوڑ کر جانے والے عربوں کی تعداد بہت کم ہے۔ قدیم بیت المقدس کے باشندوں کی شہری حیثیت ایک طرفہ تماشا ہے۔ وہ بیت المقدس کے شہری لیکن اردن کی رعایا سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ انھیں تمام بلدیاتی حقوق اور مراعات حاصل ہیں۔ اس کے باوجود انھیں نہ تو اسرائیلی ریاست کا باشندہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور نہ ہی انھوں نے اس حق کا مطالبہ کیا ہے، حالانکہ وہ پچھلے ایک سال سے اسرائیل میں زندگی گزار رہے ہیں۔"

اکنامسٹ نے مزید کہا کہ

"نظر یہ آتا ہے کہ اسرائیلی حکام اور یہودی عوام فوجی قوت اور پیسے کے بل پر عربوں کی حمایت حاصل کرنا چاہتے ہیں، لیکن ابھی تک اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اور نہ ہی عربوں میں کوئی ایسا لیڈر ہے جو انھیں منظّم کر سکے۔ نتیجتہً وہ پریشان و مضطرب ہیں۔ چند علماء نے متحد ہو کر اسرائیلیوں کے حکام کی خلاف ورزی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن اس جُرم کی پاداش میں عربوں کی شرعی عدالتوں کے سربراہ کو اسرائیلی مقبوضہ علاقہ سے باہر دھکیل دیا گیا۔ اور یہ پُوری طرح ختم ہو چکا ہے۔ اسرائیلی اقتدار کی مخالفت عربوں کے لیے مشترکہ میراث کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ لیکن وہ کسی متفقہ منصوبے کے بغیر مزید ایثار کے لیے ہرگز تیار نہیں۔

کے باوجود مشرقی بیت المقدس میں یہودی آباد کاروں کی تعداد بہت محدود ہے۔ اس علاقے میں یہودیوں کے بائیس معبد تھے، جن میں سے صرف آٹھ کو آباد کیا جا سکا ہے۔ نئے مکانوں کی تعمیر کا کام بہت دشوار ہے۔ دیوارِ گریہ سے متصل خطہ ابھی تک کھنڈر پڑا ہے۔ اور پرانی یونیورسٹی میں طلبا کی جگہ پرندوں نے گھونسلے بنا لیے ہیں۔ بیت المقدس کے مستقبل سے متعلق دو اداروں میں شدید کشمکش جاری ہے۔ ایک ادارہ یروشلم کو بطور مقدس شہر برقرار رکھنے کے حق میں ہے۔ مگر دوسرا اسے تمام عربوں سے خالی کرا کر خالص صیہونی شہر بنا دینا چاہتا ہے۔ بیت المقدس پر اسرائیلی قبضے کے فوراً بعد جو مردم شماری کی گئی۔ اس میں عرب باشندوں کو شناختی کارڈ جاری کیے گئے تھے، مردم شماری چونکہ عجلت میں ہوئی تھی۔ اس لیے کئی عرب گھرانے ان کارڈوں سے محروم رہے۔ اور آج وہ گوناگوں مشکلات کا شکار ہیں۔ ان کارڈوں کے بغیر وہ ایک سے دوسری جگہ کا سفر کر سکتے اور نہ ہی خاندان کے دوسرے افراد کو واپس بلا سکتے ہیں، عربوں نے جان لیا ہے کہ اسرائیلی رضا کارانہ طور پر اس شہر سے دست بردار نہیں ہوں گے۔ اگرچہ وہ مادی امداد کے لیے قاہرہ کی طرف دیکھتے ہیں، لیکن "صوت القاہرہ" سے مایوسی کے سوا انھیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کو دنیائے اسلام کا المناک ترین سانحہ پیش آیا۔ اس روز ساڑھے تین گھنٹے تک مسجدِ اقصیٰ میں آگ بھڑکتی رہی، جس سے جنوب مشرقی جانب یعنی قبلے کی طرف چھت کا بڑا حصہ گر پڑا۔ مسجد کا یہ حصہ عین اس مقام پر تھا۔ جہاں سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفرِ معراج کا آغاز فرمایا تھا، اس کے قریب ہی البراق (دیوارِ گریہ) ہے۔ جو محفوظ رہی۔ سلطان صلاح الدین غازیؒ کا یادگار منبر جل کر راکھ سیاہ ہو گیا۔ اور دوسرے متعدد نوادر بھی آگ کی نذر ہو گئے۔ یہ آگ اسرائیل نے لگوائی تھی۔ گو اسرائیل نے اپنے جرم کو چھپانے کے لیے ایک شخص روھن کو گرفتار کیا۔ اور اس پر مقدمہ چلایا، لیکن اسے جو معمولی سزا دی گئی اس سے کوئی شبہ نہیں رہا۔ کہ اس کے پیچھے صیہونی عزائم کارفرما تھے۔ جو اس جگہ ہیکل کی تعمیر کے خواب صدیوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس آتش زدگی کے بعد سرزمین قدس ایک بار پھر مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بن گئی اپنی بے بسی کے باوجود اسرائیل کے خلاف گلیوں میں نکل آئے تھے۔

مزید برآں سارے عالم اسلام میں غیض و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن تا حال مسجد اقصٰے کے بام و در اس ایوبی ؒ کے منتظر ہیں، جو اسے پھر کفار کے نرغہ سے نجات دلا کر اس کی حرمت بحال کرے۔ یہ یہودیوں کے عزائم کا اندازہ ہفت روزہ ٹائم کی اشاعت ۳۰ جون ۱۹۶۷ء کی اس عبارت سے ہوتا ہے:

"اسرائیل کے لیے، بیت المقدس کے اردنی حصے پر قبضہ سے جس کی بدولت ہزاروں عقیدت مند یہودی صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ دیوارِ گریہ کے سامنے حاضر ہوئے۔ ایک دلچسپ مذہبی سوال پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس دیوار پر جو ہیکل دوم کا حصہ ہے، قبضے کے بعد، کیا وہ وقت آ گیا ہے کہ ہیکل سوم تعمیر کیا جائے۔ سن ستر عیسوی میں رومیوں کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی کے بعد سے آج تک کٹر یہودی ہفتے میں چار مرتبہ خدا کے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگتے رہے ہیں۔ کہ ان کے بُرے دن پھر جائیں۔ اور بھلے دن لوٹ آئیں۔"

یہ دعائیں دلیل ہیں۔ ہیکل کی بازیابی کی۔ صیہونیت ایک لادینی تحریک تھی۔ لیکن اس کی اساس یہودیوں کی وہ دعائیں تھیں۔ کہ وہ ایک مرتبہ پھر فلسطین میں آباد ہو جائیں۔ تاکہ ایک نیا ہیکل تعمیر کر سکیں۔ تعلیم یافتہ یہودیوں میں ہیکل کی تعمیر نو کے مسئلے پر ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے عظیم فلسفی موسیٰ بن میمون نے یہودی مجموعۂ قوانین میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔ یہودیوں کی ہر وہ نسل جو ہیکل کو دوبارہ حاصل کرلے۔ آلِ داؤد میں سے رہنما تلاش کرے، صیہونیت کے دشمنوں کو تباہ کرے۔ ہیکل کی تعمیر نو کی مجاز ہوگی۔ موسیٰ بن میمون کے زمانے میں بہت سے ربیوں نے بد دلی سے فیصلہ کیا۔ کہ ہیکل کی تعمیر نو کے لیے مسیحا کا انتظار ضروری ہے، اسی دلیل کے پیش نظر اسرائیل کے سب سے بڑے ربی نے بیت المقدس پر قبضہ کے بعد یہ فتویٰ دیا۔ کہ کوئی یہودی ہیکل میں داخل نہ ہو۔ لیکن اس فتویٰ پر کوئی عمل نہیں ہوا۔ بلکہ خود ربی اعظم نے خلاف ورزی کی۔ یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں میں اس مسئلہ پر اختلاف ہے کہ ہیکل کی تعمیر کے لیے مسیحا کے ظہور کا انتظار کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ ان کا کہنا ہے۔ کہ اس سلسلے میں کئی مشکلات درپیش ہیں۔ پہلی مشکل تو یہ ہے کہ یہودی قانون کی رو سے

ہیکل کا انتظام صرف وہی کاہن کر سکتا ہے، جو حضرت موسیٰؑ کے بھائی ہارونؑ کی اولاد سے ہو۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہیکل کا اس کے اصلی مقام پر تعمیر کرنا ازبس ضروری ہے۔ اور ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کے قبۃ الصخرہ کو مسمار کیا جائے، جو اس مقام پر ہے۔ جہاں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ عرب دشمنی کے باوجود بعض کٹر یہودی دوسرے مذاہب کی عبادت گاہ کو مسمار کرنے کے مخالف ہیں۔ لیکن اکثر یہودیوں نے ہیکل کی تعمیر نو کے متعلق مذہبی دلائل تلاش کر لیے ہیں۔۔ وہ کہتے ہیں کہ اسرائیل ظہورِ مسیحا کے عہد میں داخل ہو چکا ہے اور آج اسرائیل کے مذہبی پیشوا ابھی یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ عربوں پر ہماری فتح ہمیں اس مسئلے سے ماورا لے گئی ہے۔ لیکن مسلمانوں کی عبادت گاہ کے متعلق کیا خیال ہے؟ بلا شبہ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے لیکن کون جانے؟ شاید کوئی زلزلہ اس مسئلے کو حل کر دے۔"

یہودی ایک زلزلے کے انتظار میں ہیں، جو مسلمانوں کی عبادت گاہ کو مسمار کر دے تاکہ اس کے کھنڈرات پر ہیکل سوئم تعمیر کیا جا سکے۔ یہ زلزلہ یا تو حوادث سماوی کے باعث آ سکتا ہے یا یہودیوں کی سازش سے ـــــ اور شاید ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کا حادثہ فاجعہ بھی اسی زلزلہ کا پیش خیمہ تھا؟

۲۷ جون ۶۷ء کو اسرائیلی پارلیمنٹ کی طرف سے یہ فیصلہ صادر ہوا کہ بیت المقدس کے اس شہر کو جس پر ۷ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے قبضہ کیا ہے بیت المقدس کے سابقہ یہودی شہر کے اندر مدغم کر دیا جائے اور دونوں حصوں کو ایک ہی شہر قرار دے کر اسے اسرائیل کا دارالحکومت بنایا جائے۔ اس قانون کے صدور کے دو روز بعد اسرائیل کی قابض فوج نے بیت المقدس کی بلدیہ کو توڑ دیا اور بلدیہ کی عمارات پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کے بعد اسلامی اوقاف کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور شہر کے باہر اوقاف کی ۴ ہزار ایکڑ اراضی پر قبضہ کر لیا۔ شہر کے اندر اسرائیلی حکام اب تک ۵۹۵ عمارتوں پر قبضہ کر چکے ہیں۔ جن میں ۱۰۴۸ رہائشی فلیٹ اور ۴۳۷ دکانیں ہیں۔ ان دکانوں پر ۶ ہزار عرب باشندے کام کرتے تھے۔

اسرائیلی پارلیمنٹ کے اس فیصلہ میں شہر کی حدود متعین نہیں کی گئی تھیں چنانچہ

شہر کے فوجی حکام نے اس فیصلہ کی رُو سے بیت المقدس کے شمال مغرب میں واقع دو شہروں رام اللہ اور البیرہ کو اور جنوب مشرق میں واقع شہر بیت لحم اور بیت جالا اور بیت ساحور کی نواحی بستیوں کو بھی اس میں شامل کر لیا ہے۔

اسرائیل نے بیت المقدس کے عربی اور اسلامی رنگ کو محو کرنے کے لیے جو مختلف اسکیمیں تیار کی ہیں ان میں سے ایک فادر اسکیم ہے جس کے تین مقاصد بیان کیے گئے ہیں : "وسیع تر، خوب تر اور صاف تر بیت المقدس کی تعمیر"۔ فادر اسکیم کے تحت شہر کے مختلف حصوں کو گرایا جا رہا ہے۔ مرحلہ اول میں شہر کے مشرقی حصے میں ۳ ہزار یہودی خاندان آباد کیے جا رہے ہیں۔ اور بیت المقدس کی بلدیہ کے اسرائیلی چیئرمین ٹیڈی کویٹ کے اعلان کے مطابق ۱۹۷۵ء تک ہر سال بیت المقدس میں دس ہزار یہودی خاندان بسائے جائیں گے۔ جن کی کل تعداد ایک لاکھ بیس ہزار افراد ہو گی۔ اس غرض کے لیے شہر کے ارد گرد جبل المکبر سے لے کر جبل الزیتون اور سلوان تک نئے یہودی محلے تعمیر کیے جا رہے ہیں اور اس امر کا خیال رکھا جا رہا ہے کہ بوقتِ ضرورت ان محلوں کو فوجی کیمپوں میں بھی تبدیل کیا جا سکے۔

یہودیوں کو آباد کرنے کے لیے اسرائیل کی کوئی اسکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہاں سے عربوں کو نہ نکالا جائے۔ چنانچہ اسرائیل کی طرف سے برابر عربوں پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے تاکہ وہ ترکِ وطن پر مجبور ہوں — جون ۱۹۶۷ء سے اب تک اسرائیل نے نئے مقبوضہ علاقوں سے ۴ لاکھ ۸۰ ہزار عربوں کو نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بین الاقوامی رائے عامہ کے احتجاج کے باوجود اسرائیل نے اس تعداد میں سے صرف ۲۰ ہزار افراد کو واپس آنے کی اجازت دی ہے۔ مگر انہیں بھی طرح طرح کے الزامات کے تحت ستایا جا رہا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ فدائیین کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں اور کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ اسرائیل کے امن کے لیے خطرہ پیدا کرتے ہیں۔

بیت المقدس کے علاوہ دوسرے عرب علاقوں بھی اسرائیل وسیع پیمانے پر تصرفات کر رہا ہے۔ ان مختلف علاقوں میں جن میں شام کی جولان کی پہاڑیاں بھی شامل ہیں اب تک اسرائیل ۲۰ نئی کالونیاں تعمیر کر چکا ہے۔ اور اب اسرائیل کی

وزارتی کمیٹی نے مزید کالونیاں قائم کرنے کے احکام جاری کر دیے ہیں جو وادی اردن میں قائم کی جائیں گی اور نائب وزیر اعظم کے نام پر بیقال ایلن اسکیم کے تحت دریائے اردن کے پورے کنارے پر کالونیوں کا ایک سلسلہ قائم کیا جائے گا جو ”عظیم تر اسرائیل“ کے لیے محافظ پٹی کا کام دے گا عسکری اہمیت کے علاوہ ان کالونیوں کی اقتصادی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ یہ علاقہ سطح سمندر سے نیچے ہونے کی وجہ سے سبزیوں اور پھلوں کی کاشت کے لیے انتہائی موزون ہے۔

جولان کی پہاڑیوں پر اسرائیل ۱۳ کالونیاں تعمیر کر چکا ہے۔ جن پر اس نے ۶ ملین اسٹرلنگ پونڈ صرف کیے ہیں۔ ۱۸ ملین اسٹرلنگ پونڈ کی نئی اسکیم میں اس کے پیش نظر ہیں جن میں سبزیوں کو ڈبوں میں بند کرنے کے لیے متعدد کارخانوں کا قیام ہے۔ ان پہاڑیوں پر ۴ ہزار یہودی خاندان آباد کیے جا رہے ہیں۔ ان سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسرائیل اس علاقے کو قطعاً ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

سینا اور غزہ کے علاقہ میں بھی کالونیاں بچھائی جا رہی ہیں۔ اب تک سینا کے شمال اور غزہ کے جنوب میں تین کالونیاں تعمیر ہو چکی ہیں۔ جنہیں کیبوٹز کہا جاتا ہے۔ رفح کے جنوب میں دو کالونیوں کے لیے نشان دہی ہو چکی ہے۔ ان میں سے ایک کا نام ”ناحال سینا“ ہے۔ جسے زرعی کالونی کی حیثیت دی جائے گی اور غیر موسمی پھل پیدا کیے جائیں گے اور دوسری ”ناحال یام“ ہے، جسے ”ماہی گیر کالونی“ کا عنوان دیا گیا ہے اور پانچ سو ٹن سالانہ مچھلی مہیا کرنے کی اسکیم تیار کی گئی ہے۔

غزہ کے بے روزگار عربوں کو روزگار مہیا کرنے کے بہانے اسرائیل نے ہوشیاری کے ساتھ غزہ عربوں سے خالی کروانا شروع کر دیا اور ان عربوں کو عریش کے علاقہ میں بسایا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس طرح وہ غزہ میں مزید یہودی خاندان آباد کر سکے، اور اگر عریش واپس مصر کو دینا پڑے، تو یہ عرب مصر کے حصہ میں آئیں نہ کہ اسرائیل کے حصہ میں۔ اسرائیل کی اس اسکیم سے دس ہزار عرب متاثر ہوں گے۔

یہ وہ چند اسکیمیں ہیں جن پر اسرائیل نے عملدرآمد شروع کر رکھا ہے اور ابھی لاتعداد ایسی اسکیمیں کا غذوں کے اندر تیار ہو چکی ہیں۔ جن پر وہ آئندہ عملدرآمد کرنا چاہتا ہے اور اپنے اس قدیم خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا چاہتا ہے جس میں اسرائیل کی حدود مِنَ الْفُرَاتِ اِلَی النِّیْلِ (فرات سے نیل تک) اسے نظر آ رہی ہیں۔

باب یازدہم

نواحی شہر اور قصبے

بیت المقدس کے علاوہ نواحی بستیوں اور اس علاقے ہیں جسے جنگ ۶۷ء کے بعد یہودیوں نے غصب کیا ہے۔ سینکڑوں مقدس مقامات ہیں۔ جو اہلِ ایمان کی عقیدتوں کا مرکز ہیں۔ اس باب میں ان مقامات کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے:۔

بیت اللحم

بیت المقدس سے چھ میل جنوب میں حضرت مسیح کی ولادت گاہ ہے۔ یہاں اس کھجور کے درخت کا ایک حصہ اب تک کھڑا ہے، جس کا پھل حضرت مریمؑ نے کھایا تھا اور جس کا قرآن میں تذکرہ آیا ہے کہ اس درخت کو ہم نے بطور معجزہ پیدا کیا حالانکہ اس علاقہ میں کھجور کبھی نہیں ہوتی۔ یہاں حضرت داؤدؑ کا مزار بھی ہے۔ بیت المقدس سے بیت اللحم آئیں تو نصف راستہ طے کرنے پر حضرت یوسفؑ اور بن یامین کی والدہ حضرت یعقوبؑ کی اہلیہ راحیل کا خوب صورت مقبرہ آتا ہے۔ فتح بیت المقدس کے بعد یہاں کے نصاریٰ نے بھی خلیفۂ اسلام کی اطاعت قبول کر لی۔ حضرت عمرؓ یہاں تشریف لائے اور ایک جگہ نماز ادا کر کے اسے مسجد کی حیثیت دے دی۔ جس پر بعد میں مسلمانوں نے ایک خوبصورت مسجد تعمیر کر لی۔

ناصرہ

طبریہ سے تیرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ حضرت مریمؑ یہیں کی رہنے والی تھیں اور حضرت عیسیٰؑ بھی یہیں رہے۔ یاقوت لکھتا ہے:

"جب لوگوں نے حضرت مریمؑ پر تہمت لگائی تو وہ یوسف کے
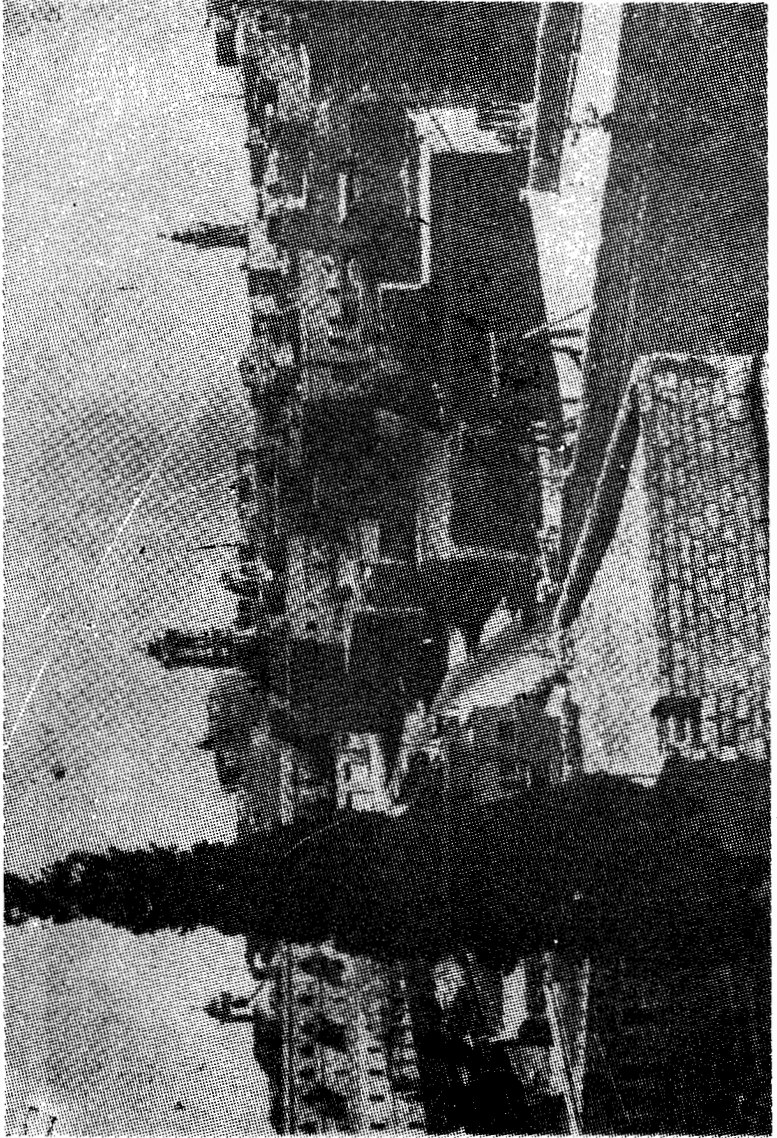
ساتھ مصر کو ہجرت کر گئیں۔ اور تیرہ سال بعد آ کر اسی قصبہ میں مقیم ہوئیں۔ نصاریٰ کی نسبت اسی قصبہ سے ہے۔"

رام اللہ

مؤرخین کا کہنا ہے کہ یہ شہر سلیمان بن عبد الملک نے بسایا اور جامع دمشق کے مقابلہ کی خوبصورت جامع مسجد تعمیر کی۔ ابن بطوطہ اسے جامع ابیض کا نام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس مسجد میں قبلہ کی طرف ایک مقام ہے۔ جہاں تین سو پیغمبر مدفون ہیں۔ اس کے قریب ہی حضرت صالحؑ کا مزار ہے۔

حبرون

بیت المقدس سے چھ فرسنگ جنوب کی طرف واقع ہے۔ عرب اسے مشہدِ خلیل کہتے ہیں، اسی شہر کی جامع مسجد میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کی قبریں ہیں۔ یہ قبریں ایک قطار میں بنی ہوئی ہیں اور ہر صاحب کی قبر کے برابر ان کی بیوی کی قبر ہے۔ ہر قبر کا درمیانی فاصلہ دس دس ہاتھ ہے۔ مسجد کی چار دیواری کے باہر ایک غار میں حضرت یوسف کا مقبرہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی سنتِ مہمان نوازی کو جاری رکھنے کے لیے زائرین کے مفت قیام و طعام کی خاطر ایک مسافر خانہ ہے۔ جس کے اخراجات صحابیٔ رسولؐ تمیم الداریؓ اور والیٔ کرجستان النتیا العادل کے اوقاف سے پورے ہوتے ہیں۔ ناصر خسرو کے بیان کے مطابق حرم کی پیمائش ۱۹۷ × ۱۱۱ فٹ اور بلندی ۴۰ فٹ ہے۔ روایت ہے کہ حرم کی زمین حضرت ابراہیمؑ نے حضرت سارہؓ کے انتقال پر خریدی تھی۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی قبر کے گرد جو احاطہ ہے۔ وہ وحیِ الٰہی کے ذریعے حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کرایا۔ یہودیوں نے جنگ ۶۷ء کے بعد سے حرمِ خلیل کو عجائب گھر میں تبدیل کر دیا ہے۔ بعض روایات کے مطابق اس حرم میں ستر ہزار انبیاء مدفون ہیں۔

سیّدنا موسیٰؑ

بیت المقدس سے ۲۵ میل شمال میں واقع ہے۔ یہاں حضرت موسیٰؑ کا مزار ہے۔
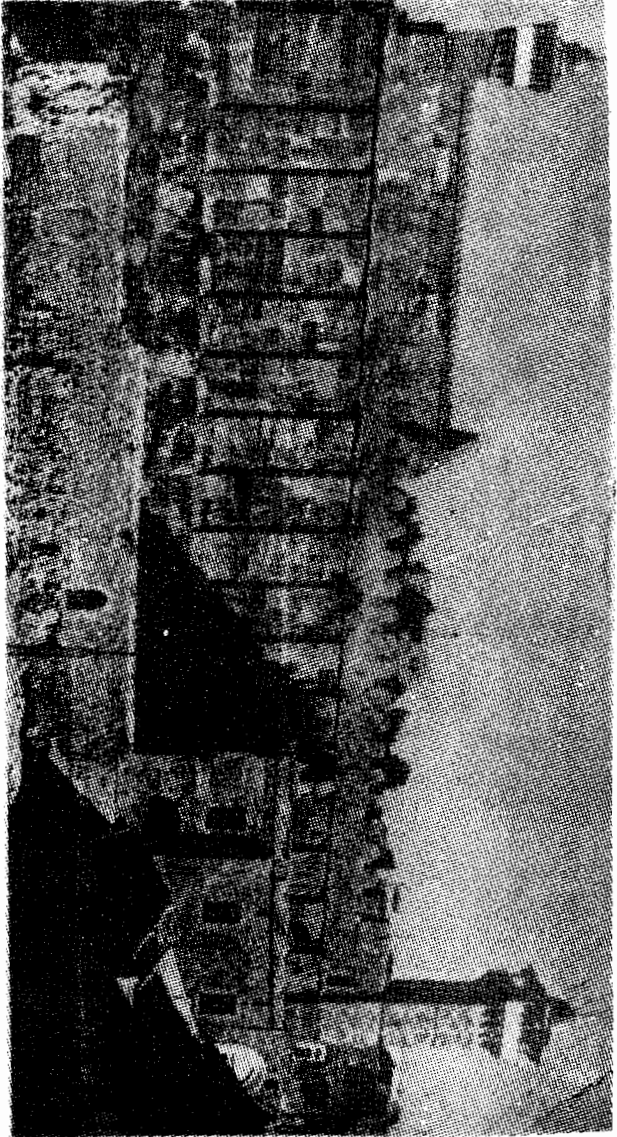
حبرون میں حرم خلیل اللہ جس کے تہ خانہ میں حضرت ابراہیمؑ حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کے مزارات ہیں اسرائیلیوں نے اسے عجائب گھر میں تبدیل کر دیا ہے

اور سلطان صلاح الدین کے عہد سے ماہِ محرم میں مزار سیّدنا موسیٰؑ پر ہفتہ بھر میلہ لگتا ہے، جس میں اہلِ عرب فنِ حرب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

طبریہ

یہاں حضرت ابوہریرہؓ اور لقمان حکیم کے مزارات ہیں؛ انبیاء کی مسجد ہے۔ حضرت شعیبؑ، اور ان کی بیٹی زوجہ موسیٰؑ، یہودا اور روبیل کی قبریں ہیں۔ مزید براں ستر پیغمبر یہاں مدفون ہیں، جنھیں یہودیوں نے شہید کیا۔ بعض لوگ حضرت ابوعبیدہؓ کی قبر بھی یہیں بتاتے ہیں۔

کفرکنا: حضرت یونسؑ اور ان کے والد کا مدفن ہے۔

اعبلین: یہاں حضرت ہودؑ اور حضرت عزیزؑ کا مقبرہ ہے۔

اریحا

اریحا (جریکو) بیت المقدس سے بارہ میل مشرق میں ہے۔ اس کے قریب ایک غار میں حضرت مریم پناہ گزین رہیں۔ اسی غار میں ان کی والدہ اور یوسف نجار کا مزار ہے؛ اور اسی جگہ حضرت عیسےٰ کو قید رکھا گیا۔

عسقلان

ساحلِ سمندر پر واقع ہے؛ یہاں خلیفہ عبدالملک کی تعمیر کردہ مسجد آج بھی قائم ہے۔ ناصرِ خسرو کا بیان ہے کہ یہ ایسے بڑے پتھروں سے بنائی گئی ہے کہ کوئی توڑنا چاہے تو بھی زرِ کثیر خرچ کیے بغیر توڑ نہیں سکتا۔ اس کے قریب چاہِ ابراہیمؑ ہے جسے آنحضرتؐ نے اپنے ہاتھ سے کھودا تھا۔

عورتا: نابلس سے بیت المقدس کی سڑک پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے؛ یہاں حضرت یوشع بن نون اور حضرت ہارونؑ کے ابن عم مفضّل کی قبریں ہیں۔ یہ ایک غار کے اندر مدفون ہیں۔ یہاں اور بھی ستّر انبیاء مدفون ہیں۔

الجبرہ: اس مقام کا نام ہے، جہاں قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا۔

بردہ: جہاں حضرت عیش و شمعون کی قبریں ہیں۔

دیر التجلیٰ طبریہ اور عجلون کے درمیان جبل طور پر وہ مقام ہے۔ جہاں حضرت عیسےٰؑ کی صورت اپنے حواریوں کے روبرو تجلّی الٰہی سے بدل گئی تھی۔

دیر طُور سینا صحرائے سینا میں طور سینا کی چوٹی پر ہے اور یہاں حضرت موسیٰؑ کو نبوت عطا ہوئی اور انھوں نے غش کھانے سے پہلے اللہ کی تجلّی دیکھی۔

دامون عکہ سے تین میل مشرق میں ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی کھوہ ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت ذوالکفلؑ کا تابوت ہے، بعض روایات کے مطابق حضرت ذوالکفلؑ حضرت ایوبؑ کے صاحب زادے تھے۔

غزہ ساحل بحر فلسطین کا مشہور شہر ہے۔ یہاں سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پردادا ہاشم ابن عبد مناف کی قبر ہے، یہی قصبہ امام محمد ابن ادریس الشافعیؒ کی ولادت گاہ ہے۔ شہر میں حضرت عمرؓ کی ایک یادگار بھی قائم ہے۔

حظیرہ اعبلین سے جانب جنوب ایک گاؤں ہے۔ یہاں ایک چشمے کے کنارے ایک مسجد میں حضرت شعیب اور ان کی صاحب زادی صفورہ زوجہ موسیٰ کی قبریں بتائی جاتی ہیں۔

حلحول یہاں حضرت یونسؑ ابن متا کا مزار ہے۔ اور یہ گاؤں بیت المقدس اور حبرون کے درمیان واقع ہے۔ حضرت یونسؑ کے والد کی قبر بھی قریب ہی ایک گاؤں اجر میں ہے۔

حطین یہ وہی گاؤں ہے۔ جس کے مشہور معرکہ ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین غازیؒ نے صلیبیوں کو فنا کر دیا۔ حطین، عکہ اور طبریہ کے درمیان طبریہ سے ۲ فرسخ (۶ میل) کے فاصلے پر ہے اور سلطان صلاح الدین نے یہاں ایک قطعے پر اپنی تاریخی فتح کی یاد میں قبۃ النصر کے نام سے ایک یادگار برج تعمیر کیا تھا۔ اس کے قریب ایک گاؤں خیارہ میں حضرت شعیبؑ کی قبر بتائی جاتی ہے۔

اربد یا اربل خطہ کا ایک نواحی قصبہ، یہاں حضرت یعقوبؑ کے چار بیٹے اور حضرت

جُبِّ یُوسف طبریہ اور بیروت کے درمیان وُہ کنواں ہے۔ جس میں حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے ڈال دیا تھا۔ یہ کنواں آجکل ایک مسجد کے صحن میں ہے۔

کابول ساحلِ فلسطین پر ایک قصبہ، یہاں حضرت ایوبؑ کے دو بیٹے روبین اور شمعون مدفون ہیں۔

کُفرِ بریک مشہد خلیل اللہؑ کے قریب ایک گاؤں جہاں حضرت لُوطؑ مدفون ہیں۔ یہاں کی پرانی مسجد میں ایک غار ہے۔ جس میں ساٹھ انبیاء کا مدفن ہے۔

کفرمندہ اسے مدیَن بھی کہا جاتا ہے، حضرت شعیبؑ اسی علاقہ کے لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ یہاں حضرت مُوسیٰ کی بیوی کی زیارت گاہ ہے اور وہ جھرا بھی، چٹان سے ڈھکا ہوا ہے جسکی چٹان حضرت موسیٰ نے اپنی بیوی کی بکریوں کو پانی پینے کے لیے اٹھا دی تھی۔ حضرت یعقوبؑ کے دو بیٹے آشر اور نفتالی بھی اسی گاؤں میں مدفون ہیں۔

قیصریہ رملہ سے ایک منزل کے فاصلے پر ساحلِ بحرِ روم پر نہایت مستحکم قلعہ ہے اسے عہدِ فاروقی میں حضرت معاویہؓ نے فتح کیا۔ نہایت خوبصورت شہر ہے۔

کنعان موجودہ نام سیلوہ یا شیلوح (SHILOH) ہے۔ سنجل و نابلس کے مابین شاہراہ کے دائیں طرف واقع ہے۔ حضرت یعقوبؑ یہیں رہتے تھے۔

الکرک بحرِ قلزم پر بیت المقدس اور ایلہ (ایلات) کے وسط راہ میں واقع ہے، اس سے ایک منزل پر موتہ ہے۔ جہاں حضرت جعفر طیارؓ اور ان کے ساتھیوں کی قبریں ہیں۔

قصرِ یعقوبؑ یہ جگہ طبریہ سے بانیاس کے راستے پر واقع ہے۔ یہاں حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کے جلانے رہنے پر روتے۔

اللجّون وہ شہر، یہاں مسجد ابراہیمؑ ہے۔ یہ مسجد ایک پتھر پر بنی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے عصا مارا تھا۔ جس سے فوراً پانی پھوٹ نکلا۔ یہ چشمہ آج تک جاری ہے۔

لاوی بیت المقدس اور نابلس کے درمیان ایک گاؤں، یہاں لاوی بن یعقوبؑ کی قبر ہے

لُدّ (سنہ ۲۴۷ء) قدیم دور میں فلسطین کا پایۂ تخت رہا ہے۔ یہاں عیسائیوں کا کلیسا سینٹ جارج ہے۔ اور عیسائی روایات کے مطابق حضرت عیسےٰؑ اسی کلیسا میں دجّال کو قتل کریں گے۔ عیسائی روایات کے مطابق اصفہان کے ستّر ہزار یہودی دجّال کے ہمراہ ہوں گے۔ اور لُدّ کے دروازے پر حضرت عیسےٰ سے مقابلہ کریں گے۔

نابلس فلسطین کا قدیم شہر، سامرہ یہودیوں کا شہر ہے، جن کا عقیدہ ہے کہ مقدس شہر یروشلم نہیں بلکہ نابلس ہے اور اگر کسی سامری کو بیت المقدس جانا پڑے تو وہ شہر میں داخل ہونے سے قبل ایک پتھر اٹھا کر شہر پر مارتا ہے۔ سامرہ کی عبادت گاہ کرزیم میں نرہ قربان گاہ ہے۔ جس کے بارے میں اہل سامرہ کا دعویٰ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کو اسی جگہ قربانی کے لیے پیش کیا۔ یہاں حضرت یعقوبؑ کا کھودا ہُوا کنواں ہے۔ اور قصبہ سے باہر ایک مسجد ہے، جہاں لوگ کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نے سجدہ کیا اور یہاں ایک پہاڑی گرزیم ہے۔ جو سامرہ کی سمت قبلہ ہے، نابلس کے قریب حضرت خضرؑ کا چشمہ اور حضرت یوسفؑ کا کھیت بھی ہے۔ بیت المقدس سے اس کا فاصلہ دس میل ہے۔

ابوالفدا تحریر کرتا ہے کہ جب جروبوم سلیمانؑ کے اخلاف سے باغی ہُوا۔ تو وہ دس قبیلے اپنے ہمراہ لے کر نکلا اور نابلس میں پہاڑی پر ایک بڑا معبد تعمیر کرایا۔ وُہ حضرت موسیٰؑ حضرت ہارونؑ اور حضرت یوشعؑ اور حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے علاوہ سب انبیائے اسرائیل کا مُنکر تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں پر بیت المقدس جانے کی ممانعت کر دی۔

رامہ بیت المقدس سے جانب شمال واقع ہے۔ جس میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا مقام مبارک ہے۔

رومہ حضرت یعقوبؑ کے بیٹے یہودا کا مدفن ہے۔

سبسطیہ حوالیٔ نابلس میں واقع ہے، یہاں حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ اور بہت سے دوسرے انبیاء اور بزرگان دین کے مزار ہیں۔

الشجرہ یہاں حضرت صالحؑ کے فرزند الصدیق کی قبر ہے۔ یہاں ایک غار میں اسّی شہیدوں کی نعشیں ہیں۔

سبسطین [illegible] حضرت [illegible] اور حضرت الیسعؑ مدفون ہیں۔

طویٰ وہ مقدس وادی جہاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو فرعون کے پاس بھیجنے سے قبل ان سے کلام کیا۔ طور سینا کے قریب ایک جگہ ہے۔

وادیٔ موسیٰ بیت المقدس کے جنوب میں حجاز کی راہ پر واقعہ ہے۔ اور اسی وادی کے ایک پہاڑ میں وہ پتھر ہے، جس سے حضرت موسیٰ کی دعا پر بارہ چشمے جاری ہوئے تھے۔

یافہ فلسطین کا ایک ساحلی شہر، جسے الملک العادل نے ۱۱۹۶ء میں صلیبیوں سے بذریعہ طاقت چھینا۔

مسجد الیقین جبرون سے ایک فرسخ کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جس پر ابوبکر السباحی کی بنی ہوئی مسجد کھڑی ہے، جسے مسجد الیقین کہتے ہیں۔ اس مسجد میں حضرت ابراہیم کی بستر گاہ ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت لوطؑ نے اسی جگہ سے بلادِ لوط کو جلتے دیکھ کر فرمایا تھا:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ الیقین (یعنی خدا) کا وعدہ سچا ہے۔"

مسجد الیقین کے باہر فاطمہؓ بن حسنؓ ابن علیؓ ابن ابی طالبؓ کی قبر ہے۔

یبنیٰ یافا اور عسقلان کے درمیان آباد ہے۔ یہاں حضرت ابوھریرہ کا مزار ہے۔

عکّہ ساحلِ سمندر پر ہے، حضرت صالح کی قبر یہاں بیان کی جاتی ہے۔ اس مقبرہ اور مسجد کے صحن میں ایک ٹکڑہ زمین ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ حضرت آدمؑ نے کھیتی باڑی کی تھی۔ ایک چشمہ ہے جسے عین البقر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت آدم کا نکالا ہوا ہے۔

باب دوازدہم

صیہونیت اور اُس کے منصوبے

صیہونیت نے ارضِ فلسطین اور اس خطّہ پاک پر اپنے پَر سے پُوری طرح پھیلا دیئے ہیں۔ اور وہ مسجد اقصیٰ کو ڈھا کر ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے دوبارہ خواب دیکھ رہی ہے۔ صیہونیوں کا دعویٰ ہے کہ ارضِ فلسطین ہمیشہ سے ان کی ارضِ موعودہ ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے باب میں ذکر ہو چکا ہے وہ فلسطین میں ایک اجنبی کی حیثیت سے وارد ہوئے۔ اور پھر وہ بخت نصر کے عہد میں اس سرزمین سے ایسے نکلے کر دنیا کے مختلف ملکوں اور خطّوں میں بھٹکتے پھر رہے۔ وہ اپنے اس دعوے کی تائید میں یہ دلیل بھی لاتے ہیں، کہ وہ مختلف ادوار میں کم و بیش گیارہ صدیاں اس پر قابض رہے لیکن اُن کی یہ دلیل اس لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ کہ عرب مسلمان اس سرزمین کے تیرہ صدیوں سے حکمران اور قابض تھے۔ اور جب یہ فتنہ اٹھا۔ اس وقت بھی عرب ہی حاکم و قابض ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ فلسطین سے نکل کر ہمیشہ پچھتاتے اور یہوداسے دعا کرتے رہے ہیں کہ:

> "اے خداوندا تیرے مقدس شہر برباد ہو گئے۔ صیہون ویران ہو گیا۔ اور یروشلم بھی۔ ہمارا مقدس اور حسین عبادت خانہ جہاں ہمارے بزرگ تیری حمد گایا کرتے تھے۔ جل کر راکھ ہو گیا اور ہماری قوم کی تمام پسندیدہ چیزیں برباد ہو گئیں۔"

صیہون یروشلم کا ایک پہاڑ ہے۔ یروشلم کا شہر دو متوازی پہاڑوں اور ان کی درمیانی وادی پر بسا تھا۔ مشرقی پہاڑ موریا ہے۔ اور مغربی صیہون موریہ سے بلند اور عہدِ سلیمان سے یہودیوں کے لیے مقدس ترین پہاڑ ہے۔ اسی پہاڑ پر حضرت داؤد کا مزار ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہودیوں کی اپنی مخصوص فطرت اور خود کو تمام اقوام سے بالاتر سمجھنے کی ذہنیت نے ہر دور میں انھیں معتوب رکھا اور وہ ساری دنیا میں پھیلے ہونے کے باوجود کہیں قومیت کے حقوق حاصل کر سکے اور نہ ہی کسی ملک کی قومی اور ملّی تحریک میں شریک ہو سکے۔ نتیجتہً الگ تھلگ رہ گئے۔ علیحدگی کے اس احساس کے تحت خفیہ تحریکیں چلانا اور سازشیں کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی۔ چنانچہ صیہونیت بھی ان کی ایک خفیہ سازش اور تحریک ہے اور صیہونیوں سے بھی وہ یہودی مراد ہیں جو صیہون کا رخ کر کے فلسطین میں قومی حکومت کے خواہاں اور اس مقصد کے لیے کوشاں رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام یہودی صیہونی نہیں بلکہ متعدد یہودی فرقے پُرجوش صیہونیوں کے مذموم ارادوں سے الگ تھلگ رہے ہیں، خود اسرائیل میں ایک فرقہ یہودیوں کی اسرائیل سٹیٹ کے قیام و بقا کے خلاف اور اس کے وجود کو غیر قانونی، غیر اخلاقی اور ناانصافی قرار دیتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ صیہونیت کا مقصد دینی غلبہ نہیں بلکہ سیاسی اقتدار ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ یہودی اپنی شرارتوں اور سازشوں کی بنا پر مختلف ادوار میں نفرت و حقارت کا نشانہ بنتے رہے۔ اور ہر ملک نے کبھی نہ کبھی ان کو اپنی حدود سے ضرور نکال باہر کیا۔ ان سازشوں ہی کی بنا پر ۶۲۷ء میں سرزمین حجاز سے اور ۱۰۸۹ء میں شام سے نکالے گئے۔ پرتگال کو جائے پناہ بنایا۔ لیکن وہاں سے بھی ۹۲۰ء میں سپین کو پناہ گاہ بنانے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۱۱۰ء میں سپین نے بھی نکال دیا۔ ۱۲۹۰ء میں انگلینڈ سے نکلے اور فرانس پہنچے۔ لیکن فرانس صرف سولہ ہی سال میں ان سے بھر پایا۔ اور ۱۳۰۶ء میں انھیں اپنی حدود سے باہر دھکیل دیا۔ وہ بلجیم پہنچے۔ ۱۲۷۰ء میں زیکوسلاویکہ آ گئے۔ لیکن دس سال ہی بعد وہاں سے بھاگے اور دوبارہ فرانس میں آ بسے۔ ۱۳۹۴ء میں فرانس نے پھر ان کو ملک سے نکال باہر کیا۔ انھوں نے ہالینڈ کو مسکن بنایا۔ وہاں سے ۱۲۴۲ء میں روس پہنچے۔ ۱۵۱۰ء میں روس نے اٹلی کی طرف دھکیل دیا۔ ۱۵۴۰ء میں یہ جرمنی چلے گئے۔ جرمنی نے بھی ۱۵۵۱ء میں انھیں دھتا بتا دیا اور وہ ترکی مملکت میں بحیثیت ذمی آ بسے۔ بدلتی ہوئی دنیا میں انھوں نے تعلیم و تجارت، سائنس و صنعت کے راستے مختلف ملکوں میں پاؤں جمانا شروع کر دیے لیکن اپنی سازشوں کی بنا پر ہمیشہ ہدفِ ستم بنتے رہے انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی روس کے لوگ ان پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے۔ ان کے

مکانات مسمار کر دیئے گئے۔ بر بازار ان کی خواتین کو بے حرمت کیا گیا۔ ستر ہزار یہودی بمشکل جان بچا کر روس سے نکل سکے۔ اٹھارویں صدی میں کلیسائے انگلستان نے ان کی تذلیل کے لیے انھیں ایک خاص قسم کا لباس پہننے کا پابند بنایا اور لوگوں کو نصیحت کی کہ وہ اُن کی ریشہ دوانیوں سے ہوشیار رہیں۔ پھر بھی یہ باز نہ آئے۔ تو ان کی آبادیاں الگ کر کے ان کے گرد لوہے کی جالیاں لگا دی گئیں اور بالآخر ایڈورڈ اول یہودی زعماء کو وطن سے نکالنے پر مجبور ہو گیا۔ امریکہ کے صدر بنجامن فرینکلن نے اہلِ امریکہ کو "اسرائیلی سازشوں" سے ہوشیار اور خبردار رہنے کا حکم دیا۔ الغرض ہر جگہ یہ معتوب و مطعون رہے۔ البتہ اس سارے عرصہ میں خلافت عثمانی نے انھیں پناہ دیے رکھی۔ وہ مسلمان ملکوں کو جائے پناہ سمجھ کر ان میں امن و سکون کی زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن ان احسانات کا جو بدلہ انھوں نے مسلمانوں کو دیا۔ وہ احسان فراموشی اور محسن کُشی کی بدترین مثال اور طویل داستان ہے۔ جس کی تفصیلات کا یہ محل نہیں۔ البتہ یہاں ہم اس تحریک صیہونیت کا تذکرہ ضرور کریں گے۔ جو بالآخر اسرائیلی حکومت پر منتج ہوئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ صیہونیت کی منظم تحریک کا آغاز سترھویں صدی ہی میں ہو چکا تھا۔ اور اس کا پہلا ہیڈ کوارٹر وی آنا تھا۔ عرصۂ دراز تک یہودی متعدد طریقوں سے حصولِ مقاصد کی کوشش کرتے رہے۔

۱۸۵۴ء میں لندن کے ایک یہودی نے اسی مقصد کے لیے ایک کمپنی قائم کی۔ اور ۱۸۷۶ء میں جارج ایلیٹ نے "چیل سائن" کے نام سے ایک سوسائٹی کی بنا رکھی۔ جس کا مقصد فلسطین میں یہود کی زرعی نو آبادیاں قائم کرنا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں وی آنا کے ایک یہودی صحافی تھیوڈور ہرزل نے "ریاست یہود" کے نام سے ایک رسالہ شائع کر کے صیہونیوں کے لیے قومی وطن کا ٹھوس تصور پیش کیا۔ اس نے یہودی ریاست کی حدود کوہ یورال دترکی) سے نہر سویز تک مقرر کیں اور یہود کو فلسطین داؤد و سلیمان کا نعرہ دینے کے علاوہ واضح طور پر صیہونی تحریک کے مقاصد متعین کر دیئے۔

اولاً: یہودی ایک علاقہ میں جمع ہو جائیں۔

ثانیاً: دیگر ممالک یہودیوں کی خود مختاری اور ان کے قومی وطن کی ضرورت کو تسلیم کر لیں۔

اس کتاب کے سامنے آتے ہی یہودیوں میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ لارڈ راتھس چائلڈ (جو انگلینڈ میں یہودی کمیونٹی کا سربراہ اور دولت کی طاقت تھا) میدان میں آ گیا۔ اس نے اس صحافی کی دامے، درمے، سخنے مدد کی۔ اور اس کی شہ اور ڈاکٹر ہرزل کی دعوت پر ۲۷ اگست ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر بیسل میں صیہونیوں کی کانفرنس ہوئی، جو تاریخ صیہونیت کا اہم باب ہے۔ اس کانفرنس نے یہودیوں کے سامنے نصب العین رکھا۔ اور انھیں اس کے حصول کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دینے پر ابھارا ۔۔۔ کانفرنس نے اعلان کیا۔ کہ:

"صیہونیت فلسطین میں یہودیوں کے لیے "ہوم لینڈ" حاصل کرنے کی جد و جہد کا آغاز کرتی ہے۔ اور اس مقصد کے لیے کانفرنس نے طے کیا ہے کہ:-

۱۔ فلسطین میں یہودی کسانوں، مزدوروں اور پیشہ وروں کی آباد کاری کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

۲۔ عالمی صیہونی تحریک کو مجموعی طور پر مختلف ممالک کے قوانین کو سامنے رکھ کر مقامی اور بین الاقوامی حیثیتوں میں از سر نو منظّم کیا جائے۔

۳۔ یہودیوں میں نسلی تعصب، قومی شعور اور سب سے بالاتر ہونے کے احساس کو فروغ دیا جائے۔

۴۔ حصولِ نصب العین کے لیے مختلف حکومتوں کی تائید حاصل کی جائے۔

اس کانفرنس میں صیہونیت کی ابتدائی تحریک" انجمن محبّین صیہون" منظّم کر کے اسی روز سے منصوبے پر عمل شروع کر دیا گیا۔ اور یہود میں ہجرتِ فلسطین کی تحریک باقاعدہ شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے روس سے کچھ یہودی ارضِ مقدس پہنچے۔ تاریخ کے اوراق اس امر کے گواہ ہیں کہ برطانوی یہودیوں نے صیہونیت کو مستحکم و منظّم کرنے میں زبردست کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے "ارضِ مقدس" میں یہودی آباد کاری میں ہر ممکن مدد کی، اور وہ جلد ہی برطانیہ کے سرمایہ داروں اور بڑی فرموں کے حصّہ داروں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ برطانیہ کے صفِ اوّل کے رہنماؤں لارڈ ایشلے، لارڈ شیفٹ سبری کرنل کولر، والٹر کسر سبورن، جیمز فن اور لارنس اولی فنٹ نے صیہونیت کے "قومی عود" ن"

کی پوری حمایت کی۔ ممتاز تجارتی اداروں نے فلسطین میں یہودی حکومت قائم کرنے کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کی خاطر دوسیاہی وقائع نولیسوں کی خدمات حاصل کیں۔ بعدازاں لارڈ بیکنز فیلڈ اور لارڈ سالسبری بھی صیہونی تحریک کے حامیوں میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے سلطان عبدالحمید کے ساتھ صیہونی رہنما ڈاکٹر ہرزل اور لارنس اولی فنٹ کی گفت وشنید میں، سلطان پر پورا دباؤ ڈال کر یہودیوں کی خودمختاری تسلیم کرانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ڈاکٹر تھیوڈور ہرزل نے اس سلسلے میں سلطان سے متعدد ملاقاتیں کیں تاکہ عثمانی سلطنت فلسطین کو یہود کا قومی وطن تسلیم کر کے انھیں کچھ مراعات دے دے۔ اس کے لیے اس نے ترکی کے تمام قرضہ جات کی ادائیگی اور ہر قسم کی مالی امداد کرنے کی پیش کش کی۔ لیکن سلطان نے واضح الفاظ میں جواب دیا کہ

اگر یہودی اپنی ساری دولت بھی میرے قدموں میں لا ڈالیں، تب بھی میں فلسطین میں مسلمانوں کی ایک انچ زمین یہودیوں کو دینے کا روادار نہیں"

ہرزل نے یہ پیغام ایک ترک یہودی حاخام قرصو آفندی کے ہاتھوں بھیجا تھا۔ جو سالونیکا کا باشندہ تھا۔ ڈاکٹر ہرزل اس جواب سے مایوس نہیں ہوا بلکہ اس نے کھلی دھمکی دی۔ کہ "تم اس کا برا نتیجہ دیکھو گے" ۔ چنانچہ اس کے فوراً بعد اگر ایک طرف سلطان عبدالحمید کو معزول کرنے کی سازشیں شروع ہو گئیں۔ تو دوسری طرف انھوں نے سلطان کے دوستوں اور بیرونی طاقتوں کے ذریعہ سلطان پر دباؤ ڈلوانے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ یہودی سلطان عبدالحمید کے ذاتی دوست قیصر ولیم کو اس بات پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کہ وہ ۱۸۹۸ء میں اپنے دورۂ ترکی، شام اور فلسطین کے دوران سلطان عبدالحمید کو فلسطین کے بارے میں یہودی تجویز قبول کرنے پر مجبور کریں۔ اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو یہودی اس کے عوض سلطنت عثمانی میں جرمن ثقافت اور مختلف ممالک میں جرمنی مال کی تجارت کو فروغ دیں گے اور فلسطین کو برطانیہ کے لیے ایک مستقل ذریعہ اذیت میں تبدیل کر دیں گے۔ لیکن جب قیصر ولیم نے اپنے دورہ کے دوران سلطان سے یہ ذکر کیا۔ تو سلطان نے کوئی توجہ نہ دی۔ قیصر پریشان ہو گیا اور اس نے دوبارہ اس کا ذکر نہ کیا، کیونکہ اسے بتایا گیا۔ اگر اس نے اس بات کو دہرایا تو سلطان اس کے بارے میں مشکوک ہو جائیں گے۔ اور جرمنی برلن بغداد ریلوے لنک سے محروم ہو جائیگا۔

ڈاکٹر ہرزل نے اپنی ڈائری میں جو ۱۹۳۴ء میں تل ابیب سے شائع ہوئی ہے، لکھا ہے۔ کہ سلطان عبدالحمید نے ۱۹۰۲ء میں ہرزل کو جو میڈل بھیجا۔ اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ جس میں انھوں نے انتباہ کیا تھا:

"ڈاکٹر ہرزل سے کہدو کہ وہ فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنے کی مزید کوئی کوشش نہ کرے۔ جب تک میں زندہ ہوں اور عثمانی سلطنت قائم ہے۔ فلسطین میں یہودی ریاست کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا"

اس ڈائری سے یہ انکشاف بھی ہوا۔ کہ ڈاکٹر ہرزل نے سلطان کو تمام قرضوں کی ادائیگی کے علاوہ ایک ملٹری فلیٹ کی تشکیل و تعمیر کے تمام اخراجات ادا کرنے کا لالچ بھی دیا تھا۔ مزید برآں اس نے وعدہ کیا تھا۔ کہ یہودی بین الاقوامی معاملات میں اس کی حمایت اور فلسطین میں ایک بڑی یونیورسٹی قائم کریں گے۔ جو عثمانی طلباء کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ جانے کی زحمت سے بچالے گی۔

ڈاکٹر ہرزل ۱۹۰۲ء میں مر گیا۔ مگر اپنی موت سے قبل وہ "صیہود نو آبادی بنک" اور "یہودی بیت المال" قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بنک ۱۹۰۱ء میں قائم ہوا جس کا راس المال تیس لاکھ پونڈ مقرر ہوا۔ پہلے ہی سال چار لاکھ پونڈ کی رقم جمع ہو گئی۔ "یہودی بیت المال" میں بیرن دی ہرش نے یہود نو آبادیاں قائم کرنے کے لیے نوّے لاکھ پونڈ کا عطیہ دیا تھا۔ ڈاکٹر ہرزل کے بعد صیہونی تحریک کا صدر مقام کولون منتقل ہو گیا۔ اور ۱۹۰۴ء میں خفیہ طور پر اس کی ایک شاخ فلسطینی بندرگاہ یافا میں بھی قائم کر دی گئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ڈاکٹر ہرزل کی موت کے بعد یہودیوں نے دونمہ اور فری میسن کے ذریعہ اپنی سازشیں جاری رکھیں۔ اور وہ "ترک نوجوانوں کی سوسائٹی آف یونین اینڈ پروگریس" میں نقب لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور سلطان عبدالحمید کا تختہ الٹنے کی سعی تیز تر کر دی۔

چنانچہ ۱۹۰۸ء میں تاریخ کا المناک حادثہ پیش آیا۔ سلطان عبدالحمید کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اور جو تین آدمی سلطان کے پاس معزولی کا پروانہ لے کر پہنچے۔ ان میں ایک وہی حاخام قرہ صوہ آفندی تھا۔ جس کے ہاتھ ہرزل نے فلسطین کو یہودیوں

کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اب آپ مسلمانوں کی بے غیرتی اور سلطان کے دل کی حالت کا اندازہ خود کر لیجیے۔ اس پر ستم یہ کہ شوکت پاشا کے اس "تاریخی انقلاب" کے بعد ترکی میں جو وزارت بنی، اس کے تین رکن' بصاریہ آفندی (BASSARIA EFFENDI) وزیر تعمیرات (جو ایک صیہونی اخبار کا ایڈیٹر اور رومانیہ کا یہودی تھا) نسیم مزلک (NASIM MOZILIK) وزیر تجارت اور جاوید بے وزیر خزانہ، یہودی تھے۔ انھوں نے اپنے اثر و رسوخ کو یہودی آبادکاری کے لیے استعمال کیا اور بالآخر ۱۹۱۴ء میں یہودیوں کو ملکیت زمین کا حق اور دنیا کی معلوم تاریخ میں یہودی تنظیموں اور اداروں کو فلسطین میں زمین خریدنے کی اجازت دلانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہودیوں کو بہترین اور زرخیز سرکاری زمین دلانے کی بھرپور کوشش شروع کر دی۔

دریں اثنا یہود جرمنی اور برطانیہ سے سودا بازی میں بھی مصروف تھے اور ترکی کو تباہ کرنے کے لیے ممالک عرب میں برطانیہ کی ریشہ دوانیاں جاری تھیں۔ ٹامس ایڈورڈ لارنس (لارنس آف عریبیہ) عرب کے سیاسی افق پر عربوں کا ہمدرد بن کر نمودار ہوا۔ عربوں کی زبان اور ان کی وضع قطع اختیار کر کے اس نے عربوں کے دلوں کو جیت لیا۔ یہاں تک کہ بسا اوقات لارنس کی امامت میں اس کے عرب ساتھی نماز ادا کر لیتے۔ لارنس نے عربوں اور ترکوں کے درمیان نفرت کی ایک خلیج حائل کر دی۔ انھیں عرب قومیت کا درس دیا۔ اور ۹ جون ۱۹۱۶ء کو یک بیک ترکی قلمرو کی سرزمین فلسطین سے بغاوت کا علم بلند ہوا۔ اور دو سال کے اندر اندر ترکی عرب علاقوں سے دست بردار ہو گیا۔ اتحادی فوجوں کا اعلیٰ فوجی مبصر کپتان ارل ہارٹ لکھتا ہے:

> "چوتھی ترک فوج کو جو اس وقت بھی دشمن کو تباہ کرنے اور ہماری فتح کی راہ روکنے میں مؤثر حیثیت رکھتی تھی۔ عربوں ہی نے ناکارہ بنایا۔"

دوسری طرف یہود نے جنگ عظیم سے قبل جرمنی سے سودا کرنا چاہا۔ کیونکہ اس وقت جرمنی میں یہودی اتنے ہی مؤثر تھے، جتنے آج امریکہ میں ہیں۔ انھوں نے قیصر ولیم سے کہا۔ کہ وہ اس بات کی یقین دہانی کرائے۔ کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنوا دے گا۔ لیکن چونکہ سلطان ترکی، جرمنی کا حلیف تھا! اس لیے

جرمنی نے کچھ تساہل کیا۔ چنانچہ صیہونی تحریک کے صدر ڈاکٹر ہیم وائزمین نے برطانیہ سے رجوع کیا۔ وہ اس وقت مانچسٹر یونیورسٹی میں کیمسٹری کا استاد تھا، اس نے پیشکش کی کہ اگر برطانیہ فلسطین میں اپنی زیر نگرانی "یہودی قومی وطن" قائم کرے، تو یہودی، برطانیہ کا ساتھ دیں گے۔ مزید برآں اس نے برطانیہ کو بعض ایسے کیمیائی راز دیئے، جس سے جنگ کے اخراجات تین چوتھائی رہ گئے اور برطانیہ کو جنگ میں برتری حاصل ہو گئی۔ اس عظیم خدمت کے عوض برطانیہ اور اس کے حلیفوں کا فلسطین یہودیوں کے حوالے کر دینا، مہنگا سودا نہیں تھا، چنانچہ اتحادی ممالک میں بیسل کانفرنس کی قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت کا پروپیگنڈا شروع ہو گیا۔ اور پھر ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو تاریخ کا وہ سیاہ ترین اعلان عمل میں آیا۔ جس کے تحت برطانیہ نے دونوں قوموں کے اتحاد کی آڑ لے کر ارض مقدس میں یہودی وطن بنانے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ یہ اعلان یا معاہدہ برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے لارڈ راتھ چائلڈ کے نام ایک خط میں کیا۔ اسی لیے اسے اعلان بالفور کا نام دیا جاتا ہے، حالانکہ برطانیہ نے عربوں کو ترکی کے خلاف اس وعدے پر بھڑکایا۔ اور اپنے ساتھ شامل کیا تھا، کہ جنگ کے خاتمہ پر عرب ممالک کو آزاد و خود مختار مملکت سے بنا دیا جائے گا، اور اس غرض کے لیے انھوں نے شریف حسین کو تحریری وعدہ بھی دے دیا تھا۔ یہ انگریز کی صریح بددیانتی تھی۔ اور جس وقت برطانوی وزیر خارجہ یہ تحریری وعدہ دے رہا تھا۔ کہ ہم فلسطین میں یہود کا قومی وطن بنا دیں گے۔ اس وقت فلسطین میں یہود کی آبادی صرف پانچ فیصد تھی۔ یہ وعدہ گویا اس بات کی یقین دہانی تھی۔ کہ برطانیہ صیہونیوں کو موقع دے گا۔ کہ تم عربوں کو ان کے وطن سے نکال باہر کرو اور ان کی جگہ دنیا کے گوشے گوشے سے اپنے افراد لا بساؤ۔ یہ بددیانتی اور وعدہ فراموشی کی ایک ایسی مثال ہے۔ جس کی تاریخ میں نظیر ملنا مشکل ہے، لارڈ بالفور نے اپنے خط کے متعلق اپنی ڈائری میں لکھا؛

"ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، صیہونیت ہمارے لیے ان سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے"

(برطانوی پالیسی کی دستاویزات جلد دوم)

لائیڈ جارج کے الفاظ میں اعلانِ بالفور دراصل اس جذبۂ احسان مندی کے تحت ہوا تھا۔ کہ ڈاکٹر وائزمین کی سائنٹیفک ایجادات نے برطانیہ کی توپوں کو بروقت بچا لیا تھا۔ اور بقول سر مائیکل ایڈوائر امریکہ کی دولت نے بڑا سہارا دیا۔ اور امریکی بنکوں پر یہودی چھائے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان سے عہد کرنا پڑا۔ اور یہ وعدہ بالفور کا سبب بنا اسے تمام اتحادی طاقتوں کی حمایت حاصل تھی۔

مختصر یہ کہ اعلان بالفور کے ساتھ ہی دنیا کے مختلف ممالک سے یہودیوں کا سیلاب فلسطین کی طرف اُمڈ پڑا۔ ایک یہودی مصنف کے الفاظ میں یہی وہ اعلان ہے، جس کے نتیجہ میں جنگ عظیم اول کے بعد فلسطین میں آباد صرف ۲۶۰۰۰ یہودی جو منتشر دیہاتوں میں بکھرے ہوئے تھے جن کی تعداد دو درجن سے زیادہ نہ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ۸۳ ہزار کی ایک منضبط اور خوش حال "قوم" میں تبدیل ہو گئے۔ عربوں کی زمین دھڑا دھڑ بکنے لگی، زمینوں کی کاشت اور منڈیوں سے عرب بے دخل کیے جانے لگے۔ اسی دوران ۱۹۱۹ء میں یہودیوں نے دیوارِ گریہ کی خریداری کے لیے عربوں کو اسی ہزار پونڈ کی پیشکش کی، مگر اس وقت عربوں نے اس سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا۔

۱۹۲۰ء کی مشرق وسطیٰ کانفرنس میں، جس میں چرچل بھی شریک تھا۔ ڈاکٹر وائزمین نے اپنے قومی وطن کی وضاحت اس طرح کی:

"اسرائیلیوں کے لیے فلسطین ایسا ہی ہے، جیسا انگلستان انگریزوں کے لیے۔"

اس کے بعد اس نے کہا۔

"ہم دو ہزار سال سے اُمید کی زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ سر دست ہم برطانوی سایۂ عاطفت میں ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہماری حکومت خود اختیاری ہو گی۔ اور آخر کار یہ ملک یہودیوں کے حوالے کر دینا پڑے گا۔"

مجمع میں سے کسی نے سوال کیا:

"...... کب ہو گا؟"

ڈاکٹر ویزمین نے جواب دیا

"گو ہم فلسطین کو خالص یہودی ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے باوجود جو عرب فلسطین میں رہنا چاہیں گے۔ انھیں اس کی اجازت دی جائے گی۔ لیکن جو نہ رہنا چاہیں گے۔ ان کے لیے مصر ہے، شام ہے اور موآب کی پہاڑیوں کے افق سے اُس پار وسیع صحرا ہے۔ جہاں سے آ کر وہ یہاں آباد ہوئے تھے۔"

یہ پہلا دن تھا۔ جب یہودیوں نے کھل کر عربوں کے متعلق اپنے عزائم کا اظہار کیا۔ اس کانفرنس میں یہودیوں کے "قومی وطن" کی ضرورت کو تسلیم کر لیا گیا، چنانچہ سر ہربرٹ سموئیل جو یہودی النسل تھا۔ برطانوی ہائی کمشنر کی حیثیت میں فلسطین پہنچا۔ تو اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ

"شاہِ برطانیہ کی جس پالیسی کو بروئے کار لانے کے لیے میں آیا ہوں وہ یہودیوں کے درآمد کی اس وقت تک حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ جب وہ گھڑی آ پہنچے۔ خواہ پچاس سال میں آئے یا سو سال میں۔ کہ جب ان کے مفاد (اور آبادی) کا غلبہ خود فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کا مطالبہ کر دے۔"

عرب بھی اتحادی طاقتوں کے عزائم سے باخبر ہو چکے تھے۔ فرانس اور برطانیہ "آزاد عرب علاقے" کو آپس میں بانٹ رہے تھے۔ کہ مارچ ۱۹۲۰ء میں عربوں نے شام میں عظیم الشان قومی کانفرنس منعقد کی۔ اور جرأتِ رندانہ کے ساتھ اپنی آزادی، خودمختاری اور امیر فیصل کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ اور فرانس نے فوراً قوت استعمال کی۔ جنرل گورو اسی ہزار فرانسیسی فوج لے کر چڑھ دوڑا۔ ۱۵ر جون ۱۹۲۰ء کو یوسف بک العظمیٰ قومی وزیر دفاع نے مقام میلون پر اپنے پانچ سو جوانوں کے ساتھ اس لشکرِ جرار کا مقابلہ کیا۔ لیکن ایک لمحہ کی جھنکار کے بعد خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد بھی عربوں نے کئی بار یروشلم کی چھاؤنی پر حملے کئے، مگر حالات ان کے لیے سازگار نہ تھے۔ برطانیہ کے سایۂ عاطفت میں یہود کی مسلسل درآمد جاری رہی۔ مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) نے جب فلسطین کو انگریزوں کے انتداب میں دیا، اس موقعہ پر فلسطین میں جو مردم شماری کرائی گئی تھی۔ اس کے مطابق مسلمان عرب ۶۶۰۶۴۱، عیسائی عرب ۷۶۲۴۱، اور یہودی ۸۲۷۹۰

تھے۔ اور یہودیوں کی اتنی آبادی بھی اس وجہ سے تھی کہ وہ دھڑا دھڑ وہاں جاکر آباد ہو رہے تھے۔ مجلس اقوام نے برطانیہ کو انتداب کا پروانہ دیتے ہوئے پوری ڈھٹائی سے یہ ہدایت کی کہ اس کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرے۔ صیہونی تنظیم کو سرکاری طور پر باقاعدہ تسلیم کرکے نظم ونسق میں شریک کرے اور اس کے مشورے اور تعاون سے یہودی قومی وطن کی تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے ساتھ وہاں کے قدیم اور اصل باشندوں کے لیے صرف اتنی بات پر اکتفا کیا گیا کہ ان کے مذہبی اور شہری حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ سیاسی حقوق کا اس میں سرے سے ذکر ہی نہ تھا۔

انتداب کے زیر عمل آنے پر انتدابی فلسطین کی سرحدوں میں ۱۰۱۶۳ مربع میل کا خشک علاقہ شامل تھا۔ اس کے علاوہ ۲۷۰ مربع میل اندرونی آبی خطوں کا رقبہ تھا اور اس طرح مجموعی رقبہ ۱۰۴۳۵ مربع میل ہوتا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں جب اتحادیوں نے فلسطین پر قبضہ کیا، اس کی نوّے فیصد آبادی عرب تھی۔ جو ۲/۱ ۹۷ فیصد رقبہ کی مالک و قابض تھی جبکہ یہود ۵۶ ہزار سے زیادہ نہ تھے؛ اور ان کا نصف حال ہی میں ترک وطن کرکے آنے والے یہود تھے۔ پورے ملک میں ان کے پاس بمشکل ۲/۱ ۲ فیصد اراضی تھی۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں ان کی آبادی مجموعی آبادی کا ۱۲ فیصد، ۱۹۳۱ء میں ۱۷ فیصد اور ۱۹۴۴ء میں ۳۱ فیصد ہو گئی۔ اور یہ سب اس پالیسی کا نتیجہ تھا۔ جس کے تحت یہود کو فلسطین میں لاکر آباد کرنے کا سلسلہ باقاعدگی سے شروع کر دیا گیا تھا۔ برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سیمو ئیل نے ان کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی تیس سالہ دورِ انتداب کے اختتام پر یہود بمشکل ۶،۵ فیصد اراضی کے مالک بن سکے تھے۔ اس میں سے بھی نصف اراضی وہ تھی۔ جو برطانوی حکومت نے براہِ راست یہودی اداروں کے ہاتھ فروخت کی، نصف میں سے زیادہ رقبہ لبنان اور شام کے غیر حاضر مالکوں نے فروخت کیا۔ جبکہ مقامی عرب گراں قدر معاوضہ کی پیش کشوں پر بھی اپنی اراضی فروخت کرنے پر راضی نہ ہوئے۔

سر ہربرٹ سیموئیل نے یہود کو حکومت کے نظم و نسق میں برابر کا شریک کر لیا تھا اور ان کے سپرد نہ صرف تعلیم و زراعت کے محکمے کئے۔ بلکہ بیرونی ممالک سے لوگوں کے داخلے اور توطین کے معاملات بھی انھیں سونپ دیئے تھے۔ نتیجۃً ایسے قوانین بنے جن

کے ذریعہ باہر کے یہودیوں کو فلسطین میں آ کر زمینیں حاصل کرنے کی پوری مراعات مل گئیں۔ یہودی بیت المال کا تمام سرمایہ یہود کے لیے زمین کی خرید اور کالونیوں کے لیے وقف ہو گیا۔ صرف دو سال میں کالونیوں کے مصارف ۷۰ لاکھ ۸۶ ہزار پونڈ ہو گئے۔ یہودیوں کو زمینوں کی آبادکاری کے لیے قرضوں اور دوسری سہولتوں سے نوازا گیا۔ اس کے برعکس عربوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔ اور ٹیکسوں کے بقایاجات کی آڑ میں زمینوں کو ضبط کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ضبط شدہ زمینیں اور سرکاری اراضی یہودی نوآبادکاروں کو کہیں مفت اور کہیں برائے نام پٹے پر دی گئی۔ بعض مقامات پر کسی نہ کسی بہانے پورے پورے گاؤں صاف کر دیئے گئے اور وہاں یہودی بستیاں بسائی گئیں۔ ایک علاقے میں تو ۹ ہزار عرب کاشت کاروں اور ۵۰ ہزار زرعی کارکنوں کو جبراً بے دخل کر دیا گیا اور ان کو فی کس ۳ پونڈ دس شلنگ دے کر چلتا کیا گیا۔ ان تدبیروں سے یہودی اس سال میں ایک کروڑ چار لاکھ ۳۲ ہزار ایکڑ زمین کے مالک بن گئے۔

۱۹۲۲ء میں وہ ۸۲ ہزار سے کچھ اوپر تھے۔ ۱۹۲۳ء، ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں بالترتیب ۲۸ ہزار، ۴۰ ہزار اور اکسٹھ ہزار بیرون ملک سے آ کر شامل ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں ان کی تعداد ساڑھے چار لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی۔ یہودیوں کی درآمد کا سلسلہ ہی کم تشویشناک اور کرب انگیز نہ تھا کہ مختلف مواقع پر مختلف بندرگاہوں پر گولہ بارود بھی پکڑا گیا۔ عربوں کا غیض و غضب بھڑک اٹھا۔ شیخ عز الدین القسام جیسا ساٹھ سالہ معمر پیر و مرشد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مریدوں سے بیعت علی الموت لی۔ اور اپنی خانقاہ سے نکل کر میدان میں آ گیا۔ شیخ نے لڑ کر جان دے دی اور ان کی یہ شہادت مستقل پیغام بن گئی۔ ایک عام اضطراب پیدا ہو گیا۔ عوام نے چوکیوں، جیلوں، سٹیشنوں پر سخت یلغار کی اور جب شیخ کا جنازہ لے کر نکلے تو یہ ہجوم لشکر جرار بن چکا تھا جس پر برطانوی طیاروں نے زبردست بمباری کی۔

اس کشمکش کے بعد برطانیہ نے ۱۹۳۶ء میں فلسطین کو مجلس قانون ساز عطا کی۔ اور مجلس قانون ساز میں بائیس میں سے صرف گیارہ مسلمان تھے۔ اس بے انصافی اور حق تلفی پر عرب تلملا اٹھے۔ انھوں نے بنی نوع انسان کو عربوں کے دلِ ناتواں کی آواز سنانے کے لیے ۱۹ مارچ ۱۹۳۶ء کو ہڑتال کر دی۔ یہ آگ دو ہی دن میں سارے

فلسطین میں پھیل گئی۔ اور شرق اردن، شام، عراق تک پہنچی۔ انھوں نے بھی امدادی ہڑتال کردی۔ درآمد شدہ یہودیوں اور درآمدکنندگان کی تجارت گاہیں متزلزل ہوگئیں۔ ونا تہ ویران ہو گئے۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ ایک تہلکہ مچ گیا۔ ہڑتال کی شدّت میں اضافہ کے ساتھ برطانوی عفریت نے حق پرستوں پر اپنے پنجۂ استبداد کی گرفت سخت کرنا شروع کردی۔ مصر سے فوج بلائی گئی۔ مگر عربوں نے سر نہ جھکایا۔ ہڑتال کی رہنمائی کے لیے ایک لجنۃ العلیا (عرب ہائی کمان) قائم ہوئی۔ مفتئ اعظم فلسطین، احمد حلمی پاشا، عبداللطیف الصلاح، یعقوب فراج اور یعقوب الفصین، اس کے ارکان تھے۔ کمیٹی نے نعرہ لگایا:

"زندہ رہنا ہے تو مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ"

ہڑتال نے ایک تباہ کن صورت اختیار کرلی۔ سول نافرمانی شروع ہوگئی۔ لگان ادا نہ کرنے کی تحریک چل پڑی۔ ایک دنیا ہل گئی۔ لیکن برطانیہ نے عربوں کو اُن کا قومی حق دینے اور یہود کی درآمد پر پابندی لگانے کے بجائے تشدد کی راہ اپنائی۔ جنگِ آزادی شروع ہوگئی۔ دنیا کی عظیم قوتوں کے خلاف نہتّی قوم کی جنگ ــــ ریلوں کی پٹڑیوں کو اکھاڑا گیا۔ تار لائنوں کو منقطع کیا گیا۔ عام تباہی اور توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

فوزالدین فاد قجی، سعید بک العاص اور شیخ محمد الاشمر نے شہر نابلس کی پہاڑیوں میں اپنا مستقر قائم کرکے باقاعدہ جنگ شروع کردی۔ برطانیہ، ٹینک اور طیارے میدان میں لے آیا۔ تحریک کے اہم مرکز کو ڈائنامیٹ سے اُڑا دیا گیا۔ لیکن ہڑتال پھر بھی ختم نہ ہوئی۔ یہودی اور انگریز بھوکوں مرنے لگے۔ تو خود انگریز افسروں نے برطانوی طرزِ عمل کے خلاف احتجاج شروع کردیا۔ مسٹر ہاپکنز کمانڈر شمالی کمان، مسٹر کروسی کمانڈر جنوبی کمان اور ناظم اعلیٰ حکومت مسٹر ہوور نے ہائی کمشنر فلسطین کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا! انگریزوں نے نیا فریب کھیلا اور عرب سربراہوں کو درمیان میں لے آئے۔ چنانچہ عرب شیوخ اور شاہوں کی مداخلت پر ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ہڑتال ختم ہوگئی۔ یہ ہڑتال پورے دس ماہ جاری رہی۔ لارڈ پیل کی قیادت میں ایک شاہی کمیشن قائم ہوا۔ لیکن عربوں نے بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اس کمیشن کے سلسلے میں برطانوی دارالعوام میں دیئے گئے بیانات انتہائی پُرفریب تھے۔ وعدہ خلاف ایک مرتبہ پھر عہد شکنی کر رہے تھے۔ برطانیہ نے اعلان کیا۔ کہ "شاہانِ عرب" نے ہڑتال اپنی مرضی سے ختم کرائی ہے اور اس طرح عرب سربراہوں

اور عوام میں نفرت کی خلیج حائل کرنا چاہی۔ عرب ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسے جا رہے تھے۔ بائیکاٹ سنگین ہو گیا اور ساری دنیا نے اس پر احتجاج کیا۔ عرب جانتے تھے کہ اس کمیشن کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہودیوں کو زبردستی عربوں پر مسلط کرنے کی کوئی تدبیر نکالی جائے۔ کیونکہ خود ویزمین نے صیہونی کانگرس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"زیورخ میں شاہی کمیشن نے ایک نجی نشست میں مجھ سے دریافت کیا تھا۔ کہ فلسطین کو تقسیم کرنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے"؟ اس کے بعد کمیشن کے ممبر نے فلسطین کی ایک یہودی آبادی نہال میں مجھ سے ملاقات کے دوران بتایا۔ کہ:

"ہم نے تقسیم فلسطین کی ایک ایسی سکیم تیار کر لی ہے، جو فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کے تخیل کو بہت زیادہ تقویت پہنچائے گی"

اس کمیشن نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت فلسطین کو یہودی اور عرب دو حصوں میں تقسیم کرنے اور ایک علاقے بشمول بیت المقدس کو برطانیہ کے زیر انتداب رکھنے کی تجویز پیش کی۔ شاہی کمیشن کی یہ رپورٹ مجموعۂ اضداد تھی۔ اس میں اگر ایک طرف یہ تجویز تھی، تو دوسری طرف فلسطینی عربوں کے حقوق اور یہود کے غاصبانہ قبضوں کا بھی اعتراف تھا۔ اسی طرح جبر و تشدد کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے کہا گیا۔ کہ

"اگر عرب نہ مانیں تو مارشل لاء جاری کر دیا جائے اور تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حسب ذیل طریقے اختیار کیے جائیں۔

۱۔ عربوں کے کل ہتھیار چھین لیے جائیں۔ اور جب ایک ایک عرب نہتا ہو جائے تو پھر یہودیوں کے ..... !

۲۔ عربوں اور یہودیوں کی مشترکہ آبادی پر انگریز افسر کثیر تعداد میں مقرر کیے جائیں۔

۳۔ پولیس کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ جو ہر وقت تیار رہے۔

۴۔ مقامی اخبارات پر پابندیاں سخت کر دی جائیں۔

عربوں نے ۱۹۳۷ء میں شام کے ایک قصبہ ہوزان میں قومی کانفرنس طلب کی جس میں اعلان بالفور، انتداب، درآمد یہود اور تقسیم فلسطین کی مخالفت اور استرداد کا فیصلہ ہوا۔ عربوں کے خلاف ایک خوفناک سازش کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس سازش کے

تحت انگریزی اور یہودی پریس میں عرب قومی تحریک کے رہنماؤں کے خلاف زبردست حملے شروع ہو گئے۔ اور حکومت سے مطالبہ کیا جانے لگا۔ کہ انھیں سختی سے دبا دیا جائے۔ عرب رہنماؤں کو بڑی تعداد میں گرفتار کر لیا گیا۔ عرب ہائی کمان کو خلاف قانون قرار دے کر ممبران کی بڑی تعداد کو جلا وطن کر دیا گیا۔ انگریزی فوج نے مفتئ اعظم فلسطین کی گرفتاری کے بیلے حرم القدس کا محاصرہ کرلیا۔ اور مسلم اوقاف اور عدالتوں کے محکمہ کو ختم کر دیا اس صورت حال نے اضطراب میں شدت پیدا کر دی۔ عربوں نے تشدد کا مقابلہ کیا۔ دو سال کے مختصر عرصہ میں چھ ہزار عرب شہید اور اس سے دگنی تعداد میں مجروح ہوئے۔ پچاس ہزار عربوں کو گرفتار کیا گیا۔ ان میں جوان بوڑھے علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین بھی شامل تھے۔ اس مشق ستم سے کوئی نہ بچ سکا۔ حکومت نے دو ہزار مکانات مسمار کر دیئے۔ ایک سو اسی عربوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ عربوں نے تمام ظلم و ستم مردانہ وار برداشت کیا۔ لیکن حکومت کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ بلکہ اس نے شاہی کمیشن کی تجویز کے مطابق تقسیم فلسطین کے منصوبے کی تکمیل کے لیے سر جان ووڈ ہیڈ کی قیادت میں ایک نیا کمیشن فلسطین بھیجا۔ برطانیہ کے خلاف غم و غصہ اور نفرت کے جذبات اور بھی شدید ہو گئے۔ ۷ اکتوبر ۳۸ء کو عالمگیر کانفرنس قاہرہ نے برطانیہ کو انتباہ کیا۔ کہ عالم اسلام اس سکیم کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ ووڈ ہیڈ کمیشن نے واضح الفاظ میں تقسیم فلسطین کی تجویز کو ناقابلِ عمل قرار دیا۔ اس پر برطانیہ نے ایک نیا مہرہ کھیلا اور عربوں سے گول میز کانفرنس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ برطانیہ دراصل صیہونیت کو تیاری کا موقعہ فراہم کرنا اور عربوں کو طفل تسلیاں دے کر خواب رکھنا چاہتا تھا۔ کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جنگ سے قبل برطانیہ نے ایک قرطاس ابیض میں عربوں سے وعدہ کیا کہ دس سال کے اندر اندر فلسطین میں ایک آزاد حکومت قائم کر دی جائے گی اور پانچ سال بعد فلسطینی اور برطانوی حکومت کے نمائندے آئندہ نظامِ سیاسی کا فیصلہ اور آزاد ریاست فلسطین کے لیے آئین تیار کریں گے۔ نیز اس قرطاس ابیض کی رو سے یہودیوں کی درآمد کو کسی حد تک مسدود کر دیا گیا تھا۔

عربوں نے تازہ ترین صورت حال کے پیش نظر برطانیہ سے تعاون ہی کو بہتر سمجھا لیکن جونہی امریکہ جنگ کے دوران اتحادیوں کی صف میں شامل ہوا۔ یہودیوں کو اتحادی طاقتوں

اور برطانیہ سے قرطاس ابیض منسوخ کرانے کی کوشش شروع کردی۔ ہٹلر کے مظالم سے بھاگنے والے یہودی ہر قانونی اور غیر قانونی طریقے سے بے تحاشا فلسطین میں داخل ہونے لگے۔ صیہونی ایجنسی نے ان کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ملک کے اندر گھسانا شروع کر دیا۔ اور مسلح تنظیمیں قائم کیں، جنھوں نے ہر طرف مار دھاڑ کر کے عربوں کو بھگانے اور یہود کو اُن کی جگہ بسانے میں سفاکی کی حد کر دی۔ یہود کو ہر طرح کے ہتھیار پہنچ رہے تھے اور وہ عربوں پر چھاپے مار رہے تھے۔

یہود نے "فلسطین پر قبضہ" کے لیے کبھی بھی تشدد کے استعمال سے گریز نہیں کیا، انہوں نے ۱۹۲۰ء ہی میں ہجانہ (دفاع) قائم کر دی تھی۔ جو تارکین وطن کی آمد کے ساتھ ساتھ قوی تر ہوتی گئی۔ اور جو انتدابی حکومت کے ایک قرطاس ابیض کے مطابق جنگِ عظیم ثانی میں ۶۰ ہزار جوانوں کی ایک منظم مسلح فوجی تنظیم بن چکی تھی۔ اس کے علاوہ ارگون (قومی فوجی تنظیم) اور سنٹرن (اسرائیل کے مجاہدینِ آزادی) کے نام سے دو اور "فوجیں" قائم تھیں۔ اول الذکر کی نفری کا اندازہ پانچ ہزار اور آخر الذکر کا تین ہزار لگایا گیا تھا۔ اس قوت کے ساتھ، یہود نے ۱۹۳۹ء کے قرطاس ابیض کو بنیاد بنا کر عربوں کے خلاف قتل و غارت گری کی مہم شروع کی، بلکہ موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے برطانوی فوجیوں اور تنصیبات پر بھی حملے کیے۔ ان کا تشدد اور تخریبی کاروائیاں اس حد تک بڑھ چکی تھیں کہ ۱۰ اکتوبر ۴۴ء کو مشرقِ وسطیٰ میں برطانوی افواج کے کمانڈر انچیف اور گورنمنٹ کی انتظامیہ کو مشترکہ بیان جاری کرنا پڑا۔ جس میں صیہونیوں کی سرگرمیوں اور تخریبی کی کارروائیوں کی مذمت کرتے ہوئے انھیں براہِ راست "برطانیہ کی جنگی کارروائیوں" میں رکاوٹ ڈالنے" اور "دشمن کی مدد کرنے" کے مترادف قرار دیا گیا۔

۱۷ نومبر ۴۴ء کو خود برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے دار العوام میں کہا۔

"اگر ہمارے صیہونیت سے متعلق خوابوں کا انجام قاتلوں کے پستولوں اور ہماری محنت کا مستقبل نئے نازی گروہوں کی تشکیل ہے، تو مجھ جیسے کئی افراد کو صیہونیت سے متعلق اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کرنا ہوگی اگر صیہونیت کے لیے کسی پُرامن اور کامیاب مستقبل کی خواہش اور امید ہے، تو اس قسم کی کارروائیوں کو ختم کرنا اور ان کے ذمہ داروں کو جڑ سے شاخوں تک تباہ کرنا ہوگا"

اس کے باوجود برطانوی حکّام نے یہود کی کسی کارروائی پر عملاً گرفت نہ کی، البتہ عرب اگر جان

بچانے کے لیے مدافعت کرتے، تو انھیں گرفتار کر لیا جاتا۔ حتّٰی کہ جنگ کے بعد خود یہودی ایجنسی ہجانہ (HAGANA) نے خود ہی اس سازش سے پردہ اٹھا دیا۔ جو دوران جنگ بروئے کار لائی جا رہی تھی۔ اس نے مارچ ۴۶ء میں اینگلو امریکی انکوائری کمیشن کو ایک یادداشت میں بتایا؛

"ہم نے دُوسری جنگِ عظیم میں ایک اینگلو جیویش فوج منظّم کی۔ ہم نے غیر سرکاری نیشنل گارڈ ترتیب دے کر عربوں کی تخریبی کارروائیوں کو کچلا، ہم نے برطانوی ہائی کمان کے منصوبے کی تکمیل کے لیے خفیہ کام کیا۔ اور خصوصی خفیہ یونٹ قائم کیئے۔ جو باغی عربوں کو ان کی پناہ گاہوں میں تلاش کرتے۔ اس لیے ہم فلسطین میں اقلیتی حیثیت اور کسی ایسی آزادی پر رضامند نہیں ہوں گے۔ جس سے فلسطین کی ساری دولت پر ہمارا حق تسلیم کر کے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن نہ بنا دیا جائے۔ ہم عربوں سے بالا تر اور ان کے ہر حملے اور بغاوت کو کچل سکتے ہیں۔ ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ سرزمینِ فلسطین سے برطانوی افواج کا انخلا ہمارے مفادات کے منافی ہے۔ فلسطین میں یہودی ریاست کا قیام ہی مسئلہ کا بہترین حل ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس یادداشت میں یہودیوں کے غیر مشروط داخلہ کا مطالبہ کیا گیا۔ حالاں کہ اقوامِ متحدہ کے ادارہ مہاجرین دبحالی کا سربراہ سر فریڈرک مارگن اپنی رپورٹ میں واضح کر چکا تھا۔ کہ جن یہودیوں کو بے خانماں اور مجبور ظاہر کر کے فلسطین میں داخل کیا جا رہا ہے، وہ ہرگز بے خانماں نہیں ہیں بلکہ انھیں مخصوص سیاسی مقاصد کے لیے "بے خانماں" ظاہر کیا جاتا ہے۔ ان کا بحالیات اور نوعِ انسانی کی ہمدردی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن اینگلو امریکی انکوائری کمیشن نے فوری طور پر ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں داخلہ کی اجازت دے دی۔

اینگلو امریکی کمیشن کی اس حرکت پر فلسطینی عرب بپھر گئے۔ اشتعال کی اس لہر نے پورے عالمِ اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور یہ آنچ برصغیر تک بھی پہنچی۔ برطانیہ اس اجازت کو منسوخ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مگر جیسے ہی اس فیصلے کا اعلان ہوا۔ صیہونی خفیہ اور مسلح تنظیمیں ہجانا (HAGANA) ارگون زدی لیومی "آزاد اسرائیل کے ستارے" اور "پالک"

کے بکتر بند دستے حرکت میں آ گئے اور فلسطین میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ صیہونی ہر طرح لیس تھے۔ برطانیہ، امریکہ اور اتحادی ان کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ اس کے باوجود غیر منظم اور نہتے عرب لڑتے رہے۔

دسمبر ۴۶ ۱۹ء میں ڈاکٹر ویزمین کی زیر صدارت بلیسل میں بائیسویں صیہونی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں بن گوریان کی تجویز پر یہ طے کیا گیا کہ صیہونی جدوجہد اس وقت تک ختم نہیں ہو گی۔ جب تک فلسطین "یہودی قومی وطن" نہیں بن جاتا، اس مرحلہ پر برطانیہ نے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے بجائے فروری ۴۷ء میں فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ مجلس اقوام کے اس جانشین ادارہ کی جنرل اسمبلی نے سارے مسئلہ کا جائزہ لینے کے لیے ایک گیارہ رکنی کمیٹی تشکیل دی۔ یہ کمیٹی کوئی متفقہ حل تلاش نہ کر سکی، کینیڈا زیکوسلواکیہ، گوئٹے مالا، نیدرلینڈ، پیرو، سویڈن، یوراگوئے نے تقسیم فلسطین میں حل تلاش کیا اور متحدہ ہندوستان، ایران اور یوگوسلاویہ نے وفاقی حل تجویز کیا۔ جبکہ آسٹریلیا غیر جانبدار رہا۔ اس پر ۳۱ اگست کو دو کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ کمیٹی ایک کو تقسیم کے منصوبہ کی تفصیلات طے کرنے کے لیے کہا گیا۔ جبکہ کمیٹی دو کو جو پاکستان، سعودی عرب، افغانستان، عراق، مصر، لبنان، شام اور یمن پر مشتمل تھی۔ تقسیم کی تجویز کا پابند نہ رہتے ہوئے اپنی سفارشات مرتب کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس کمیٹی نے پاکستان کی قیادت میں جو رپورٹ مرتب کی، وہ تقسیم کی تجویز کے سخت مخالف تھی۔ اور اس میں اقوام متحدہ کے جانب دارانہ رویہ پر بھی کڑی تنقید کی گئی تھی۔ لیکن ۲۹ نومبر ۴۷ء کو امن و انصاف کی علمبردار اقوام متحدہ نے انتہائی غیر منصفانہ طور پر فلسطین کو عربوں اور یہود میں تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ حالانکہ یہ سب کچھ اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق جنرل اسمبلی کے دائرۂ اختیار سے باہر تھا۔ عربوں نے جب اس مسئلہ کو عالمی عدالت میں لے جانے کی کوشش کی۔ اسے یا تو عالمی عدالت نے ناکام بنا دیا۔ یا پھر جنرل اسمبلی نے نظر انداز کر دیا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تقسیم فلسطین کی حمایت ماسوا جنوبی افریقہ کے کسی افریشیائی ملک نے نہیں کی۔ تقسیم کی قرارداد کے حق میں رائے شماری کو دو مرتبہ ملتوی کرایا گیا۔ اور آخر امریکہ، روس اور دوسری بڑی طاقتیں اپنے زبردست دباؤ کے بعد اسے پاس کرانے میں کامیاب ہو سکیں۔ اس غیر قانونی فیصلے میں "عالمی ضمیر" کے ذمہ دار ادارہ نے "فراخ دلی" کا ثبوت دیتے ہوئے یہود کو فلسطین کا ۵۶ فیصد

رقبہ پیش کیا۔ حالانکہ آبادی میں بھی ان کا تناسب بمشکل ۳۳ فیصد تھا۔ اقوام متحدہ کے اس فیصلہ کے مطابق فلسطین کا ساحلی علاقہ اور بحر مردار کا سارا جنوبی علاقہ، تاکہ یہود کو عقبہ کی راہ مل جائے، یہودی ریاست میں شامل کیا گیا۔ یہودی ریاست، فلسطین کے دس سب ڈسٹرکٹوں پر مشتمل تھی۔ جن میں آبادی کے لحاظ سے نو میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ صرف یافہ کے علاقہ میں تل ابیب کی شہری آبادی کی بنا پر یہود اکثریت میں تھے۔ جبکہ نابلس، جنین اور رام اللہ کے علاقوں میں سو فی صد رقبہ عربوں کا تھا۔ اور حبرون، غزہ، بیرشیبا اور عکارہ میں بھی یہود کا رقبہ برائے نام تھا۔ تقسیم میں اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ کہ تمام یہودی رقبہ اور یہودی آبادی کی اکثریت "یہودی ریاست" میں آجاتے۔ جبکہ "عرب ریاست" جو مجموعی فلسطین کے ۴۲ فیصد رقبہ پر تجویز کی گئی تھی، میں یہود کا کوئی رقبہ نہیں آیا۔ اور ۷ لاکھ ۳۵ ہزار کی آبادی میں یہود بمشکل دس ہزار تھے۔ اس کے برعکس یہودی ریاست میں پچاس فیصد عرب تھے۔ تقسیم کے مطابق بیت المقدس اور بیت اللحم اور مضافات کو جو مجموعی رقبہ کے ۰.۶۵ فیصد پر مشتمل تھے۔ انٹرنیشنل زون قرار دیا گیا تھا۔ اس میں عربوں کی آبادی ساڑھے دس ہزار، یہود کی دس ہزار تھی۔

اقوام متحدہ کی اس قرارداد کے حق میں ۳۳ ووٹ اور مخالفت میں ۱۳ ووٹ آئے جبکہ دس ملک غیر جانب دار رہے۔ یہ کم سے کم اکثریت تھی۔ جس سے جنرل اسمبلی میں کوئی ریزولیشن پاس ہو سکتا تھا۔ اور حق میں ووٹ حاصل کرنے کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال ہوئے۔ اس کے بارے میں جیمز فورسٹال اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ

> اس معاملے میں دوسری اقوام پر دباؤ ڈالنے اور ان کو ووٹ دینے پر مجبور کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کیے گئے، وہ شرمناک کارروائی کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔

اس سلسلے میں امریکہ نے جو کردار ادا کیا، اس پر امریکہ کا سنجیدہ حلقہ چیخ اٹھا۔ بلکہ ایک یہودی مصنف للنتھال تک تڑپ اٹھا، وہ لکھتا ہے:

> "اقوام متحدہ میں مسئلہ فلسطین پر رائے شماری سے ایک ہفتہ قبل ڈاکٹر ویزمین نے صدر ٹرومین سے ملاقات کی تاکہ صیہونی محاذ کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے راستہ ہموار کیا جائے۔ چنانچہ اس نے اس ملاقات کے

دوران میں صدر ٹرومین سے یہ حتمی وعدہ حاصل کر لیا کہ خلیج عقبہ کو، جو بحیرہ ہند کے لیے ایک دروازے کی حیثیت رکھتی ہے، کاٹ کر جدا نہیں کیا جائے گا۔ دراصل بہت پہلے وہائٹ ہاؤس اور صیہونی ایجنسی میں مسلسل رابطہ قائم رکھنے کا پورا اہتمام کر لیا گیا تھا۔ اس کام کو انجام دینے والے صدر ٹرومین کے ذاتی دوست اور سابق کاروباری پارٹنر ڈیوڈ نائلس اور ایڈورڈ جیکبسن پر انے صیہونی سیاست دان تھے۔ جن کے لیے ڈاکٹر ویزمین بھی سراپا سپاس تھا۔ اقوام متحدہ میں عین اس وقت جبکہ امریکی سفیر جنرل ہلڈرنگ ویزمین کو خلیج عقبہ کے متعلق اس کی منشا کے مطابق خبر سنانے والے تھے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، اور صدر امریکہ کی آواز سنائی دی۔ جو امریکی نمائندے کو یہ ہدایت دے رہے تھے کہ خلیج عقبہ کا فیصلہ بالکل اسی طرح کیا جائے۔ جس طرح ڈاکٹر ویزمین کو پسند ہو۔ ان ہتھکنڈوں کے بارے میں جو اس قرارداد کو منظور کرانے کے لیے اختیار کئے گئے۔ ان پہ تبصرہ کرتے ہوئے للنتھال (LILIENTHAL) لکھتا ہے:

"اقوام متحدہ نے مسئلہ فلسطین پہ عجلت سے عالمی قوانین اور تنظیم کے وقار کو سخت صدمہ پہنچایا ہے۔"

امریکہ نے اس کھیل میں جو کردار ادا کیا۔ اس پہ امریکی کانگریس میں لارنس ایچ سمتھ نے اپنی تقریر میں کہا:

"آئیے۔ ہم ذرا دیکھیں کہ اقوام متحدہ میں کیا ہوا؟ تقسیم کی قرارداد کو منظور کرانے کے لیے دو تہائی ووٹوں کی ضرورت تھی۔ دو مرتبہ یہ مرحلہ آیا لیکن دونوں مرتبہ اسے ملتوی کر دیا گیا۔ کیونکہ اس کے دونوں محرکوں امریکہ اور روس کو اس کی کامیابی کا یقین نہ تھا۔ دریں اثنا امریکہ کی طرف سے "واشنگٹن میں اعلیٰ سطح" پر ان تین چھوٹی اقوام پر زبردست دباؤ ڈالا گیا۔ اور ۲۹ نومبر کو کیا ہوا؟ تقسیم کے حق میں تین فیصلہ کن ووٹ ہیٹی، لائبیریا اور فلپائن کے تھے، ان تین ووٹوں نے دو تہائی اکثریت کو ممکن بنا دیا۔ اس سے قبل یہ تینوں ملک اس کے خلاف تھے۔"

شکاگو کے "ڈیلی ٹریبیون" میں کالم نگار ڈریو پیرسن نے لکھا:

"اس کی حمایت میں ووٹ حاصل کرنے کے لیے کئی لوگوں نے اپنا اثر و رسوخ اور دباؤ استعمال کیا۔ لائبیریا میں ربڑ کے باغات کے مالک، ہاروے فائرسٹون

نے لائبیریا کی حکومت کو مجبور کر دیا۔ اڈولف بیرل نے جو سار ہیلنتی کے مشیر ہیں ہیلنتی کا ووٹ دلوایا ۔۔۔ اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وائٹ ہاؤس میں کیا ہُوا۔ صدر ٹرومین نے قائم مقام وزیر خارجہ لووٹ کو بدھ اور پھر جمعہ کے دن وارننگ دی کہ اگر امریکہ کے روایتی ساتھیوں نے اس مسئلہ پر امریکہ کا ساتھ نہ دیا تو وزیر خارجہ سے جواب طلبی کی جائے گی۔"

نائب وزیر خارجہ سمنز ویلز نے تائید کی ہے کہ:

"وائٹ ہاؤس نے ان ووٹوں کے لیے براہ راست یا بالواسطہ طور پر دباؤ ڈالا اور ہر ہتھکنڈہ اختیار کیا۔"

پھر وہی ہُوا جو یہود چاہتے تھے کیوں نہ ہوتا؟ نیویارک کا ایک وکیل اپنی کتاب "یہودی دنیا پر حکمران ہیں" میں لکھتا ہے کہ:

"اقوام متحدہ بجائے خود یہود کی وہ عالمی مملکت ہے۔ جس کا خواب یہود کے عظیم رہنماؤں نے پروٹوکول میں دیکھا تھا۔"

قرارداد کا اعلان ہوتے ہی مسلح یہودیوں نے مسلمانوں کا قتل عام وسیع پیمانے پر شروع کر دیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ علاقے پر قابض ہونا چاہتے تھے، پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی لکھتے ہیں کہ عربوں پر جو مظالم کئے گئے۔ وہ کسی طرح بھی ان مظالم سے کم نہ تھے۔ جو نازیوں نے یہودیوں پر کیے تھے۔ دیر یاسین میں ۹ راپریل ۴۸ء کے قتل عام کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ:

"عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس نکالا گیا۔ اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ سپیکر لگا کر جگہ جگہ یہ اعلان کرتے پھرے کہ:

"ہم نے دیر یاسین کی عرب آبادی کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔"

یہودیوں کی اس دہشت گردی کے نتیجہ میں سترہ ہزار عرب شہید اور ۳ لاکھ عرب بے گھر ہو گئے تھے اور اس مرحلہ پر سلامتی کونسل میں اقوام متحدہ کی خصوصی کمیٹی کی رپورٹ زیر بحث تھی، جس میں تقسیم فلسطین کو ناقابل عمل قرار دیا گیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس مرحلے پر

کے منصوبہ کو ناقابلِ عمل قرار دے دیا تھا کہ روسی نمائندہ گرومیکو نے تقسیم فلسطین کی حمایت میں زبردست تقریر کی۔ اور امریکہ اس صورتِ حال سے گھبرا گیا۔ اسے خطرہ لاحق ہوا کہ اگر اس نے حمایت نہ کی تو یہودی، جن کے سرمائے پر امریکی معیشت کا انحصار ہے، اس سے بدظن ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ بھی روس کے ساتھ اس کشتی میں سوار ہو گیا۔ ابھی جنرل اسمبلی میں بحث جاری تھی کہ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو برطانیہ نے واشنگٹن ٹائم کے مطابق رات کے چھ بجے فلسطین سے دستکش ہونے کا اعلان کر دیا۔ چھ بجکر ایک منٹ پہ یہودیوں نے تل ابیب میں اسرائیل اور اسرائیلی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا دس منٹ بعد امریکہ نے اور پندرہ منٹ بعد روس نے اسے تسلیم کر لیا۔ حالاں کہ اس وقت تک اقوامِ متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی ریاست قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔ اس اعلان کے وقت تک ۶ لاکھ سے زیادہ عرب بے گھر ہو چکے تھے۔ اور اسرائیل اقوامِ متحدہ کی تجویز کے بالکل خلاف بیت المقدس کے آدھے سے زیادہ حصے پر قابض ہو چکا تھا۔ اور اس نے "عرب ریاست" میں قزاز، سالامہ، سارس، بیار، عمواس کے دیہات پر قبضہ کر لیا تھا۔

۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو عربوں پر یہودی حملوں میں اضافہ ہو گیا۔ اور گرد و پیش کی عرب باستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو مار دھاڑ سے بچانے کے لیے مداخلت کرتے ہوئے اپنی فوجیں فلسطین میں داخل کر دیں۔ اس جنگ میں مقامی عیسائی عربوں کے ساتھ تھے۔ اور باوجود اس کے کہ یہود جدید ترین اسلحہ سے لیس تھے۔ عربوں نے غزہ پٹی، بیئر سبع، ذوالکرم نابلس اُن سے خالی کرا لیے۔ اور بیت المقدس کے قدیم حصہ پر قبضہ کر کے تل ابیب (اسرائیلی دارالحکومت) تک پہنچ گئے۔ یہودیوں کی ناکامی پر بڑی طاقتوں نے مجلس اقوامِ متحدہ کو جنگ بند کرنے پر مجبور کیا۔ اور عرب لیگ نے گیارہ جون کو بین الاقوامی رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے عارضی صلح کے طور پر چار ہفتوں کے لیے جنگ بند کر دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ عارضی صلح عربوں کے لیے زہر قاتل تھی۔ جس نے عربوں کی فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا۔

عارضی صلح کے بعد یہ طے پایا تھا کہ باہر سے کوئی یہودی فلسطین میں داخل نہیں ہو گا۔ فریقین اپنے اپنے علاقوں پر قابض رہیں گے۔ باہر سے کوئی اسلحہ آئے گا اور نہ ہی کوئی جنگی اقدام کیا جائے گا۔ لیکن یہودیوں نے یہ صلح تو صرف دم لینے اور تیاری کی تکمیل کے لیے کی تھی، انھوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور چیکوسلواکیہ سے دھڑا دھڑ اسلحہ آنے لگا۔

یہودی مصنّف جان کمشنے لکھتا ہے:

"یہودی ایلچی اسلحہ کی خریداری کے لیئے پورے یورپ اور امریکہ میں پھیل گئے۔ امریکی یہودیوں نے فراخ دلی سے عطیات دیئے اور تاجروں نے ڈالروں کے عوض اسلحہ کی رسد میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ زیکوسلواکیہ نہایت مفید اور مددگار ثابت ہوا۔ پراگ سے جنوبی فلسطین میں صیہونی ... اڈے عقرنک ہوائی جہازوں سے اسلحہ پہنچنے لگا۔ اسی طرح یہودیوں نے بمبار بھی حاصل کر لیے۔ امریکہ اور برطانیہ سے لڑاکا اور بمبار طیارے فلسطین پہنچ گئے اور جب عارضی صلح ختم ہوئی۔ یہودی فوج کو ایک مختصر لیکن مؤثر فضائیہ اور ایک چھوٹی لیکن مضبوط اور دلیر بحریہ کی حمایت حاصل تھی"

اسرائیلیوں نے ۱۷ ستمبر کو اقوام متحدہ کے ثالثی نمائندہ کاؤنٹ برناڈوٹ کو ہلاک کر دیا۔ جنگ پھر چھڑ گئی۔ ۱۸ اکتوبر کو اسرائیلی طیاروں نے بیت المقدس پر شدید بمباری کی۔ جنوری ۴۹ء میں یہود مصری حدود میں داخل ہو گئے اور انھوں نے برطانوی بمبار مار گرائے۔ برطانیہ نے معاوضہ طلب کیا۔ تو روس نے یہود کی حمایت کا اعلان کر کے حالات کو مزید ابتر بنا دیا۔ ۱۳ جنوری کو گیارہ ہزار قبرصی یہودی فلسطین میں داخل ہوئے، لیکن جب یہود کو مار پڑنے لگی، تو اقوام متحدہ نے پھر مصالحت کا ڈول ڈالا۔ اور مارچ ۴۹ء میں جنگ بند کرا دی۔ یہ عربوں کی سیاسی موت تھی۔ اسرائیل نے ۷۷ء ۴۵ فیصد علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور صیہونی منصوبہ تیسرے مرحلہ میں داخل ہو چکا تھا۔

۱۹۵۰ء میں ڈیوڈ بن گوریاں نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"ہمیں جوش و خروش کے ساتھ جنگ جاری رکھنی ہو گی۔ یہ بیک وقت فوجی اور سیاسی جنگ ہو گی۔ ہمیں ایک بار پھر سلیمان کے زمانے کی سلطنت قائم کرنا ہے۔"

۲۹ جولائی ۱۹۵۱ء کو اسرائیلی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے زور دیا:

"تحریکِ صیہونیت کا اولین منشا بکھری ہوئی بھیڑوں کو جمع کرنا تھا، آج اس کا مطلب پچاس لاکھ یہودیوں کو دس سال کے اندر اندر اسرائیل میں جمع کر دینا ہے۔ مگر اسرائیل کے وسائل اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ہمیں خارجہ پالیسی میں ہمیشہ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ اسرائیل کی ساری زمین

کو خالی کرایا جائے۔"

اور اسرائیل کی ساری زمین سے مراد دریائے نیل کے کناروں سے فرات تک پھیلا ہوا علاقہ ہے۔ چنانچہ جب ۱۳ اگست ۱۹۵۱ء کو یروشلم میں عالمی صیہونی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں سب سے اہم زیر بحث موضوع یہی تھا۔ ۱۹۵۲ء کے اوائل میں وزیر جنگ موشے دایان نے قوم کے نام پیغام میں کہا:

"ایک ایک یہودی کو میدان جنگ میں نکل آنا چاہیئے۔ میں نے فوج سے کہہ دیا ہے کہ وہ دن رات تیاری میں مصروف رہے۔ یہودی سلطنت کا قیام ہمارا قومی نصب العین ہے اور ہم اسے حاصل کر کے دم لیں گے۔"

۱۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو یہودی ریاستوں کی سرحدوں کا تعین کرتے ہوئے لیبر پارٹی کے سربراہ ڈاکٹر عاری الکمان نے اس منصوبے کو فاش کر دیا جو اب تک مخفی رہا تھا۔ اس نے کہا:

"عظیم تر اسرائیل عراق سے سویز تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ طاقتور ریاست ہو سکتی ہے۔ جو مشرق وسطیٰ میں اندرونی اور بیرونی امن واستحکام کی ضمانت دے سکے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کو صاف صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیں کہ فلسطین میں دنیا بھر کے یہودیوں کو جمع کر کے فوج بنانے کا مطلب اسرائیل کی نئی سرحدوں کا تعین ہے جو عراق سے سویز تک پھیلی ہوں۔ اس کے بعد ہی اسرائیل مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کا گہوارہ بن کر اپنے آپ کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔"

قبل ازیں اسرائیل کا وزیراعظم بن گوریان پارلیمنٹ میں ۱۹۵۱ء کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہہ چکا تھا کہ:

"ہمیں کوئی وسیع ملک نہیں ملا۔ بلکہ ہم ستر سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد اپنے ملک کے چھوٹے سے حصہ میں ابتدائی آزادی کی منزل میں داخل ہوئے ہیں"

اسی سال اسرائیل نے اپنی "میراث" کے ملک کی نشان دہی کرتے ہوئے پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ کیے:

"اے اسرائیل! تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں"

ایک یہودی مصنف نے لکھا ہے کہ

اس عظیم تر اسرائیل میں پورا شام، پورا لبنان، اردن و عراق کا بڑا حصہ، صحرائے سینا، بالائی نجد اور مدینہ منورہ تک شامل ہے۔ کیونکہ سرور کائنات ؐ کے عہد میں یہود مدینہ میں آباد تھے۔

بن گوریان نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ

"یہودیوں کے لیے الگ سلطنت کا قیام صیہونیت کا واحد مقصد نہیں ہے بلکہ اسرائیل کے قیام کے بعد ہمارے لیے اپنی تحریک کو آگے بڑھانا ضروری ہو گیا ہے۔ اسرائیل کی حکومت صرف ایک وسیلہ ہے، منزل نہیں ہے۔"

اور مسٹر بیگین نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں بہت پہلے بتا دیا تھا:

"اسرائیل کے لوگوں اور خود اسرائیل کی اس وقت تک کوئی اہمیت نہ ہو گی۔ جب تک کہ ہم اپنا پورا علاقہ بغیر امن کے اور صلحناموں پر دستخط کیے بغیر آزاد نہ کرا لیں۔"

جون ۱۹۶۷ء میں جو جنگ ہوئی، اسرائیل اس جنگ کے لیے مدت سے تیاری کر رہا تھا، جبکہ عرب اس کے برخلاف اس پیمانے کی تیاری نہ کر سکے۔ قیام اسرائیل کے بعد سے یہودیوں کا ہر قدم یہودی قوم کو ایک جنگجو فوج میں بدلنے کے لیے ہوتا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ایک یہودی صنعت کار نے ایک صنعتی رسالہ میں لکھا تھا:

"ہر معاشی قدم اور ہر ترقیاتی پروگرام فوجی نقطۂ نظر سے بنایا جاتا ہے چنانچہ اسرائیل کی مختلف شعبوں میں تعمیر و ترقی کی منصوبہ بندی، فوجی ضروریات کے مطابق، کچھ اس انداز میں ہوتی ہے کہ اسے کسی وقت بھی فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

اسرائیل کے سابق وزیر خارجہ مسٹر شیرٹ (SHARRET) نے یروشلم میں ہیگانہ (HAGANA) کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بہت پہلے کہا تھا کہ:

"میں اسرائیل کے لوگوں سے کہتا ہوں کہ وہ خود کو مضبوط اور طاقتور بنائیں تمام اسرائیل کو جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔" اس نے اپنی کتاب — "اسرائیل — میدان جنگ" میں لکھا۔ کہ "تنہا فوج فتح کی ضمانت نہیں

دی سکتی بلکہ پوری قوم کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔"
اسرائیل میں جس حد تک جنگی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس نے ایک یہودی جرنلسٹ کو بھی اس نئے رجحان کی مذمت پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں ایک کتاب لکھی جس پر اس کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن ہوا اور اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا:

"میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسرائیل میں اولیت انتہائی متشدد یہودیوں کی نئی نسل پیدا کرنے کو حاصل ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جوانوں کو کس طرح جنگی پیمانے پر تربیت دی جاتی اور فوجی کارروائیوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ بالکل وہی ہے جو نازیوں اور فاشسٹوں نے اپنایا تھا۔ انہیں بالکل ان جارحانہ اصولوں پر تعلیم دی جاتی ہے۔ جو فوجی طاقتیں اپنے جوانوں کی تربیت کے لیے اختیار کرتی ہیں۔ بچوں کی پرورش خالصتاً جنگی لائنوں پر ہوتی ہے۔ اسرائیل کی فضا میں جارحیت اور حملہ آوری کا جذبہ طاری ہے۔ اور میں نے سارے اسرائیل میں ایک ہی پکار سنی ہے — جنگ کی پکار۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کا سالانہ جنگی بجٹ ۱۹۴۸ء سے اب تک کبھی بھی تین کروڑ ڈالر سالانہ سے کم نہیں ہوا۔"

۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے ہی امریکی فوجی ماہرین نے اس کی جنگی تیاریوں کے پیش نظر واضح طور پر یہ کہہ دیا تھا۔ کہ وہ صرف چار پانچ یوم میں اپنے گرد و پیش کی عرب ریاستوں کو پیٹ ڈالے گا۔ سیاسی حیثیت سے ہر موقعہ پر امریکہ اور اس کے ساتھی اس کی پشت پناہی کرتے رہے ہیں اور انہی کی حمایت کی وجہ سے اقوام متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا کوئی تدارک نہ کر سکی۔ نومبر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک اقوام متحدہ کے ۲۸ ریزولیوشن وہ مسترد کر چکا تھا۔

ستمبر ۱۹۴۸ء سے نومبر ۱۹۶۶ء تک اقوام متحدہ نے اس کے خلاف گیارہ مرتبہ قرارداد مذمت پاس کی، مگر اس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کی جرأت یا بے باکی کا اندازہ آپ اس سے کر لیجیے کہ جون ۶۷ء کی جنگ کے بعد جب جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا

تھا۔ اسرائیل کے وزیر اعظم لیوی ایشکول نے علی الاعلان کہا :

"اگر اقوام متحدہ کے ۱۲۲ ممبروں میں سے ۱۲۱ بھی فیصلہ دے دیں اور تنہا اسرائیل کا اپنا ووٹ ہی ہمارے حق میں رہ جائے۔ تب بھی ہم اپنے علاقوں سے نہیں نکلیں گے۔"

اور یہ سب کیوں؟ اس لیے کہ اسرائیل کو تمام بڑی طاقتوں کی حمایت حاصل ہے۔ کفر اسلام کے خلاف متحد ہے۔ جنگ شروع ہونے سے قبل امریکہ اس قدر مضطرب تھا کہ امریکہ کے ایک خاص فوجی وفد نے اسرائیلی انتظامات کا معائنہ کیا اور جنگ سے ایک ہفتہ قبل امریکی فوج کے جائنٹ چیفس آف سٹاف کے صدر جنرل وہیلر نے صدر جانسن کو رپورٹ پیش کی کہ اگر اسرائیل پہل کر کے ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو وہ تین چار دن کے اندر عربوں کو مار لے گا۔ اس کے بعد جانسن نے روس سے یہ یقین دہانی حاصل کی کہ وہ جنگ میں عملاً کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ اس پر بھی چھٹا امریکی بحری بیڑہ مصر و اسرائیل کے ساحل کے نزدیک مستعد و تیار کھڑا رہا۔ مزید برآں برطانیہ کا ایک طیارہ بردار جہاز مالٹا میں اور دوسرا عدن میں اسرائیل کی ایک منٹ کے نوٹس پر مدد کے لیے تیار کھڑا تھا۔ لندن ٹائمز نے جنگ کے بعد (THE HOLY WAR — JUNE 1967) کے نام سے جو کتاب شائع کی ہے وہ واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ جنگ میں اسرائیل کے ساتھ فرنگی ہمدردی کے پس منظر میں صلیبی جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ اس کتاب کے جس باب میں بیت المقدس پر یہودی قبضے کا بیان ہے۔ اس کا عنوان (BACK AFTER 896 YEARS ہے) اور یہ ظاہر ہے کہ ۸۹۶ برس پہلے بیت المقدس پر سے صلیبی عیسائیوں کا قبضہ ختم ہوا تھا نہ کہ یہودیوں کا۔ جنگ میں روس نے جو کردار ادا کیا۔ اس پر یوگوسلاویہ کے ایک ڈپلومیٹ کا یہ تبصرہ بہترین ہے کہ :

"ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے۔ تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز سے گرا دیتی ہے"

بہرحال یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے۔ فلسطین اور جزیرہ نمائے سینائی پر اسے تسلط حاصل ہو گیا ہے۔ اب وہ اس منصوبے کے آخری مرحلہ کی تکمیل کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس مرحلے کے دو اجزاء اہم ترین ہیں ایک یہ کہ مسجد اقصٰی اور قبۃ الصخرہ کو

ملک" پر قبضہ کر لے ۔ مسجدِ اقصیٰ میں آتش زنی کا واقعہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اور اگر وہ اس مرحلہ میں کامیاب ہو گیا تو پھر اس کا دوسرا وار سرزمین بطحا پر ہوگا کیونکہ اس کی "میراث کا ملک" نیل سے فرات تک ہے اور اس میں دریائے نیل تک مصر، پورا اردن، پورا شام، پورا لبنان، عراق کا بڑا حصہ، ترکی کا جنوبی علاقہ، اور مدینۃ النبویؐ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔ ..... (آ)لود مسجدِ اقصیٰ مسلمانوں کی غیرت ایمان سے جواب طلب ہے کہ کیا اب بھی ان میں کوئی صلاح الدین ایوبی پیدا نہیں ہوگا جو اس کی مقدس فضاؤں کو رنگ و رامش کے نغموں اور شراب آلود مکروہ ہواؤں سے نجات دلا سکے صیہونیت اور سانحۂ فلسطین کی پوری تاریخ اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ اس سلسلے میں کسی بڑی طاقت سے نیکی کی توقع رکھنا فضول ہے۔ بلکہ اس کا واحد اور آخری حل یہی ہے کہ "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا" اور قرآن پکار پکار کر حکم دے رہا ہے:

"کافروں سے جہاد کرو، یہاں تک کہ ان کا فتنہ اور خطرہ ختم ہو جائے اور اللہ کے دین کا نظام قائم ہو" (سورۂ انفال، رکوع ۵)

بڑھ سوئے بیت المقدس اپنا لہرانے علم

اے مجاہد جادۂ دشوار کی پرواہ نہ کر

اس سلسلے میں ریاست اسرائیل کے قیام پر ڈیوڈ بن گوریان کی تقریر کے یہ حصے خاص طور پر سامنے رکھنے ہوں گے:

"اگرچہ ایک یہودی ریاست کے قیام سے متعلق ہمارا خواب پورا ہو چکا ہے لیکن ابھی ہم نے صرف ابتدا کی ہے۔ ہمارا مقصد تمام یہودیوں کو اسرائیل میں لانا ہے۔ ہم یہودی والدین سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو اسرائیل بھیجیں گے۔ لیکن اگر انھوں نے مزاحمت کی تو ہم زبردستی انھیں چھین لیں گے۔"

پھر ۳۰ مئی ۱۹۵۰ء کا یہ اعلان بھی ان کے عزائم واضح کر دیتا ہے کہ:

"ریاست کے اقتدار اعلیٰ کا اطلاق بلاشبہ ریاست کی حدود پر ہوتا ہے لیکن صیہونی تحریک تمام یہودیوں کو محیط ہے۔ ریاست تو محض ایک ذریعہ ہے صیہونیت کے مقاصد کے حصول کا۔"

جنگ ۱۹۶۷ء کے بعد اسرائیلی رہنماؤں نے مقبوضہ علاقوں کے بارے اپنے

عزائم کو کبھی نہیں چھپایا۔ وزیر اعظم لیوی اشکول نے دس جولائی ۷۶ء کو ایک انٹرویو میں کہا۔

"جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ میں ایک نئی سیاسی حقیقت نے جنم لیا ہے اسرائیل اردنی یروشلم اور غزہ پٹی کو کبھی خالی نہیں کرے گا۔ یروشلم کے بغیر اسرائیل ایسے ہی ہے جیسے سر کے بغیر آدمی۔"

وزیر خارجہ ابا ابیان نے کہا۔

"اسرائیل ۱۹۴۹ء کی جنگ بندی لائنوں پہ کبھی واپس نہیں آئے گا"

اور موجودہ وزیر اعظم گولڈا میئر بار بار اصرار کر چکی ہیں۔ کہ اسرائیل کی سرحدوں کا ازسر نو تعین ہونا چاہیئے۔ وہ یروشلم، غزہ پٹی، گولان کی پہاڑیوں اور دریائے اردن کے بعض مغربی علاقوں سے کسی صورت دست بردار نہیں ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان دس لاکھ مہاجرین کو واپس لینے کے لیے بھی تیار نہیں، جو گزشتہ کئی سالوں سے غاروں اور خیموں میں بے بسی اور بے چارگی کی زندگی گزار رہے ہیں اور اقوام متحدہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود ان میں سے صرف ایک تہائی کی ضروریات پوری کر سکتی ہے۔ یاد رکھیئے! قوموں کی تقدیر، ایوان میں نہیں۔ میدان جنگ میں بنتی ہے۔ اور جو لوگ ایوانوں پہ انحصار کرتے ہیں۔ انھیں ہزیمت ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے مسلمانوں کا المیہ یہی ہے کہ:

" دشمن جب میدان جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہ ایوانوں پر نظریں لگائے بیٹھے تھے۔"

———

ساطان احمد خوشنولیس، گجرات، ۱۹۷۲ء

بیت المقدس کی کہانی

(ماہ وسال کی زبانی)

قم

۱۰۰۰ - حضرت داؤدؑ

۹۷۰ - حضرت سلیمانؑ تعمیر ہیکل

۷۲۰، ۶۸۵ - حزقیاہ

۶۸۵ - ۶۴۰ - منسی

۵۸۷ - بخت نصر کے ہاتھوں شہر کی تباہی

۵۳۸ - یہود کی جلاوطنی سے پہلی واپسی

۵۳۸، ۳۳۲ - فلسطین فارس کے زیر اقتدار

۵۲۰، ۵۱۶ - زوربابل کے ہاتھوں ہیکل کی تعمیر

۴۴۲ - نحمیاہ کی تعمیر فصیل

۳۳۲، ۱۶۸ - فلسطین یونان کے زیر اقتدار

۳۳۲ - سکندر اعظم

۳۲۳ - تلمیدس مصری

۱۹۸ - سلیبوس انٹونی

۱۶۸ - انطوخیوس کے ہاتھوں ہیکل کی تباہی

۱۶۸ - ۱۶۴ - میکابین

۱۶۵ - ہیکل کی بحالی

۶۳ ق م تا ۷۰ عیسوی فلسطین میں رومی اقتدار

۶۳ - پومپیائی بیت المقدس آیا

۳۷ تا ۴ - ہیرود اعظم

۲۰ - ہیکل کی تعمیر نو

۴ء - حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش

۶ء - یہودیہ - رومی صوبہ کی حیثیت سے۔

۲۹ء - حضرت عیسیٰؑ کا صعود۔

۳۲ء - سینٹ سٹیفین کا قتل

۴۱ء - ۴۴ء - ہیرود اغریپا اوّل شہر پناہ کی تعمیر

۴۴ء - سینٹ جیمز کا قتل

۴۵ء - ملکہ ہیلینا، یروشلم آتی ہے۔

۴۹ء - ہیرود اغریپا ثانی۔ یہودیوں کا روم سے اخراج۔

۵۴ء تا ۶۸ء - نیرو شاہ روم

۶۶ء - جنگ یہود

۷۰ء - طیطس - بیت المقدس کو تباہ کرتا ہے۔

۷۰ء، ۱۳۲ء - یروشلم میں رومی فوج کا قیام

۱۱۷ء، ۱۳۸ء - شاہ ہادریان

۱۳۲ء - یہودیوں کی بغاوت۔

۱۳۶ء - ہادریان، یہود کو شہر سے نکال کر شہر کا نام ایلیا کیپی تولینا رکھتا ہے۔

۳۰۶ - ۳۳۷ء - کنسٹنٹائین

۳۱۲ - ۴۰۳ء - ایپیفانیوس بشپ آف سلامس

۳۲۶ء - سینٹ ہیلینا یروشلم آتی ہیں

٣٢٥ء۔ کلیسائے نشور کی تعمیر

٣٤٦۔٤٢٠ء۔ سینٹ جیروم

٣٦٠۔٣٦٣ء۔ شاہ جولین، ہیکل از سر نو تعمیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

٤٠٨۔٤٥٠ء۔ شاہ تھیوڈوسیئس ثانی

٤٥٠۔٤٦١ء۔ شہزادی اڈوکسیا۔ یروشلم میں قیام کرتی ہیں۔

٤٥١ء۔ چالسیڈون میں عیسائیوں کی مجلس مشاورت یروشلم کو مذہبی حیثیت دی گئی۔

٥٢٧ تا ٥٦٥ء۔ شاہ جسٹینیان

٥٣٢ء۔ حضرت مریمؑ کے گرجا کی تعمیر

٥٧٠ء۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کی پیدائش

٦١٠۔٦٤١ء۔ شاہ ہرکولیس

٦١٤ء۔ خسرو، شاہ ایران کی فتح

٦٢٢ء۔ ہجرت سرور کائناتؐ

٦٢٩ء۔ صلیب الصلبوت کی دریافت

٦٣٠ء۔ خلیفہ عمرؓ، بیت المقدس میں داخل ہوتے ہیں۔

٦٣٧ تا ١٠٩٩ء۔ بیت المقدس، اسلامی شہر

٦٩١ء۔ قبۃ الصخرہ کی تعمیر

٨٠٠ء۔ ہارون الرشید شارلیمان کو شہر کی چابی بھیجتا ہے۔

٨٣١ء۔ مامون الرشید، قبۃ الصخرہ کی مرمت

٩٦٩ء۔ بیت المقدس، فاطمی خلیفہ مصر کے تحت

١٠١٠ء۔ خلیفہ الحاکم کنیسہ قمامہ کو تباہ کرتا ہے

١٠٧٧ء۔ تاتاریوں کا حملہ

١٠٩٤ء۔ پیٹر دی ہرمٹ، بیت المقدس آتا ہے

١٠٩٩ء۔ پہلی صلیبی جنگ۔ گاڈفری۔

١٠٩٩ تا ١١٨٧ء صلیبی اقتدار — ١٠٩٩

گاڈفری	١١٠٠
بالڈون اول	١١١٨
" ثانی	١١٣١
فولک	١١٤٤
بالڈون ثالث	١١٦٢
املرے اول	١١٧٣
بالڈون رابع	١١٨٥
" خمس	١١٨٦
گوئے ڈی لیسینگ نن	١١٩٢
کونارڈ	١١٩٢
ہنری آف شمپین	١١٩٧
املرے دوئم	١٢١٠
جان آف بریئین	١٢٣٧

١١٦٩۔١١٩٣ء۔ سلطان صلاح الدین شاہ مصر

١١٨٧ء۔ جنگ حطین۔ صلاح الدین بیت المقدس فتح کرتا ہے۔

١١٨٨۔١١٩٢ء تیسری صلیبی جنگ، رچرڈ آف انگلینڈ

١١٩١ء۔ فریڈرک اول باربروسا

١١٩٦ء۔ چوتھی صلیبی جنگ۔ شاہ ہنری چہارم اور جرمنی

١٢٠٢ء۔ پانچویں صلیبی جنگ

کتابیات

۱۔	قرآن مجید	
۲۔	ابن جبیر	سفر نامہ
۳۔	ابوالفداء اسحق الحموی	مثیر الغرام (انگریزی ترجمہ چارلس ماتھیوز)
۴۔	احمد حسین	سلطان صلاح الدین
۵۔	برنی الحاج محمد الیاس	صراط الحمید ۱۹۲۸ء
۶۔	انصاری محمد نعیم	تاریخ سلاطین عثمان
۷۔	پیسہ اخبار	حالات بنی عثمان ۱۹۱۹ء
۸۔	خسرو	سیاحت نامہ ناصر خسرو (اردو ترجمہ)
۹۔	ریلیجس بک سوسائٹی	کتاب مقدس
۱۰۔	ریلیجس ٹریکٹ سوسائٹی	محاربات صلیبی ۱۷۹۹ء (اردو ترجمہ)
۱۲	زینب کیالی بولین کیولد	حج زینب ۱۹۲۴ء
۱۳۔	سید سلیمان ندوی	ارض القرآن
۱۴۔	مولانا شبلی	سفر نامہ روم و شام و مصر
۱۵۔	علی ہروی	مقامات زیارات
۱۶۔	لین پول	صلاح الدین (اردو ترجمہ)
۱۷۔	مجیر الدین	انس الجلیل (انگریزی ترجمہ)
۱۸۔	محمد ناظم	سفرنامہ ارض القرآن (سید مودودی)
۱۹۔	محمد عبد الحمید	الیہود
۲۰۔	مسعودی	مروج الذہب
۲۱۔	وفا حفظ الرحمٰن وفا	راہ یروشلم
۲۲۔	یاقوت، امام شہاب الدین ابی عبداللہ	معجم البلدان

۱۲۱۲ء۔ بچوں کی صلیبی جنگ۔

۱۲۱۷ء۔ چھٹی صلیبی جنگ، اینڈریو ہنگری

۱۲۲۷ء۔ ساتویں صلیبی جنگ

۱۲۲۸ء۔ فریڈرک ثانی۔ یروشلم میں۔

۱۲۲۹ تا ۱۲۴۴ء۔ بیت المقدس، عیسائیوں کے تصرف میں۔

۱۲۳۹ء۔ بیت المقدس کے آخری عیسائی حکمران۔ ایرل آف کارنوال۔ ارل آف سالسبری

۱۲۴۴-۱۲۴۷ء۔ خوارزمیوں کا حملہ

۱۲۴۷-۱۵۰۷ء۔ بیت المقدس، مملوک کے زیر اقتدار

۱۲۴۸-۱۲۵۴ء۔ آٹھویں صلیبی جنگ سینٹ لوئیس

۱۲۶۰-۱۲۷۷ء۔ سلطان بیبرس

۱۲۷۹-۱۲۹۰ء۔ سلطان المنصور قلاوون

۱۲۷۰-۱۲۷۲ء۔ نویں صلیبی جنگ ایڈورڈ اول انگلینڈ

۱۲۹۱ء۔ مسلمان عکہ فتح کرتے ہیں۔

۱۴۵۳ء۔ سلطان محمد ثانی قسطنطنیہ فتح کرتا ہے۔

۱۵۱۷ء تا ۱۹۱۷ء۔ فلسطین، ترکانِ عثمانی کا ملک۔

۱۵۲۰-۱۵۶۶ء۔ سلیمان اعظم (۱۵۳۷ء تا ۱۵۴۲ء) بیت المقدس میں تعمیرات کرواتا ہے۔

۱۸۳۲ء۔ محمد علی والئ مصر بیت المقدس پر قبضہ کرتا ہے۔

۱۹۱۷ء۔ یروشلم پر فرنگی قبضہ۔

۱۹۴۸ء۔ بیت المقدس۔ اسلامی شہر

۱۹۶۷ء۔ بیت المقدس یہودی تصرف میں۔
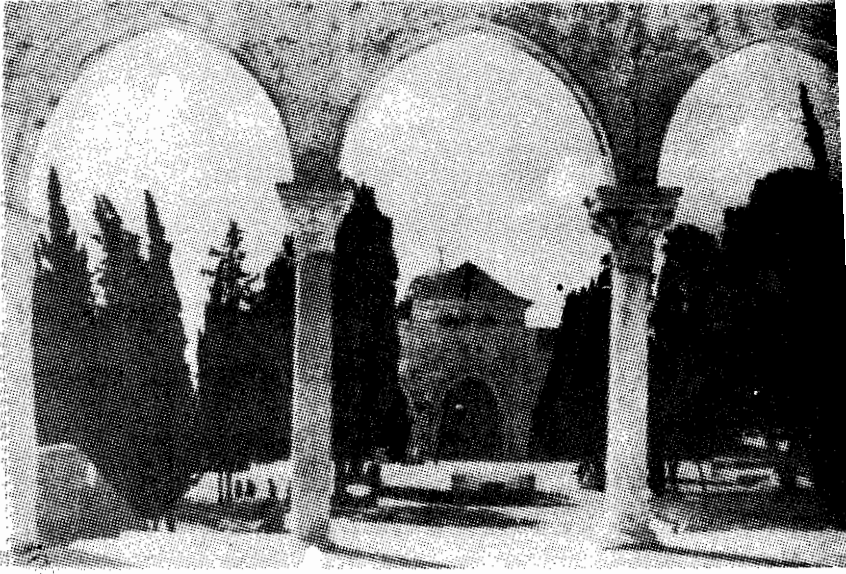
22-	BARCALY, DOCTOR.	CITY OF GREAT KINGS.
23-	BESANT & PALMER	HISTORY OF JERUSALEM, 1871
24-	CATAN, HENRY	TO WHOM DOES PALESTINE BELONGS
25-	CHESTERTON, G.K.	THE NEW JERUSALEM
26-	HADAWI, SAMI	ARAB ISRAEL CONFLICT
27-	" " " "	PALESTINE BEFORE THE U.Ns.
28.	HASAN QASIM	ZIONISM AS ITS STAND
29.	JEFFERIES, J.M.N.	THE BALFOUR DECLARATION
30.	LAMB, HERALD	THE FLAMES OF ISLAM
31-	LONGSTONE, DAVID	THE SAVING EVAN
32-	PARRY, O.H	THE PILGRIM IN JERUSALEM.
33-	SMITH, G.A.	THE CITY OF HEROD & SALADIN, 1890
34-	STRANGE, G.L.	PALESTINE UNDER MUSLIMS, 1920.
35-	TRUPP	ANCIENT JERUSALEM
36-	WALLACE, EDWINS	JERUSALEM, THE HOLY, 1898
37-	WILLIAMS	THE HOLY CITY, 1847
38-	ENCYCLOPEDIA	BIBLICA
39-	" " " "	BRITANICA
40-	" " " "	CHAMBERS
41-	" " " "	COLLIERS
42-	" " " "	ISLAM
43.	WORLD ISLAMIC CONGRESS	REPORTS FOR 1967-68-69

تاریخ

تزکِ تیموری	ترجمہ	ابوالہاشم ندوی	۷/۵۰
تزکِ بابری	ترجمہ	رشید اختر ندوی	۱۵/-
تزکِ جہانگیری	ترجمہ	مولوی احمد علی صاحب	۲۱/-
ہمایوں نامہ	ترجمہ	رشید اختر ندوی	۱۵/-
شاہ جہاں نامہ	ترجمہ	ممتاز لیاقت	۳۰/-
تمدّنِ عرب		سید علی بلگرامی	۴۰/-
احمد شاہ درّانی		سیّد نصیر احمد جامعی	۱۰/-
سرگذشتِ پاکستان		چودھری سردار محمد خاں عزیز	۱۶/-
جلیانوالہ باغ		ابوالہاشم ندوی	۳/۵۰
تاریخ بیت المقدس		ممتاز لیاقت	۱۶/-
عوامی دورِ حکومت کا پہلا سال		قاضی ذوالفقار احمد	۱۵/-
عوامی دورِ حکومت کا دوسرا سال		قاضی ذوالفقار احمد	۱۵/-
سیّدان بادشاہ گر		ڈاکٹر سیّد صفدر حسین	۱۲/-
سلطان محمود غزنوی		یقین الدین	۷/۵۰
مسلمان سسلی میں		سیّد نصیر احمد جامعی	۷/۵۰
ابوریحان البیرونی		لطیف ملک	۲۰/-

سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار لاہور